

آرڈو زبان کی قدیم تاریخ

عین الحق فرید کوٹی

اسلان پبلیکیشنز لاہور

اُردو زبان
کی
قدیم تاریخ

اُردو زبان کی قدیم تاریخ

عین الحق فرید کوٹی

اسلان پبلیکیشنز لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول	جون ۱۹۷۲ء
طابع	خان عبیدالحق ندوی
مطبع	مطبعة المكتبة العلمية ، لاہور
تعداد	ایک ہزار
اہتمام	چودھری بشیر احمد خان

ناشر : ارسال پبلیکیشنز
لاہور (مغربی پاکستان)

معرفت

سول ایجنٹ : کواپرا بک شاپ اینڈ آرٹ گیلری
۷۔ مال روڈ ، لاہور

انتساب

اس
انسانیت کے نام
جو کہ

آزادی کے جلو میں چلنے والی خونی آندھی کے دوران

عزت مآب
قابل صد احترام

مہاراجہ ہراندر سنگھ صاحب بہادر
والی ریاست فرید کوٹ
کے روپ میں ظاہر ہوئی



انسان فانی ہے
لیکن
انسانیت امر ہے

احقر

عمین الحق
فرید کوٹی

شکر

اس کتاب کے پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مجھے جو علمی معاونت جناب رزاق صاحب مہتمم میونسپل لائبریری کوئٹہ ، چودھری منیر الدین صاحب شعبہ لائبریری ، محکمہ اطلاعات ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ ، لاہور اور ڈاکٹر سردار جیت سنگھ سیتل ، ڈائریکٹر شعبہ پنجابی ، پٹیالہ ، (بھارتی پنجاب) کی طرف سے حاصل ہوئی اس کا تمہ دل سے شکر گزار ہوں ۔

ادارہ بلیک ویلز آکسفورڈ (BLACKWELL'S) کا بھی خاص طور پر ممنون ہوں کہ جس نے ایک وقت میں نہایت ضروری بیش قیمت کتب ادھار پر فراہم کیں ۔

سب سے آخر میں اپنے احباب خصوصی پروفیسر عرش صدیقی ، مسٹر ایس ۔ ایم ۔ بطارو ، جناب ابن حنیف اور جناب پروفیسر عبدالحمید صدیقی کے قیمتی مشوروں اور عملی تعاون کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں ۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ستارہ قائد اعظم ، تمغہ پاکستان ڈائریکٹر انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن سندھ یونیورسٹی ، حیدر آباد کا ممنون ہوں کہ آپ نے تعارف قلمبند فرما کر کتاب کی افادی حیثیت میں گرانقدر اضافہ فرمایا ۔

اگر میں ان نقاد حضرات کا شکریہ ادا نہ کروں تو احسان ناشناسی ہوگی کہ جنہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے میری کاوشوں کا بغور مطالعہ فرمایا اور ان کے بارے میں بعض اوقات متین اور سنجیدہ لہجے میں اور بعض اوقات تند و تلخ لہجے میں مجھے میری خامیوں سے آگاہ کیا اور اس طرح مجھے مزید غور و فکر کی دعوت دی ۔

قارئین سے.....

جیسا کہ کسی دوسری جگہ اظہار کیا گیا ہے یہ مضامین بنیادی طور پر علمی رسائل و جرائد کے لیے قلمبند کیے گئے تھے۔ اس لیے ان میں سے ہر مضمون ایک مکمل وحدت ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھ نفس مضمون کے علاوہ اپنا مخصوص پس منظر بھی رکھتا ہے۔ میں نے جب ان مضامین کو یکجا کر کے کتابی صورت میں مدون کرنے کی کوشش کی تو مجھے یہ احساس ہوا کہ اگرچہ نفس مضمون میں بھی کہیں کہیں تکرار کی جھلک موجود ہے مگر پس منظر میں تو تکرار غالب ہے جس کی وجہ سے ذہن بوجھ محسوس کرتا ہے۔ میں نے اس تکرار کو حتی الوسع کم کر کے ذہنی بوجھ کو دور کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بعض مقامات ایسے رہ گئے ہیں جہاں قطع و برید سے نفس مضمون کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا اس لیے ایک آدھ جگہ اس سقم کو بہ امر مجبوری رہنے دیا گیا ہے۔

اپنی جملہ خامیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف کے ساتھ میں قارئین کرام سے درخواست کروں گا کہ وہ ناشر کی معرفت اس کاوش کے بارے میں اپنی رائے گرامی اور قیمتی مشوروں سے مطلع فرمائیں تاکہ ان سے استفادہ کیا جاسکے نیز نفس مضمون کے بارے میں علمی معاونت کا خواہاں ہوں یعنی اگر آپ کے پاس لسانیات، آثار قدیمہ اور قدیم تاریخ کے موضوع پر کوئی ایسی کتاب موجود ہو جو کہ بازار سے دستیاب نہ ہوسکتی ہو تو اسے عاریتاً عطا فرما کر شکرے کا موقع دیں۔

تعارف

قرآن حکیم نے جہاں ”اقرا“ ، ”الکتاب“ اور ”الحکمة“ پر توجہ مرکوز کر کے انسانی معاشرے میں تعلیم اور تحقیق کی بنیادیں مضبوط کر دیں ، وہاں ’انسان‘ اور ’آفاق‘ (کائنات) کو ’آیات‘ فطرت سے تعبیر کرتے ہوئے دونوں کے تحقیقی مطالعے کی ترغیب دی۔ انسان کے فکر اور نظر میں وسعت پیدا کرنے کے لیے ، عالمی تاریخ میں پہلی بار تخلیقِ اشیاء اور تہذیبِ ادیان کو ایک فطری ارتقائی سلسلہ کا رہینِ منت قرار دیا۔ بتایا گیا کہ کائنات میں ذی حیات اشیاء مٹی اور پانی سے پیدا ہوئیں اور سب کی تولیدِ نر اور مادہ کی تزویج سے ہوئی۔ ابن آدم بھی ’علقہ‘ اور ’مضغہ‘ کے ابتدائی مدارج سے گزر کر پہلے زمین پر گھسٹ کر چلنے کے قابل ہوا ، پھر ہڈیوں کے نظام کی پختگی سے اس کی قامت استوار ہوئی ، پھر اولی الایدی بنا ، اور پھر اولی الابصار کی اعلیٰ منزل پر پہنچا۔ اسی طرح ’دین‘ کی ابتداء بھی بنی آدم کے ابتدائی گروہوں کے شعوری مسلک سے ہوئی۔ بعد میں انسانی شعور کی نشو و نما اور انسانی زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر ، ہر دور میں انبیاء ، اتقیاء اور علماء نے ’دین‘ کی توضیح کی ، اور عقائد اور اعمال کو خاندانی ، قبائلی اور قومی سطحوں سے اوپر اٹھا کر ذات انسانی کی رہنمائی کی اور اسے منفعت کے اعلیٰ معیار پر پہنچایا۔

قرآن حکیم نے اپنے خطاب میں تاریخی تسلسل ، تدریج اور ارتقاء کے مقدمات اور عوامل کو بار بار دہرا کر علماء اسلام کے فکر اور نظر کو ایسی نہج پر ڈال دیا کہ وہ ہر علمی موضوع پر ابتداء اور ارتقاء کے تسلسل کو پیش نظر رکھ کر سوچنے لگے۔ چنانچہ پہلی بار انہوں نے انسانی تاریخ کو محض حالیہ حالات کی تصویر و تعین کے بجائے ابتدای بنی آدم سے مدوں کرنا شروع کیا۔ معدنیات ، نباتات ، حیوانات اور خلقتِ انسان

پر جب لکھا تو ان کا مرکزی فکر یہی رہا کہ، ابتداء اور ارتقاء کے تسلسل کو سمجھا جائے۔ پینچمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقت افروز دعائیہ الفاظ ”اللہم ارنی حقائق الاشیاء کماہی“ نے حقائق کو سمجھنے کے لیے تحقیق در تحقیق کی ترغیب دلائی۔

ہنی نوع انسان اور ان کی بولیوں کے متعلق بھی قرآن حکیم نے فطرت کے ارتقائی قانون کی نشان دہی کرتے ہوئے ’اختلاف السنہ اور اختلاف الوان‘ کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا اور اس حقیقت کو باہمی تعارف کا آلہ قرار دیا۔ چنانچہ بیان کے اعجاز اور السنہ کے اختلاف کو سمجھنے کے لیے علماء اسلام نے ایک طرف الفاظ و اشتقاق، صرف و نحو، معانی و بیان، بلاغہ اور صوتیات (علم مخارج) کا تحقیقی مطالعہ کر کے ’علوم السنہ‘ کی بنیاد رکھی، تو دوسری طرف مختلف قبائل کی بولیوں کا تقابلی مطالعہ کر کے ’تقابلی لسانیات‘ کی داغ بیل ڈالی۔ آگے چل کر ’معرّب اور ادخیل الفاظ کی تحقیق کے سلسلہ میں فارسی، سریانی، عبرانی وغیرہ لغات کا تقابلی مطالعہ کیا۔ جو الیقی اور دوسرے محققین کی کوششیں اس سلسلہ میں بار آور ہوئیں۔ علماء لغت نے زبان کے ہر پہلو کا علمی تجزیہ کر کے اصول اور قواعد مرتب کیے، اور علمی تاریخ میں پہلی بار ’فہم اللغۃ‘ (Science of Language) کی بنیاد ڈالی۔ ابن فارس لغوی اور ثعالبی کی ’فہم اللغۃ‘ پر لکھی ہوئی کتابیں اس موضوع پر بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

اقوام عالم کے علوم و فنون، ادیان اور آراء کو سمجھنے کے لیے مسلمان محققین نے یونان، ایران، ترکستان اور ہندوستان کی زبانوں کا مطالعہ کیا۔ اس طرح معرفۃ اللغات^۱ ایک علمی موضوع بن گیا، اور

۱۔ اسلامی معاشرے میں علوم کی نشاۃ اور تدوین کے سلسلہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی (ف ۱۷۶۲ء) نے ایک مختصر مگر بیش بہا رسالہ بنام ”السترالمکتوم فی اسباب تدوین العلوم“ لکھا ہے جس میں علم ”معرفۃ اللغات“ کو خاص اس نام سے شمار کیا ہے:

”منہا (من العلوم) معرفۃ اللغات کا ل ترکیبہ والعربیۃ والفارسیۃ والہندیۃ“۔

انسان کی علمی تاریخ میں پہلی بار غیر ملکی زبانوں سے لاعلمی کے دور کا خاتمہ ہوا۔ ابن خلدون کو لاطینی زبان بولنے والوں کے متعلق البتہ یہ کہنا پڑا کہ ان کا مطالعہ اور لکھنا پڑھنا ان کی اپنی ہی زبان تک محدود رہا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی زبانوں میں سے علماء اسلام نے پہلے سندھی کو سمجھا اور پھر مزید تحقیق کے لیے سنسکرت کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان عالموں نے سب سے پہلے سنسکرت کے مطالعے کی علمی روایت قائم کی اور سنسکرت کے علمی ذخیروں سے بیرون ہند ممالک کو روشناس کرایا۔ ان کے اس علمی مطالعے کی تاریخ آٹھویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر سترھویں صدی کے آخر تک پہنچتی ہے۔ سب سے پہلے خلیفہ منصور عباسی کے عہد حکومت (۷۵۳ - ۷۷۴) میں مصنف 'برہم گپت' کی دو کتابیں 'برہم سدھنتا' اور 'کھنڈ کھادیکا' بغداد لائی گئیں جن کو الفزاری اور یعقوب بن طارق نے 'سند ہند' اور 'ارکند' کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ہارون الرشید (۷۸۶ - ۸۰۸) کے امراء برامکہ نے الموفق نام سنسکرت کے عالم کو برصغیر ہند میں مزید تحقیق کے لیے بھیجا۔ الموفق گویا البیرونی کا پیشرو تھا۔ گیارھویں صدی میں البیرونی (۹۷۳ - ۱۰۴۸) جو 'معرفة اللغات' میں یکتای روزگار تھا، سنسکرت زبان اور اس کے علمی ذخیروں کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی اپنی مادری زبان خوارزمی تھی۔ فارسی اور عربی پر اس

۱۔ "مقدمہ" میں مندرجہ ذیل اشارات 'معرفة اللغات' اور السنہ کے تقابلی مطالعہ پر معیاری فکر کے حامل ہیں :

"...the habit of linguistic expression among the Himyar differed from that of the Mudar Arabs. Both have their own general norms, which are evolved inductively from their ways of linguistic expression and are different from the norms of the other group". The Latin Byzantines, beside the Turks and the Indians, "have their own language. When they adopted Christianity...they came to be interested in their own language than in any other" (Rosenthal's trans., Vol. III, pp. 283-284).

کو عبور حاصل تھا۔ عبرانی اور سریانی کے علاوہ شاید یونانی سے بھی آشنا تھا۔ پھر اس نے سنسکرت کا مطالعہ کیا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ محقق البیرونی نے اپنی 'فیلڈ سٹڈیز' کو پشاور تا ملتان والے خطہ میں پھیلا یا، اور اپنی تحقیق کے دوران سنسکرت کے علاوہ مقامی زبانوں کے بعض الفاظ اور اصطلاحات کو بھی قلمبند کیا۔ اس کی تصنیف 'کتاب الہند' سنسکرت اور علوم سنسکرت کے مطالعے کے سلسلہ میں علمی دنیا میں پہلا محققانہ کارنامہ ہے۔

البیرونی کے بعد علماء غزنہ میں سے گردیزی (۱۰۴۹-۱۰۵۲ ع) اور محمد بن عقیل (۱۰۸۹-۱۰۹۹ ع) نے سنسکرت کا مطالعہ کیا۔ پھر ایک طویل وقفہ کے بعد خود ہند کے مسلمان علماء نے سنسکرت کے مطالعہ کی روایت کو پروان چڑھایا۔ چنانچہ سلطان فیروز شاہ (ف ۱۳۸۸ ع) کے عہد میں عبدالعزیز شمس نے 'ورا ہمیرا' کی کتاب کو 'ترجمہ براہمی' کے نام سے فارسی میں منتقل کیا۔ احمد ولی بھٹنی (ف ۱۴۴۴ ع) کے زمانے میں عبداللہ بن صفی نے 'شالیہوترا' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ سنسکرت کے مطالعہ کی یہ روایت عہد اکبری (۱۵۵۶-۱۶۰۵ ع) میں بام عروج پر پہنچی۔ فیضی، ابوالفضل، نقیب خان، عبدالقادر بدایونی، ملاحیری، خان خانان، محمد سلطان تھانسیری، سید امداد علی، ملا شاہ محمد شاہ آبادی وغیرہ ہم دسویں صدی ہجری میں سنسکرت کے محققین علماء میں سے تھے جنہوں نے سنسکرت شاہکاروں کے ترجمے کیے۔ مغلیہ دور میں سنسکرت دانی کا یہ سلسلہ دارا شکوہ اور دوسرے متأخرین علماء کے توسط سے سترھویں صدی کے آخر تک پہنچتا ہے۔

دنیا کے اسلام کے علمی کارناموں کے بعد جب علوم و فنون کی نشاۃ ثانیہ مغرب سے ہوئی تو علوم السنہ بھی رفتہ رفتہ ترقی پزیر ہوئے۔ ابتدائی توجہ الفاظ اور اشتقاق پر رہی۔ علماء مغرب نے جب مشرقی زبانوں کا مطالعہ کیا اور مشرق اور مغرب کی زبانوں میں مشترکہ الفاظ کا ذخیرہ پایا تو وہ تقابلی لسانیات کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے علماء مغرب کی اس موضوع پر تحقیق کے نئے تاریخی دور کی قدرے تفصیل سے نشان دہی کی ہے تاکہ زیر بحث مسائل کا

پس منظر ’کلتی طور پر قارئین کے سامنے آ جائے۔ اٹھارھویں صدی سے علماء مغرب نے سنسکرت کا علمی مطالعہ شروع کر کے اپنے، پیشرو مسلمان عالموں کی سنسکرت کے مطالعے کی نور سو سالہ تاریخی روایت کی توسیع کر دی۔ جناب عین الحق فرید کوٹی صاحب نے برصغیر پاک و ہند کی زبانوں کے علمی مطالعے کی طرف متوجہ ہو کر اپنی اس تصنیف سے علماء اسلام کی ’معرفة اللغات‘ والی علمی روایت کی پھر سے تجدید کی ہے۔

فاضل مصنف کی یہ کاوش خاص طور پر تاریخی لسانیات کے مختلف پہلوؤں کے تقابلی جائزوں پر حاوی ہے جن کا مقصد مندرجہ ذیل نظریات کی توضیح اور تصدیق ہے :

۱۔ آریائی قبائل کی آمد سے پہلے اس برصغیر میں اول منڈا گروہ کی زبانیں رائج تھیں، اور بعد میں دراوڑی گروہ کی زبانوں کا دور دورہ رہا۔

۲۔ شمالی ہند کی موجودہ عوامی زبانوں (اردو، پنجابی، سندھی وغیرہا) اور ان کی پیشرو مقامی پراکرتوں کا سرچشمہ یہی منڈا اور خاص طور پر دراوڑی گروہ کی زبانیں ہیں جو اس برصغیر میں سنسکرت سے پہلے رائج تھیں۔

۳۔ سنسکرت، آریائی قبائل کی اپنی لائی ہوئی زبان اور اس برصغیر کی قدیم مقامی زبانوں کے اختلاط سے معرض وجود میں آئی اور یہ بہت بعد کا زمانہ ہے۔

۴۔ شمالی ہند کی عوامی زبانوں کے صرف و نحو اور سنسکرت کے صرف و نحو میں جو اصولی فرق موجود ہے وہ اس امر کا بے ثبوت ہے کہ یہ عوامی زبانیں سنسکرت سے نہیں بلکہ قبل از سنسکرت والے دور کی پراکرتوں سے ماخوذ ہیں۔ البتہ سنسکرت کے الفاظ کی ایک کثیر تعداد عوامی زبانوں میں موجود ہے۔

تقابلی لسانیات کے ماہرین نے پچھلے قریبی دور میں جو نتائج مرتب

کہے ہیں ان سے ان نظریوں کی تائید ہوتی ہے ۱ - البتہ ان ماہرین لسانیات کی تحقیق کا مواد مختلف تصانیف و مضامین کی صورت میں بکھرا ہوا ہے - فاضل مصنف نے اس کتاب میں ان کی محققانہ آراء کی تالیف سے ایک اہم علمی خدمت سر انجام دی ہے جس سے اس موضوع پر مزید تحقیق کے لیے رہنمائی ہو سکتی ہے -

اس کتاب کا موضوع جتنا وسیع ہے اتنا ہی پیچیدہ ہے ، اور ان کے اکثر پہلو ہنوز تشنہ تحقیق ہیں - لیکن تحقیق کا یہی تقاضا ہے کہ مختلف مسائل کو علمی شواہد خواہ قیاسی دلائل سے زیر بحث لایا جائے تاکہ مزید بحث و نظر کے لیے راہیں کھل سکیں - فاضل مصنف کی یہ کوشش اسی مسلک کی علمبردار ہے - اس میں بعض قیاسی دلائل اور فروعی مباحث میں اختلاف کے لیے گنجائش نظر آئے گی ، لیکن کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد بہت سے شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے - مصنف نے جو کچھ لکھا ہے کھلے ذہن سے لکھا ہے ، اور وہ علمی تحقیق کی روشنی میں ابتدائی خیالات کو بدل دینے کے قائل ہیں - چنانچہ شروع میں ایک جگہ پر مسلمانوں کی اس برصغیر میں آمد کو سنسکرت کے خاتمہ سے تعبیر کیا ہے (ص ۵۴) لیکن بعد میں صحیح طور پر لکھا ہے : ”بلکہ حق تو یہ ہے کہ (سنسکرت) مقامی بولیوں کی مقبولیت کے زیر اثر خود بخود ختم ہو گئی“ (ص ۶۳) -

دوسری جگہ پر مصنف کی عبارت سے یہ گمان ہوتا ہے کہ آریائی قبائل

۱ - مصنف نے مختلف علماء لغت کے نظریے پیش کیے ہیں - محقق پشیل بھی اپنی تصنیف ”پراکرت زبانوں کا تتابلی گرامر“ میں ان ہی نظریوں کا حامی ہے :

“I agree with Senart that all the Prakrits go back to popular dialects as their source (p. 7). This Sanskrit was not the basis of the Prakrit dialects (p. 4). The fact that all the new Indian languages do not go back to Sanskrit today needs no more proof (p. 6).” (R. Pischel : *Comparative Grammar of the Prakrit Languages*, translated from the German by Subhadra Jha, Delhi, 1957, pp. 4 - 7).

'سنسکرت' کو بحیثیت اپنی مادری زبان کے باہر سے لائے تھے ، اور وقت گزرنے پر وہ مقامی زبانوں سے خلط ملط ہو کر اپنا "خالص پن کھو بیٹھی" (ص ۵۶)۔ غالباً آریائی قبائل اپنی کوئی 'آریائی زبان' اپنے ساتھ لائے جو بعد میں مقامی پراکرتوں کے مسلسل عمل اور رد عمل ، اور پھر پنڈتوں اور نحوویوں کی کاوش سے عوامی زبان کے بجای ایک دھرمی، علمی اور کتابی زبان 'سنسکرت' کی صورت میں معروف ہوئی۔

ایک خاص نظریہ جس کو مصنف نے کافی وثوق سے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ وادی 'سندھ کی زبانوں کی مورث اعلیٰ سنسکرت نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر دراوڑی زبانیں ہیں (ص ۶۳) اور پنجابی زبان کا دھارا بھی دراوڑی زبانوں سے پھوٹا ہے (ص ۶۲)۔ آج سے ایک سو سال پیشتر اور پچھلی صدی کے نصف آخر میں شمالی ہند کی زبانوں کی اہلیت کے بارے میں دو نظریے قائم ہو چکے تھے۔ محققین کا ایک طبقہ ان کو سنسکرت سے اور دوسرا دراوڑی گروہ کی زبانوں سے مشتق قرار دینے لگا تھا۔ سنہ ۱۸۵۹ع میں آر۔ جی۔ لیتھام کی وضاحت (ص ۱۲۹) سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسی دور کے ایک دوسرے محقق جارج شرت نے سنہ ۱۸۷۸ع میں ، سندھی زبان میں دراوڑی عنصر تلاش کرنے کی کوشش کی اور اس موضوع پر ایک مضمون لکھا۔ ہمارے فاضل مصنف نے وادی 'سندھ کی زبانوں میں دراوڑی عنصر کو اجاگر کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے ، اور اس موضوع پر دو باب تفصیل سے لکھے ہیں۔ (ص ۱۲۸-۱۸۶) جو اس کتاب کی جان ہیں۔ مصنف نے اپنے استدلال میں موجودہ دراوڑی اور شمالی ہند کی عوامی زبانوں کے مشترکہ لغوی ذخیرہ (الفاظ ، افعال ، ضائر وغیرہ) کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ ایک ایسا دلچسپ ذخیرہ ہے کہ جس کی مزید چھان بین ہو سکتی ہے۔ 'منڈا اور دراوڑی گروہوں کی زبانوں میں مستعمل ایسے الفاظ کہ جن کے مستعار ہونے کا شائبہ نہ ہو ، اس مشترکہ ذخیرہ کا ایسا سرمایہ ہیں کہ جس کو بڑے وثوق سے عوامی زبانوں کے ماخذ کے طور پر مانا جا سکتا ہے۔ البتہ کئی ایسے الفاظ بھی اس ذخیرہ میں پائے جاتے ہیں

1. George Shirt : *Traces of a Dravidian Element in Sindhi*, The Indian Antiquary, Vol. VII-1878.

جو غالباً مستعار ہیں۔ مثلاً توشہ، گہاشتمہ، زال وغیرہ فارسی الاصل ہیں۔ دلال اور منیب عربی الاصل ہیں اور 'کارو' (کالا black) ترکی الاصل ہے۔

بعض مقامات پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مماثلت لغات کو بطور شواہد تسلیم کرتے ہوئے قطعی قسم کے کچھ فیصلے قلمبند کر دیے ہیں (ص ۱۲۵ اور ص ۲۱۰)۔ تاہم ان کو بخوبی معلوم ہے کہ: "کئی ایک محققین محض الفاظ کے اشتراک کی بناء پر کوئی فیصلہ صادر کرنا مناسب نہیں سمجھتے تاوقتیکہ اس کے صوتی اور صرفی و نحوی پہلو سے بھی اس کی تائید نہ ہوتی ہو" (ص ۱۹۷)۔

لہذا انہوں نے آگے قدم بڑھا کر مزید تقابلی موازنہ سے دراوڑی گروہ، اردو اور پنجابی کے درمیان صرفی و نحوی مماثلت کی مثالیں پیش کی ہیں جو قابل قدر اور قابل غور ہیں۔

اس کتاب کا بڑا حصہ ایسے مباحث پر مشتمل ہے کہ مجموعی طور پر اس کا نام "شالی ہند کی عوامی زبانوں کا لسانی خمیر" بھی تجویز کیا جا سکتا ہے، لیکن مصنف کے سامنے ایک خاص مقصد یہ تھا کہ اردو زبان کی قدیم تاریخ کا سراغ لگایا جائے، لہذا کتاب کا نام بھی "اردو زبان کی قدیم تاریخ" ہی رکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں فاضل مصنف نے جو مقدمات اور نتائج پیش کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ: اردو سنسکرت سے نہیں نکلی بلکہ اس کا سرچشمہ وادی سندھ کی قدیم زبان ہے (ص ۵۸)، اور اردو پنجابی سے مشتق ہے (ص ۷۸)۔ ان کی مراد غالباً یہ ہے کہ وادی سندھ کی قدیم نمایندہ زبان پنجابی ہے لہذا وہی اردو کا سرچشمہ ہے۔ علاوہ اس کے، پنجابی اور اردو میں بالکل ہی قریبی لسانی مماثلت موجود ہے جس سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ یہ سب غور طلب دلائل ہیں جو اس ضمن میں مزید تحقیق کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ہندوستان، دکھن، پنجاب، سندھ اور گجرات میں اردو کی نشوونما کے نظریے ایک مدت سے پیش ہو چکے ہیں۔ راجستھانی خطہ کے حق میں بھی دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اتنے وسیع جغرافیائی خطوں میں کچھ ایسے لسانی خمیر کی موجودگی کہ جس سے مختلف لب و لہجہ اور

لغات پر مبنی ایک ملتی جلتی زبان معرض وجود میں آئے ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ جس کو اس برصغیر میں ہمہ گیر لسانی ارتقاء کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ لہذا، ایک نقطہ نظر سے، اردو کی نشو و نما کی لسانی یا جغرافیائی حد بندی حقائق کے منافی ہو سکتی ہے۔

فاضل مصنف نے اپنے لسانیاتی اور لغوی مباحث و دلائل کا سلسلہ شمالی ہند اور خصوصاً وادی سندھ کی زبانوں سے وابستہ کیا ہے لیکن مقدمات اور نتائج اتنے جامع ہیں کہ وہ صرف شمالی ہند یا وادی سندھ کی زبانوں تک محدود نہیں ہوتے بلکہ برصغیر کی اکثر زبانوں پر یکساں لاحق ہو سکتے ہیں۔

ایک توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ پنجابی، سرائیکی اور سندھی تینوں وادی سندھ کی ہمسایہ زبانیں ہیں لہذا پنجابی اور سرائیکی، سرائیکی اور سندھی، اور سندھی اور پنجابی میں ایک قریبی لسانی مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے سرائیکی کو سندھی کا جز تسلیم کیا ہے، اور ہمارے فاضل مصنف اس کو پنجابی کا ایک محاورہ شمار کرتے ہیں (ص، ۷)۔ سرائیکی جو کہ اپنے مختلف محاوروں (ملتان، بہاولپوری، دبرہ والی وغیرہ) پر مشتمل اور پنجابی اور سندھی کی درمیانی کڑی ہے، اپنی انفرادی خصوصیات کی حامل ہے۔ لہذا سرائیکی کو وادی سندھ کی ایک مستقل زبان تسلیم کرنا حقائق کے زیادہ قریب تر ہو گا۔ ”برصغیر ہند کے لسانی جائزہ“ میں گریٹیرسن نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

ایک محقق کے لیے اس کتاب کے ہر باب میں سوچ اور فکر کا سامان موجود ہے۔ وہ بار بار سوالات پوچھ سکتا ہے اور تحقیق طلب مسائل کی طرف اشارہ کر سکتا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فاضل مصنف نے نہایت ہی پیچیدہ لسانی مسائل کا قابل داد تجزیہ کیا ہے۔ یہ ایک خالص علمی کتاب ہے جس سے مصنف کے وسیع مطالعے، موضوع سے محبت، اور مسائل کی توضیح و تنقیح میں مشقت کا پتا چلتا ہے۔

اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے، جو شمالی ہند کی عوامی زبانوں کی اصلیت کی نشان دہی کرتی ہے، اور خصوصی طور پر ہند، دراوڑی، سنسکرت اور وادی سندھ کی مقامی زبانوں کے باہمی تعلق

اور لسانی خمیر کی کمیت اور کیفیت کی آئینہ دار ہے - موضوع اتنا وسیع ہے ، کہ باوجود ضروری وضاحت اور تفصیل کے ، ہم کہہ سکتے ہیں کہ فاضل مصنف نے سردست اختصار اور اجہال سے کام لیا ہے اور اپنی اس تصنیف میں مختلف نظریوں کے خاکے مرتب کیے ہیں تاکہ مزید تحقیق کے لیے راہیں کھل سکیں - بعض مقامات پر انہوں نے مزید تحقیق کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے - اس سلسلہ میں مصنف خود بھی ”ہڑپائی تہذیب کے لسانی رشتے“ جیسے تحقیق طلب موضوع پر ایک جدا گانہ کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں (ص ۹۴) - اللہم زد فزدد !

نبی بخش بلوچ

سندھ یونیورسٹی

حیدرآباد ، سندھ

۱۵ - اپریل ۱۹۷۱ء

فہرست

انتساب [۵] - تشکر [۷] - قارئین سے . . . [۸] - تعارف [۹]

پیش لفظ

۱

لسانیات کی تاریخ

۱۷

لسانیات کی ابتداء ۱۷ - عہد نامہ عتیق ۱۹ - فلاطو و سقراط
 ۱۹ - روسو ۲۰ - مسئلہ ارتقاء کا ظہور ۲۱ - کانٹ اور گوٹھے
 ۲۲ - ہرڈر : لسانیات کا پیشرو ۲۳ - افق مغرب پر سنسکرت
 کا طلوع ۲۴ - تقابلی لسانیات کی بنیاد ۲۵ - جرمنی میں لسانیات
 کی نشو و نما ۲۶ - مولر اور وہٹنے ۲۷ - ڈارون کی آمد آمد
 ۲۸ - حیوان ناطق اور حیوان مطلق ۳۰ - اشاراتی زبان ۳۱ -
 الفریڈ رسل والس ۳۲ - الیگزینڈر جابنسن ۳۳ -

۳۵

زبان کے میکانیکی پہلو

زبان کیا ہے ؟ ۳۶ - زبان کا تجزیہ ۳۷ - آواز اور زبان ۳۹ -
 اشارہ ہائے لب ۴۰ - انسانی آلات صوت ۴۲ - گلو ۴۳ - منہ :
 زبان کا منبع ۴۵ - پھول کا سفر ۴۷ - گوش بر آواز ۴۹ -

۵۳

ایک نظرے کا ارتقا

طبقاتی تفاوت ۵۴ - سنسکرت کا بھوت ۵۵ - نئی راہیں ، نئی
 منزل ۵۵ - نازک موڑ ۵۸ - پنجابی کی بنیادیں ۶۰ - ہڑپائی تہذیب
 کی دریافت ۶۲ - یارانِ ہم نوا ۶۴ - سہیل بخاری اور وزیر آغا

۶۶

اردو زبان کا پس منظر

آغاز اردو کے بارے میں چند نظریات . ۷ - ہند آریائی زبانوں کا
گورکھ دہندا ۷۲ - ہند یورپائی گروہ ۷۲ - قدیم ہند یورپائی
۷۲ - ہند آریائی ۷۲ - ویدک زبان ۷۳ - سنسکرت ۷۴ -
پراکرت ۷۵ - وراوچی ۷۵ - ہم چندر ۷۵ - مارکنڈیہ کاوندرا
۷۶ - بہاشا ۷۶ - وبہاشا ۷۶ - اپ بھرنش ۷۶ - پشاچی ۷۶ -
اپ بھرنش ۷۶ - اصطلاحات اور مفہیم ۷۷ - سنسکرت ۷۷ -
پراکرت ۷۸ - اپ بھرنش یا دیسی بہاشائیں ۷۸ - شمالی ہند کی
قدیم زبانیں ۷۸ - شور سینی ۷۸ - کیکہ ۷۸ - پشاچی ۷۸ -
برج بہاشا یا پنجابی ۷۹ - لسانی تقسیم ۸۰ - تقابلی مطالعہ ۸۲ -
سنسکرت ، فارسی اور اردو ۸۴ - دادن مصدر سے فعل حال کی
گردان ۸۵ - تذکیر و تانیث ۸۵ - واحد جمع ۸۸ - گرامری تفاوت
۹۱ - ہڑپہ کی طرف ۹۳ -

ہڑپہ سے پہلے

تہذیبی ادوار ۹۶ - آمری نال تہذیب ۹۷ - منڈا قبائل ۹۸ - منڈا
رسم و رواج ۱۰۰ - منڈا تہوار ۱۰۲ - تہذیبی آمیزش اور لسانی
اثرات ۱۰۲ - تقابلی جائزہ ۱۰۴ - رشتہ جات ۱۰۴ - جسمانی اعضاء
۱۰۵ - زیورات ۱۰۶ - پیمانے ۱۰۷ - خورد و نوش ۱۰۸ - نباتات
۱۰۸ - حیوانات ۱۰۹ - ضروریات زندگی ۱۰۹ - متفرقات ۱۱۳ -
افعال ۱۱۷ - اسمائے ضمیر ۱۱۹ - قبیلے اور ذاتیں ۱۲۰ - منڈاری
اور پشتو ۱۲۱ - بہاری بستیوں کے منڈاری نام ۱۲۳ -

وادی سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات

سنسکرت اور مقامی زبانیں ۱۲۸ - ہڑپائی تہذیب کی دریافت ۱۳۱ -
ہڑپائی تہذیب کے لسانی پہلو ۱۳۲ - آریائی یا دراوڑی ۱۳۳ -
مقامی زبانوں کا سرمایہ الفاظ ۱۳۵ - برصغیر کی قدیم زبانیں
۱۳۷ - پنجابی اور دراوڑی ۱۳۸ - دراوڑی ، اردو اور پنجابی کا

مشترکہ سرمایہٴ الفاظ ۱۴۰ - تقابلی خاکے ۱۴۱ - جسمانی اعضاء
 ۱۴۲ - رشتہ جات ۱۴۳ - حیوانات ۱۴۸ - خورد و نوش ۱۵۰ -
 ضروریات خانہ داری ۱۵۳ - زیورات و ملبوسات ۱۵۷ - پیشہ
 وارانہ نام ۱۵۹ - صفات اور اسمائے صفات ۱۶۲ - افعال ۱۶۳ -
 برصغیر کی زبانوں کا تقابلی جائزہ ۱۶۹ - اسمائے ضمیر : آریائی
 گروہ کی زبانیں ۱۷۰ - ایک دراوڑی گیت ۱۷۱ -

پنجابی اور دراوڑی زبانوں میں اضافی اور مفعولی علامتوں کا اشتراک

۱۷۳

علامت اضافت : ایک تقابلی جائزہ ۱۷۵ - مار بمعنی درخت کی
 اضافی حالت کی گردان ۱۷۷ - سنسکرت میں اسماء کی اضافی حالت
 کی گردان ۱۷۸ - دراوڑی مارم یا مارا بمعنی درخت کی
 مفعولی حالت کی گردان ۱۸۳ - سنسکرت میں اسماء کی مفعولی
 حالت کی گردان ۱۸۳ - پراکرتوں میں پت (بیٹا) کی مفعولی
 حالت کی گردان ۱۸۵ -

سنسکرت اور پراکرتیں

۱۸۷

تقابلی لسانیات کی تاریخ ۱۸۸ - لسانی تقسیم کی بنیادیں ۱۹۳ -
 زبانوں کی تقسیم اور گروہ بندی ۱۹۶ - صوتیات ۱۹۶ - لغات
 ۱۹۷ - صرف و نحو ۱۹۷ - لسانی ارتقاء کے اولین مراحل ۱۹۸ -
 دراوڑی زبانوں سے مثالیں ۲۰۰ - جملے کی ساخت ۲۰۰ -
 دراوڑی ، پنجابی اور اردو ۲۰۲ - مصدر کرنا سے فعل حال کی
 گردان ۲۰۳ - ترکی زبان ۲۰۵ - مصدر دینا سے فعل حال کی
 گردان ۲۰۶ - عبرانی زبان ۲۰۷ - عربی زبان کی مثال ۲۰۷ -
 ہند آریائی زبانوں کا پس منظر ۲۰۸ - آریائی زبان کا مشترکہ
 سرمایہٴ الفاظ ۲۱۰ - سنسکرت اور آریائی زبانیں ۲۱۱ - سنسکرت
 کا صوتی نظام ۲۱۳ - سنسکرت صرف و نحو ۲۱۵ - سنسکرت کا
 سرمایہٴ الفاظ ۲۱۷ - سنسکرت لغات کے اشتقاقی پہلو ۲۲۰ -
 خالص آریائی عنصر ۲۲۱ - چند وضع کردہ الفاظ ۲۲۲ -

- اخذ و انجذاب ۲۲۳ - مقامی اثرات ۲۲۵ - سنسکرت کی وسیع
المشربی ۲۲۷ - پراکرتیں اور سنسکرت ۲۲۸ - پراکرتوں کا
صوتی تجزیہ ۲۲۹ - صرف و نحو کا ڈھانچہ ۲۳۰ - سرمایہ الفاظ
- ۲۳۲

۲۳۷

وادیٰ سندھ اور ترکی و تاتاری زبانیں

- وسط ایشیا اور وادیٰ سندھ کے تعلقات کی قدامت ۲۳۸ -
دراوڑی اور یورال التائی گروہ کی زبانوں کا تقابلی جائزہ ۲۵۲ -
وادیٰ سندھ پر ترکوں کی پہلی یلغار ۲۵۷ - یوہچی
ترک قبائل ۲۵۷ - کدفیسیس ثانی ۲۵۹ - کنشک اعظم ۲۶۰ -
کشن عہد کے آخری ایام ۲۶۱ - کشن عہد کا لسانی ورثہ
۲۶۱ - نقش باغستان ۲۶۲ - پاکستان کی افواج قاہرہ ترکستان
میں ۲۶۳ - وسط ایشیا میں پاکستانی نو آبادیاں ۲۶۴ - وسط
ایشیا کی پاکستانی نو آبادیوں کا خاتمہ ۲۶۶ - وادیٰ سندھ کے
مہاجر آرمینیا میں ۲۶۸ - تلک : غزنوی لشکر کا ہندو سپہ سالار
۲۷۱ - ہندو جاٹ مغربی ایشیا میں ۲۷۲ - وسط ایشیا میں
پاکستانی عہد کے لسانی اثرات ۲۷۲ - ترک قبائل کے ورود کا
دوسرا دور ۲۷۳ - ترک قبائل کا دوسرا دور اور اس کے لسانی
اثرات ۲۷۳ - الفاظ کی وضاحت : شاگرد ۲۷۵ - باورچی ۲۷۵ -
عربی فارسی اصل کا مشترکہ عنصر ۲۷۶ - بعض پاک تری
الفاظ کی سرگزشت : داروغہ ۲۷۷ - کوتوال ۲۷۸ - تنخواہ
۲۷۹ - بہادر ۲۸۳ - شغال ۲۸۴ - شلوار ۲۸۴ -

۲۸۷

وادیٰ سندھ کی زبان پر یونانی اثرات

- سکندر کی آمد ۲۸۸ - یونانی زبان کا دور دورہ ۲۸۹ - یونانی
اور پنجابی کا باہمی رشتہ ناطہ ۲۹۰ - یونانی الفاظ قافلہ افرنگ
کے ہمراہ ۲۹۱ - عرب و یونان کے تعلقات ۲۹۱ - یونانی الاصل
عربی الفاظ ۲۹۳ - ایران اور یونان ۲۹۵ - یونانی الاصل فارسی
الفاظ ۲۹۵ - ہند آریائی ورثہ ۲۹۵ - آریائی الاصل یونانی الفاظ
۲۹۶ - پنجابی عورتوں کی یونانی زبان ۲۹۸ - لوک کہانی ۲۹۸ -

پنجابی زبان میں یونانی عنصر ۳۰۰ - یونانی الاصل پنجابی الفاظ
 ۳۰۱ - چند یونانی الفاظ کی تشریح : شیطان ۳۰۵ - یونان ۳۰۶ -
 بت - ۳۰۷ - دام ۳۰۸ - عطار ۳۰۹ - انجیل ۳۱۰ - پنجابی اور
 اردوگرامر پر یونانی اثرات ۳۱۰ - آریائی زبانوں کی اضافی حالت
 کی گردان ۳۱۱ -

کتابیات

۳۲۱

صحت نامہ

۳۳۵

پیش لفظ

یہ ایک فطری امر ہے کہ ہر ایک انسان کسی نہ کسی جنون کا شکار ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس کی بے اعتدالیاں عام زندگی میں نظر آجاتی ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بظاہر ایک انسان میانہ روی کا حامل نظر آتا ہے لیکن اگر اسے نزدیک جا کر دیکھا جائے تو ظاہری بہروپ کے پس پردہ ایک بالکل انوکھی شخصیت چھپی ہوئی نظر آئے گی۔

میری اپنی زندگی بھی اس غیر متوازنیت سے مبرا نہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ مطالعہ اور کتابیں جمع کرنے کا خبط تو قریب قریب دیوانگی کی حدوں کو چھو چکا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں کتابوں کے علاوہ کھنڈرات سے دستیاب ہونے والے سکے اور سنکے، اخباری تصویریں، پھول، پتے، رنگ برنگے پر اور تتلیاں بھی جمع کیا کرتا تھا جنہیں پرانی کاپیوں میں بڑے اہتمام سے سجا کر اپنی کتابوں والی الہاری کے ایک کونے میں بڑی حفاظت سے رکھ چھوڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ عجائب گھر ہمیشہ چھوٹے بہن بھائیوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔ وہ اکثر اپنی سہیلیوں اور دوستوں کو بھی ساتھ لے آتے کہ آؤ آپ کو بھائی جان کی تتلیاں دکھائیں مگر میں اس خزانے کی روایتی سانپ کی طرح حفاظت کرتا اور کسی کو نزدیک نہ پھٹکنے دیتا لیکن انہیں میری ایک کمزروی کا بخوبی علم تھا۔ جب میں الہاری کے سامنے کوئی کتاب کھول کر بیٹھ جاتا تو وہ دے پاؤں آتے اور الہاری سے اپنی مطلوبہ کاپی نکال کر لے جاتے۔ میں مطالعہ میں اس قدر مگن ہوتا کہ مجھے ان کی اس حرکت کا احساس تک نہ ہو پاتا۔ وہ سامنے چارپائی پر بیٹھ کر بڑے مزے سے ان کاپیوں کی ورق گردانی کرتے رہتے اور مجھے اس وقت پتہ چلتا جب کہ وہ ان عجائبات کو دل بھر کر دیکھ لینے کے بعد قمقمے لگاتے ہوئے دروازے سے باہر بھاگ کھڑے ہوتے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس دیوانگی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ننھے کے کپڑے اگر پھٹ گئے ہیں تو انہیں اگلے ماہ کی یکم تک ملتوی کر دیا جاتا۔ بیوی کے دوپٹے کی فرمائش مہینوں تک، ٹالتا رہتا لیکن اگر کوئی کتاب پسند آجاتی تو یار دوستوں سے ادھار لے کر بھی خرید لیتا۔ گو کتاب کا خرید لینا تو کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن مشکل مرحلہ اسے گھر میں لانے کا ہوتا تھا۔ ہر نئی کتاب کی آمد گھر میں ایک نئے زلزلے کا پیش خیمہ ثابت ہوتی۔ 'یہ موٹی کتابیں میری جان نہیں چھوڑیں گی۔ ننھا چیتھڑے پہنے پھر رہا ہے اس کے لیے دو روپے نہیں نکلتے، دو ماہ سے میں ننگے سر پھر رہی ہوں، گھر میں فاقوں کی نوبت ہے لیکن ان موٹی کتابوں کے لیے روپیہ آسان سے برس پڑتا ہے۔ آج ذرا باہر جاؤ، میں ان سب کو چولہے کی نذر کر دیتی ہوں، پھر جو کچھ کرنا ہو کر لینا۔' یہ سنتے ہی میں سر سے پاؤں تک لرز اٹھتا کہ کہیں سچ سچ ہی یہ الفاظ حقیقت کا روپ نہ دھار لیں۔ میں بہانہ بناتا کہ یہ کتاب بازار سے تھوڑا خریدی ہے یہ تو ایک دوست سے پڑھنے کے لیے لایا ہوں۔ 'ہاں! ہاں! مجھے سب معلوم ہے۔ یہ موٹے دوست اتنے ہی سخی داتا واقع ہوئے ہیں کہ آپ کو ایک دفعہ کتاب دے کر پھر پوچھتے ہی نہیں اور یہاں ان کلمونہی کتابوں کے ڈھیروں کے ڈھیر لگتے جا رہے ہیں جیسے یہ گھر نہ ہوا کتابوں کی کوئی دکان ہوئی۔ میں بہت تمہارا منہ دیکھ چکی ہوں۔ اب کے میں اپنے میکے گئی تو کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔ تو اپنی ان کچھ لگتی کتابوں کو لے کر بیٹھے رہنا۔'

نہیں کہہ سکتا اگر سچ سچ ہی مجھے بیوی اور کتاب کے درمیان ایک کا انتخاب کرنا پڑتا تو قرعہ کس کے نام نکلتا۔

اس خبط کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب کبھی طبیعت کچھ اچاٹ ہوئی یا تفکرات نے گھیر لیا تو میں دل بہلانے کے لیے کتابوں کی دکانوں کی طرف رخ کرتا ہوں۔ کتب فروشوں کو مرعوب کرنے کے لیے چند ایک موٹے موٹے مصنفوں اور چند ایک نایاب کتابوں کے نام رٹ رکھے ہیں کہ جنہیں 'آوٹ آف پرنٹ' ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ دکان میں داخل ہوئے اگر دکاندار یا سیلزمین نے دریافت کر لیا کہ جناب! کونسی کتاب چاہیے تو وہ از بر شدہ نام لے دیا۔

’نہیں جناب یہ تو موجود نہیں۔‘ بھر دوسری کتاب کا نام لے دیا اور ایسے ہی جب دو تین کتابوں کا نام لینے کے بعد بھی مطلوبہ کتابوں کے نہ ہونے کا اظہار کر دیا گیا تو پھر یہ کہہ کر کہ اچھا دیکھتا ہوں شاید کوئی اچھی کتاب مل جائے کتابوں کی الہاریوں کی طرف رخ کیا۔ اگر انہوں نے دخل دینا مناسب نہ سمجھا تو فبہا۔ ایک سرے سے شروع ہو کر کتابوں کے نام پڑھتے پڑھتے دوسرے سرے تک پہنچ گئے اور اس طرح دیکھتے دیکھتے دروازے سے باہر ہو گئے۔ پھر اگلی دکان پر۔ حتیٰ کہ طبیعت سیر ہو گئی تو بغیر کچھ خریدے واپس لوٹ آئے۔

یہ ۱۹۶۵ء کے ستمبر کا مہینہ تھا۔ پاک و ہند کی جنگ تیسرے ہفتے میں داخل ہو چکی تھی۔ میں دفاعی فرائض کے سلسلہ میں لاہور کے نواح میں متعین تھا۔ دفاعی سرگرمیوں کی بناء پر کتابوں سے جدا ہوئے بہت دن بیت چکے تھے۔ ایک دن دوپہر کے بعد میں ابھی محاذ جنگ سے اپنے ہیڈ کوارٹر میں واپس لوٹا ہی تھا کہ معلوم نہیں دل میں کیا آئی کہ بغیر ہاتھ منہ دھوئے دھول سے اٹے ہوئے لباس ہی میں بس پر سوار ہو گیا اور مال روڈ کا رخ کیا۔ اب کتابوں کی جس بھی دکان میں داخل ہوتا ہوں وہ میری اس ہیئت کڈائی کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ بہر حال میں ان کے گھورنے سے بے پرواہ ہو کر اپنے ذوق کی تسکین میں مصروف رہا۔ اس طرح کتابوں کی خوشبو سے دل و دماغ کو تازہ کرتا ہوا کتابوں کے ایک نئے چمنستان میں جا داخل ہوا۔ اندر پہنچ کر قرینے سے سجائی ہوئی خوب صورت گرد پوش والی کتابوں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھورنا شروع کر دیا۔ دل میں آئی کہ اگر بس چلے تو سب کتابیں سمیٹ کر لے جاؤں۔ شومیٹے قسمت سے یہ مینا جلد ہی ٹوٹ گیا۔ کیونکہ صاحب دکان غالباً میرے دھول سے اٹے ہوئے چہرے اور گرد آلود لباس سے متاثر ہو کر کاؤنٹر سے اٹھ کر میرے پاس آ کھڑے ہوئے۔ میں وہاں سے کان دبا کر رفو چکر ہونے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ’جناب! کیا چاہیے؟‘ کی آواز کان میں آئی۔ اب نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ درپیش تھا۔ مجبوراً میں نے کہا کہ سپنوزا کی کوئی کتاب ہو تو دکھائیے۔ بغیر کسی توقف کے تین چار کتابیں میرے سامنے تھیں۔ دل میں آئی کہ یوں تو کام نہیں چلے گا۔

میں نے کہا کہ میں تو کاغذی جلد اور جیبی سائز میں پسند کرتا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ پیپر بیک میں ان کی ایک کتاب تھی لیکن وہ دو دن پہلے ختم ہو چکی ہے۔ دل میں کہا کہ شکر ہے۔ اگر خدا نخواستہ کوئی کاپی بچ رہی ہوتی تو پھر ما بدولت کیا کرتے؟ 'اچھا جناب اگر وہ پیپر بیک ایڈیشن دوبارہ آئے تو میرے لیے ایک کاپی ضرور محفوظ رکھیں۔' خفت مٹانے کے لیے پھر کہا کہ 'کیا آپ کے پاس گارڈن چائلڈ کی مشرق کے قدیم شہر ہے؟' انہوں نے بلا تامل اس مصنف کی تازہ ترین تصنیف لا کر سامنے رکھ دی۔ میں نے کہا کہ نہیں مجھے تو اسی کتاب کی ضرورت ہے۔

کوئی اور دکاندار ہوتا تو بھانپ لیتا کہ ابن جناب کس قسم کے خریدار ہیں۔ غالباً اندازہ تو انہوں نے بھی لگا لیا ہوگا لیکن ان کے لب و لہجے کی شیرینی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کے طرز گفتگو میں اس قسم کی بے تکلفی تھی کہ اب میں قدرے اطمینان محسوس کر رہا تھا لیکن اب میں کسی اور کتاب کا نام لیتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ مبادا سامنے ہی نہ آجائے۔ آخر انہوں نے سلسلہ گفتگو جاری رکھنے کے لیے سوال کیا کہ آپ اتنے خشک موضوعات پڑھ کر کیا کرتے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ بس ایسے ہی شوق ہے۔ انہیں پڑھ کر کبھی کبھار ایک آدھ مضمون بھی قلم بند کر لیتا ہوں 'آپ کی تعریف؟'—'نیاز مند کا حقیقی نام تو فضل الہی ہے لیکن ادبی حلقوں میں 'عین الحق فرید کوٹی' کے قلمی نام سے یاد کیا جاتا ہوں۔'

'اچھا تو آپ ہیں عین الحق صاحب، خوب! چلیے بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں۔'

چائے کا آرڈر دے دیا گیا اور ہم ایک گوشے میں کرسیوں پر جا بیٹھے۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر ان کی دکانداری کا یہ عالم ہے تو یہ کتنے دن چلے گی۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ 'بندہ کو ظفر اقبال کہتے ہیں اور آپ کی قلمی کاوشوں کا عرصہ سے مداح ہوں۔'

چائے آئی اور چائے کی پیالی کے ساتھ ایک نئی دوستی کی بنیادیں استوار ہو گئیں۔ اب ہم دکاندار اور خریدار کی بجائے ظفر اور حق میں تبدیل ہو چکے تھے۔ میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے ہم صدیوں

سے ایک دوسرے کے واقف چلے آ رہے ہوں۔ اب ظفر صاحب مجھے جنگ کے دنوں کی دریافت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں تو میں ان کی دوستی کو زمانہ جنگ کی بہترین یادگار تصور کرتا ہوں۔ باتوں ہی باتوں میں انہوں نے ذکر کیا کہ ان کے علاوہ ان کے ایک دوست بشیر صاحب جو کہ حلقہ ناشرین سے تعلق رکھتے ہیں میرے مضامین میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس مجموعہ کو کتابی صورت دے دی جائے۔ میں نے کہا پھر بسم اللہ کیجیے۔ ایک دوسری ملاقات میں بشیر صاحب سے تعارف کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے بتلایا کہ وہ کافی عرصہ سے میرے پتہ کی تلاش میں تھے تا کہ ان مضامین کی کتابی صورت میں اشاعت کے لیے بات چیت کی جا سکے۔ ان کے اصرار اور خلوص کے پیش نظر میں نے نہایت ہی نامساعد حالات کے باوجود ان مضامین پر نظر ثانی کا وعدہ کر لیا۔

مجھے یہ تسایم کرنے میں باک نہیں کہ یہ کتاب مجھ سے زیادہ ظفر صاحب اور بشیر صاحب کے شوق اور پیہم اصرار کا نتیجہ ہے۔ اگر ان کی حوصلہ افزائی شامل حال نہ ہوتی تو ان دنوں ادبی لحاظ سے جن نامساعد حالات سے مجھے گزرنا پڑا ایسے میں کسی ادبی تخلیق کا وقوع میں آنا ممکنات میں سے نہ تھا۔

کیا اس کتاب کی اشاعت محض ایک اتفاقی امر ہے؟

میرے پاس اس کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ نہیں!، اس کے پس منظر میں بچپن میں دادی اماں سے سنی ہوئی مہم جو شہزادوں، دیوؤں کی مقید حسین پریوں اور پر اسرار وادیوں کی کہانیوں سے لے کر ہڑپائی تہذیب کے کھنڈرات کی سیاحت تک ایک طویل داستان پوشیدہ ہے۔ ایک رشی منی جیسی ریاضت، ایک زاہد کی طرح شب بیداری اور ایک عاشق صادق سی لگن اس داستان کے نمایاں پہلو ہیں۔ الف لیلا کی طرح یہ داستان بظاہر کئی ایک کہانیوں کا مجموعہ نظر آتی ہے مگر اس کی ہر ایک کہانی انفرادی طور پر مکمل ہوتے ہوئے بھی ایک دوسری سے مربوط اور منسلک ہے۔ اس وقت ان تمام کہانیوں کا احاطہ کرنا نہ تو ممکنات میں سے ہے اور نہ مناسب۔ ہاں! اس کے اجاگر پہلوؤں پر اچھتی ہوئی نظر ڈال لینا قارئین کے لیے نہ صرف دلچسپی کا باعث ہوگا

بلکہ اس طرح وہ مصنف کو نہایت ہی قریب سے دیکھ سکیں گے اور ساتھ ہی زیر نظر کاوش کے پس منظر کا صحیح اندازہ بھی لگا سکیں گے۔

اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ میری ادبی زندگی کی بنیادیں سید امتیاز علی تاج اور سدرشن کی مرہون منت ہیں کیونکہ جب میں ابھی تیسری جماعت ہی میں تھا تو والد مرحوم نے بچوں کے محبوب ہفت روزے 'پھول' اور 'پریم' میرے نام جاری کروا دیے تھے۔ پانچویں جماعت سے سردار دیوان سنگھ مفتون کے اپنی قسم کے واحد ہفت روزہ 'ریاست' سے استفادہ کا موقع ملا اور آزادی پاکستان تک یہ سلسلہ باقاعدہ جاری رہا۔ حق تو یہ ہے کہ اس کے بعد کوئی دوسرا ہفت روزہ دل میں جچا ہی نہیں۔ ۱۹۴۲ء کے اوائل میں روزگار کے سلسلے میں پونا (صوبہ بمبئی) جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں تین سالہ قیام کے دوران سید عبداللہ بریلوی کے ہفت روزہ 'بمبئی کرانیکل' اور آتش نفس مسٹر جوشم ایلوا کے ہفت روزہ 'فورم' سے مستفید ہونے کا موقع ملا، بعد ازاں پاکستان کے عالم وجود میں آنے تک جنوبی ہند کے مختلف مقامات میں قیام کے دوران ان سے بدستور لگاؤ قائم رہا۔ اس کے علاوہ 'اسٹیٹسمن' اور 'السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا' سے لے کر 'خیام' اور 'عالمگیر' تک مختلف قسم کے اخبار و رسائل زیر مطالعہ آتے رہے لیکن ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ کسی باغ میں چہل قدمی کے دوران کوئی انسان راستہ میں سامنے آنے والے پھولوں کی رنگ و بو سے دل و دماغ کو تازہ کرتا چلا جائے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد مختلف روزناموں، ہفت روزوں اور ماہناموں سے خبروں اور مضامین کی بدولت دلچسپی تو ضرور قائم رہی لیکن اس طویل مدت میں کسی ایڈیٹوریل کو پڑھنا پسند نہیں کیا۔ شاید اگر کیانی مرحوم کی زندگی کچھ اور وفا کرتی اور وہ کوئی ہفت روزہ جاری کرتے تو میری کھوئی ہوئی دلچسپیاں دوبارہ لوٹ آتیں۔

والد مرحوم کا کہنا تھا کہ میں بچپن میں اکثر پرانے زمانے کی کوئی کہانی سنانے کا مطالبہ کرتا تھا۔ ادھر رات پڑی، بستروں پر لیٹے اور تقاضا شروع ہوا کہ 'ابا جی! آج 'پرپرار' (قدیم سے قدیم زمانہ) کی بات سناؤ۔' ایام مدرسہ میں بھی یہ 'پرپرار' کی دلچسپی قائم رہی اور تاریخ میرا محبوب ترین مضمون بن گیا۔ چھٹی جماعت سے عبدالجلیم شرر،

ندیم صہبائی ، صادق سردھنوی کے تاریخی ناول اور خواجہ حسن نظامیؒ کی تاریخی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔ سکندر اعظم ، چندرگپت ، اشوک ، کنشک ، محمد بن قاسمؒ ، محمود غزنویؒ ، بابر ، اکبر ، رانا سانگا ، مہارانا پرتاپ اور ٹیپو سلطانؒ میرے محبوب ہیرو تھے۔ اگرچہ مطالعہ کے دوران تاریخ کے موضوع پر کئی ایک کتابیں نظر سے گزر چکی تھیں لیکن جس کتاب نے اس شوق کے لیے مہمیز کا کام کیا وہ ایچ ، جی ، ویلز کی شہرہ آفاق کتاب 'تاریخ عالم کا خاکہ' (Out lines of the World History) تھی۔ اس میں 'پرپرار' کے تجسس کی تسکین کے لیے وافر سامان میسر تھا۔ وادی نیل ، بابل ، نینوا ، قرطاجنہ اور پتھر اور دھات کے زمانوں کی رومانوی داستانوں میں میرے لیے خاص کشش موجود تھی اور آج بھی میری تمام تر دلچسپیاں 'زمانہ قبل از تاریخ' پر مرکوز ہیں۔ جس میں خاص کر ہڑپائی اور بابلی تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے۔

ہڑپائی تہذیب کے مطالعے کے دوران جو بات مجھے سب سے زیادہ کھٹکتی تھی وہ اس تہذیب کے لسانی پہلو سے عدم توجہی یا عدم واقفیت تھی۔ گو اس تہذیب کے قریب قریب تمام پہلو اجاگر کیے جا رہے تھے لیکن زندگی کے سب سے اہم شعبہ 'زبان' کو نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ میں نے اس بارے میں غور و خوض شروع کر دیا اور یہاں سے لسانیات کے مطالعہ کی چاٹ پڑ گئی۔ اس طرح تاریخ کے پہلو بہ پہلو لسانیات کا موضوع بھی میرے مطالعے کا خصوصی حصہ بن گیا۔ میرا خیال ہے کہ تاریخی پہلو کی تحقیق کے لیے لسانیات کا مطالعہ لازمی ہے اور اس طرح لسانیات کی تحقیق بھی تاریخی پس منظر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

میں نے ادبی زندگی میں کیسے قدم رکھا؟

یہ بھی ایک عجیب قصہ ہے۔ برصغیر کی آزادی کے بعد بے سروسامانی کی حالت میں نئے وطن میں وارد ہوئے۔ مہاجر کیمپوں کی زندگی سے پناہ کی تلاش میں گلی کوچوں کا طواف شروع کیا تا کہ سر چھپانے کو کوئی جگہ مل سکے لیکن یہاں تو عالم ہی کچھ اور تھا۔ جگہ جگہ مہاجروں کو بسانے کی آڑ میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ دو سو

روپے دو اور مکان لے لو ، چھ سو روپے میں کوٹھی اور ہزار روپے میں دکان ۔ ہر ایک جنس کا ایک نپا تلا بھاؤ مقرر تھا ۔ اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو ۔ اگر جیب خالی ہے تو مزے کرو ۔ اپنے پاس قفل کھلوانے کے لیے کوئی سنہری چابی نہ تھی ۔ چنانچہ اپنے لیے کوئی در وا نہ ہوا ۔

ان نامساعد حالات میں ملازمت کے سلسلے میں کیمبل پور جانا ہوا ۔ شومیے قسمت سے اہل خانہ صاحب فراش ہو گئیں ۔ تنخواہ کا زیادہ حصہ قرض میں اٹھ جاتا ۔ گھر میں بعض اوقات فاقوں کی سی نوبت ، دوا دارو کے لیے جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ، والدین کے خط پر خط آرہے ہیں : 'بیٹا کچھ رقم ارسال کرو گھر میں گزارہ کی کوئی صورت نہیں ۔' افسران بالا ایک سے ایک بڑھ کر فرعون جن سے ہمدردی کی توقع لا حاصل ۔ ان گونا گوں مسائل کا حل تلاش کرنے کا جتن کرتا لیکن ذہنی قوتیں قریب قریب مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں ۔ گھر میں داخل ہوتا تو بیمار بیوی کی سوالیہ نگاہیں میری راہ تک رہی ہوتیں اور میں مجبوراً نظریں بچا کر پاس سے گزر جاتا ۔ کئی دفعہ سوچتا کہ کیا خود کشی ان مسائل کا واحد اور بہترین حل نہیں ؟ دوسرے ہی لمحے ننھے اور گڈی کا خیال قدموں سے لپٹ جاتا ، بیوی کی اداس نگاہیں راستے میں حائل ہو جاتیں اور بوڑھے ماں باپ کی بیکسی کا تصور سامنے آجاتا اور میرے تھکے تھکے قدم مجھے واپس لے آتے ۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اگر مالی دشواریوں سے گریز ممکن نہیں تو پھر کیا کرنا چاہیے ۔ ایسے حالات میں ۱۹۴۸ء کے دسمبر کی ایک سرد مہر شام کو جب کہ اداس ساٹے طویل سے طویل تر ہوتے جا رہے تھے میں ہفت روزہ 'آفاق' کا تازہ پرچہ کھولے بیٹھا تھا لیکن تفکرات کے اندھیروں نے صفحات کے متن پر سیاہی پھیلا دی تھی ۔ نگاہیں سطروں کی سیاہی اور سفیدی کی حدود سے گزر کر کہیں دور موہوم دھندلکوں میں کھو گئی تھیں ۔ معاً ذہن کی گہرائیوں سے ایک عجیب و غریب خیال بجلی کی طرح سطح کی طرف لپکا اور میں نے پرچہ بند کر دیا ۔ کیوں نہ میں بھی لکھنا شروع کر دوں ؟ آخر یہ لکھنے والے کوئی آسمانوں سے تو نازل نہیں ہوتے ؟ فوراً ہی ملک کے مشہور و معروف لکھنے

والوں کے بڑے بڑے نام نگاہوں کے سامنے گھوم گئے اور جب میں نے اپنا موازنہ ان کے ساتھ کرنا چاہا تو پھر مایوسیوں کے اندھیاروں میں کھو گیا۔ سوچا کہ چلو نہ سہی لیکن ایک دفعہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگلے دن اتوار تھا صبح اٹھا، منہ ہاتھ دھویا، چائے پی اور سائیکل اٹھا بازار کا رخ کیا۔ سٹیشنری کی دکان سے ایک کاپی خریدی اور واپس آ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے میں نے کوئی بڑا بھاری معرکہ سر کر لیا ہو۔

صحن میں چارپائی ڈالی، کاپی کھولی، قلم ہاتھ میں لیا اور بیٹھ گیا۔ بیوی نے پوچھا کسے خط لکھ رہے ہو میں نے کہا آج تمہارے نام خط لکھ رہا ہوں اور شروع کر دیا:

”اس ملک یا قوم کی ترقی کے امکانات کہاں تک امید افزا ہو سکتے ہیں کہ جس کی قریب قریب نصف آبادی کو چراغ خانہ یا شمع محفل کا خطاب دے کر ایک عضو معطل قرار دے دیا جائے...“

اس طرح معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں پر نشتر زنی کر کے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے شروع کر دیے۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس لکھنے کی تہ میں اصلاح معاشرہ کا جذبہ کار فرما تھا یا مالی منفعت کا یا پھر تفکرات سے فرار کی ایک صورت تھی یا محض وقت کٹی کا ایک ذریعہ۔ بہر حال اپنے گرد و پیش کے بارے جو کچھ محسوس کر رہا تھا اسے لفظی جامہ پہنا کر قریباً دو ہفتے میں کاپی ختم کر ڈالی۔

نیا سال شروع ہوا۔ تنخواہ پر ایک اچھا سا رائٹنگ پیڈ خرید کیا اور کاپی سے وہ تمام مضمون اس پر اتار لیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ اتنا لمبا سارا مضمون کہاں بھیجا جائے۔ انہی دنوں سرور صاحب نے لاہور سے ہفت روزہ ’آفاق‘ ابھی نیا نیا نکالنا شروع کیا تھا اور عوام میں اسے بڑی قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ آخر ہرچہ بادا باد... کہہ کر یہ مسودہ آفاق کے نام ارسال کر دیا۔

مسودہ ڈاک کے سپرد کرنے کے بعد دن گننا شروع کر دیے۔ مجھے طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ رہ رہ کر یاد آ رہا تھا جب کہ

درجہ دہم کے دوران میں نے فرنگی استحصال کے خلاف 'سونے کی چڑیا' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور روزنامہ 'ملاپ' لاہور کو بھیج دیا۔ مہینوں انتظار کے باوجود نہ وہ مضمون چھپا اور نہ رسید ملی۔ میں نے دل ہی دل میں ایڈیٹر کو کوسنا شروع کر دیا کہ کتنا احسان فراموش ہے، اتنا اچھا مضمون بھیجا اور اس نے شائع نہیں کیا۔ پھر اپنی ایک غزل کی اشاعت کا قصہ سامنے آیا۔ سکول سے فراغت کے بعد شہر کے عوامی شاعر شگفتہ لاہوتی کی صحبت کے زیر اثر شاعری کا دورہ پڑا اور شعلہ فرید کوٹی کے تخلص سے بزعم خود غزلیں، رباعیاں، قومی نظمیں، گیت اور دوہے گھڑنا شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ لاہور سے شائع ہونے والے ایک رسالہ 'ساز' کی مارچ یا اپریل ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں میری ایک غزل بعنوان 'شعلہ افشانیوں' شائع ہو گئی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ ماہنامہ کے ایڈیٹر یا تو کچھ زیادہ ہی حوصلہ افزائی کے حق میں ہوں گے یا پھر ان کا مدعا اپنے قارئین کی تفریح و تہنہ کے لیے ایک نئے نمونہ سے روشناس کرانا ہوگا۔ بہر حال اب نہ تو اس غزل! کی کوئی نقل میرے پاس موجود ہے اور نہ اس کا کوئی شعر یاد ہے وگرنہ اب بھی آپ کی ضیافت طبع کے لیے پیش کر دیتا۔ ہاں! اس عبوری دور کے صرف دو شعر یاد ہیں۔ پڑھیے اور سر دھنیے :

یہ رخ پہ جو زلف سیاہ کی جھلک ہے
جو رنگینیاں یہ صبح شام کی ہیں
دل و جان اور دین و ایمان ہیں قربان
یہ قربانیاں سب تیرے نام کی ہیں

۱۹۳۶ء کے انقلابی دور کی ایک قومی نظم! کے دو بند بھی

ملاحظہ ہوں :

ظلم کا دور حکومت جبر کے سر تاج ہے
لاشہ معصوم پہ یاں کرگسوں کا راج ہے
دیو استبداد کا ہر سمت ہے سکہ رواں
ملک یہ نادر کے ہاتھوں ہو رہا تاراج ہے

چاہتی ہو تم مگر کہ عیش ہو

کب تلک سمہتے رہیں گے جان ! یہ ریخ و محن
 آؤ مل کر بدل دیں ہم گردش چرخ کہن
 آؤ شعلوں کی نذر کر دیں یہ مصنوعی امن
 آؤ سینچیں خون سے اپنے یہ گلزار وطن
 چاہتی ہو تم اگر کہ عیش ہو

دن گزرتے گئے - انتظار کی گھڑیاں طویل سے طویل تر ہوتی گئیں -
 امید کی آخری کرن بھی یاس کے گھپ اندھیروں میں گم ہوتی ہوئی نظر
 آنے لگی - آخر بیم و رجا کی دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل ختم ہو گیا -
 ۲۱ فروری ۱۹۴۹ء کا دن تھا کہ مجھے ایک غیر مانوس سا خط
 ملا - یہ خط پروفیسر سرور صاحب ایڈیٹر آفاق کی طرف سے تھا - ڈرتے
 ڈرتے پڑھنا شروع کیا :

”مسودہ ملا - شکر یہ ! اسے عنقریب شائع کر دیا جائے گا -
 اگر آپ فرمائیں تو آپ کے مسودہ کو کتابی شکل دے دی
 جائے - امید ہے آپ آفاق کے لیے برابر لکھتے رہیں گے -“

غالباً بہت کم مبتدیوں کو اتنے حوصلہ افزا الفاظ نصیب ہوئے
 ہوں گے - یہ مضمون ۲۷ فروری سے لے کر ۱۰ اپریل ۱۹۴۹ء تک
 پانچ اقساط میں شائع ہوا - سرور صاحب کے اصرار پر اتنا ہی طویل
 ایک دوسرا مضمون لکھا جو کہ ۱۴ مئی تا ۲۰ اگست ۱۹۴۹ء مزید
 پانچ اقساط میں شائع ہوا - اب میں اپنے آپ کو پانچوں سواروں میں شمار
 کرنے لگا - اس اثناء میں لاہور سے محترمہ ادیبہ بزمی کی ادارت
 میں ’بنت راوی‘ کے نام سے ایک اصلاحی پندرہ روزہ جاری ہوا - محترمہ
 نے ان شائع شدہ مضامین کی افادی حیثیت کے پیش نظر انہیں دسمبر
 ۱۹۵۱ء تا اگست ۱۹۵۲ء کے شماروں میں بالاقساط دوبارہ شائع
 کیا - بعد ازاں اس موقر جریدہ کے لیے چند مزید مضامین قلمبند کیے -
 اب دوسرے پرچوں میں بھی طبع آزمائی شروع کر دی - ’لسانیات کی
 تاریخ‘ جو کہ روزنامہ ’امروز‘ کے استقلال نمبر (۱۵ اگست ۱۹۵۴ء)
 میں شائع ہوا میرے اولین دور کا سب سے قابل ذکر مضمون کہا جا
 سکتا ہے -

غلطی سے میں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء شاعری ، افسانہ نگاری ، انشاء پر دازی یا ہلکے پھلکے مضامین کے بجائے نہایت ہی سنجیدہ اور ادق قسم کے مضامین سے کی تھی ۔ جیسے جیسے میں اس میدان میں آگے قدم رکھ رہا تھا ، رہوار قلم ایک مخصوص ڈگر کا عادی ہوتا جا رہا تھا ۔ آخر انجانے طور پر اس نے قدیم تاریخ اور لسانیات جیسی سنگلاخ وادیوں کو اپنی جولانگاہ کے طور پر منتخب کر لیا ۔ ظاہر ہے کہ ان موضوعات پر خامہ فرسائی کے لیے وسیع مطالعہ اور کتابوں کے ڈھیر درکار ہیں ۔ اب گھر میں پھر وہی جنگ کا سماں رہنے لگا اگرچہ اب میں کتابوں کی سمگلنگ میں کافی ماہر ہو چکا تھا لیکن یہ چوری کچھ زیادہ دیر تک چھپی نہ رہ سکتی تھی ۔ آخر دو کمروں کے گھر میں کتابوں کو تکیے کے نیچے کتنی دیر تک چھپایا جاسکتا تھا ۔ اب محترمہ کو ایک اور اعتراض بھی ہاتھ لگ گیا :

”یہ رات کے دو دو بجے تک مغز ماری کرتے ہوئے اگر پاگل خانے نہ پہنچ گئے تو میرا نام بدل دینا ، نہ کچھ لینے کو نہ دینے کو، جوں بیٹھتے ہیں سونے کا نام ہی نہیں لیتے ، سو دفعہ کہا ہے کہ خدا کے بندے ان اپنی کچھ لگتی کتابوں کا پیچھا چھوڑو ، نہ دن کو آرام نہ رات کو چین ، ادھر سورج غروب ہوا ادھر اپنے چاروں طرف کتابیں بکھیر کر بیٹھ گئے ۔ جیسے یہ موٹے کاغذ نہ ہوئے کوئی قارون کا خزانہ ہوا ۔“

مجھے معلوم تھا کہ یہ شوق مہنگا ہی پڑے گا ۔ سیاہی سے لے کر بھاری بھر کم کتابوں تک کا بوجھ اس نحیف و نزار تنخواہ پر ہی پڑنا ہے جو کہ گھر کے ضروری اخراجات کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی لیکن جیسے جیسے میں اپنی عرق ریزی کے نتائج کو اخبار و رسائل کے صفحات کی زینت بنا ہوا دیکھتا اسی طرح آتش شوق فزوں سے فزوں تر ہوتی جاتی گو سوائے ایڈیٹروں کے شکریہ اور مزید تقاضوں کے کچھ حاصل نہ تھا ۔ کئی دفعہ سوچتا کہ آخر یہ کھیل کب تک جاری رکھ سکوں گا ۔

لسانیات کے مطالعہ کے دوران بعض الفاظ کے استخراج و اشتقاق کے بارے میں کئی ایک دلچسپ پہلو سامنے آئے۔ اس بارے میں ایک مختصر سا مضمون قلمبند کیا اور 'سرمایہ' اردو' کے عنوان سے ہفت روزہ 'لیل و نہار' کو بھیج دیا جو کہ ان دنوں اپنے عنفوان شباب پر تھا۔ دو تین دن بعد سید سبط حسن کا خط ملا '... یہ سلسلہ دلچسپ ہے۔ اسے جاری رکھیں...'۔ اسی ہفتے ۵ اپریل ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں مضمون شائع ہو گیا یعنی یہ سب معاملہ کوئی ہفتے کے اندر اندر ہی طے ہو گیا۔ مواد اپنے پاس پہلے ہی وافر موجود تھا۔ اب یہ 'سرمایہ اردو' کا سلسلہ چل نکلا اور معاوضہ بھی معقول مل رہتا لیکن فلک ناہنجار کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی اور 'لیل و نہار' مارشل لا والوں کو اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اس پر قبضہ جہا لیا۔ پرانے سٹاف کو اپنا پاندان اٹھا لینے کا حکم مل گیا اور وہ بیچارے جان کی امان پاتے ہوئے جدھر سینگ سہائے بھاگ نکلے۔ اپنی نہ تو مارشل لا والوں سے کوئی پر خاش تھی اور نہ 'لیل و نہار' کے نئے سجادہ نشینوں سے لیکن ہوا یہ کہ سب سے پہلا نزلہ بیچارے 'سرمایہ اردو' کے سلسلہ پر ہی گرا اور اسے اپنے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں بند کر دیا گیا۔ ہم 'وہ جو بیچتے تھے دوائے دل...' کا ورد کرتے ہوئے کسی نئے دوارے کی تلاش میں چل نکلے۔ انہی دنوں آصف صاحب کا خط ملا کہ 'پنجابی ادب' کے لیے بھی کچھ لکھوں۔ یہ جو 'ادب' والی بات تھی وہ تو اپنی جگہ ٹھیک تھی لیکن یہ 'پنجابی' والا معاملہ کچھ ٹیڑھا نظر آتا تھا کیونکہ پنجابی بولنا اور بات ہے لکھنا اور۔ بہر حال میں نے موقعہ غنیمت جانا اور جوں توں کر کے ایک مضمون 'پنجابی دیاں جڑاں' (پنجابی زبان کی جڑیں) کے عنوان سے لکھا اور بھیج دیا اور انہوں نے جھٹ چھاپ دیا۔ اس کے بعد اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی لکھنا شروع کر دیا لیکن اب بات پھر وہیں 'شکریہ' پر آ پہنچی تھی۔ پھر بھی جیسے تیسے کر کے لکھنے کا شغل جاری رکھا۔

اس 'پنجابی دیاں جڑاں' والے مضمون میں ضروری ترمیم و اضافہ کر کے اسے اردو کا جامہ پہنایا اور 'وادی' سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات' کے عنوان سے پاکستان کے موقر اردو جریدے 'اردو نامہ'

کراچی کو بھیج دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ ادارہ کہیں اس مضمون کو 'دیوانے کی بڑ' سمجھ کر ردی کی ٹوکری کی نذر نہ کر دے کیونکہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا مضمون تھا جس میں مقامی زبانوں میں آریاؤں سے قبل کے عناصر کی واشگاف الفاظ میں نشان دہی کی گئی تھی اور ان زبانوں کے بارے میں مروجہ آریائی الاصل ہونے کے نظریہ کی تردید کی گئی تھی۔ اس نظریے کو پروان چڑھانے والے باون گزوں کے بلند آہنگ نام مثلاً میکس مولر، جاہن بیمنز، ہورنلی، وہٹنی، چارلس لائل، گریسن اور میکڈانل وغیرہ ذہنوں پر کچھ اس طرح سایہ فگن تھے کہ ان کی تردید کے بارے میں سوچنا بھی گناہ کبیرہ تصور کیا جاتا تھا۔ سوچتا تھا کہ دیکھیے کیا ظہور میں آتا ہے کہ ایک دن جناب شان الحق صاحب حتی کا نوازش نامہ موصول ہوا 'مقالہ کی ترسیل کے لیے نہایت شکریہ! یہ سلسلہ' عنایات جاری رکھیں۔ بہت کم حضرات کو لسانیات کے موضوع پر لکھنے کی توفیق ہوئی ہے...۔' اپنے مضمون کے بارے میں یہ رائے میری توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ یہ مضمون 'اردو نامہ' کے شمارہ ششم، ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ جس دن یہ شمارہ مجھے موصول ہوا میں وفور جذبات سے ساری رات نہ سو سکا۔

اب جولائی طبع کے لیے ایک نیا میدان ہاتھ آ گیا۔ میں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا تہیہ کر لیا اور 'اردو نامہ' میں مضامین اور تنقیدی مراسلوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ حوصلہ افزائی یہیں ختم نہیں ہو جاتی اس مضمون کے بارے میں ڈاکٹر جیت سنگھ سیٹل (ایم اے۔ پی ایچ ڈی) ڈائرکٹر، شعبہ پنجابی، محکمہ لسانیات (بھارتی پنجاب) نے بھی نہایت اعلیٰ رائے کا اظہار کیا اور اسے اپنے موقر سرکاری جریدے 'پنجابی دنیا' (پٹیالہ) میں دوبارہ شائع کیا۔ بعد ازاں 'مجلس ترقی ادب' لاہور نے اسے سن مذکور کا پاکستان بھر میں بہترین تحقیقی مضمون قرار دیتے ہوئے اس پر مبلغ ایک ہزار روپے کا انعام عطا کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ مضمون کئی ایک اہل نظر سے داد تحقیق حاصل کر چکا ہے جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔

پیش نظر کتاب احباب کی اس حوصلہ افزائی، میری محنت جناب
ظفر اور بشیر صاحب کے اصرار اور اشتیاق کا نتیجہ ہے۔

عین الحق فرید کوٹی

جمہلم چھاؤنی

ستمبر ۱۹۷۰ء

لسانیات کی تاریخ

ہم دن رات باتوں میں مصروف رہتے ہیں، وہ کاروباری قسم کی ہوں یا دوستانہ، لڑائی جھگڑے کی ہوں یا مقدمہ بازی کی، بہر حال ہماری زندگی کا ایک بڑا حصہ محض باتوں باتوں ہی میں گزر جاتا ہے لیکن ہم یہ سوچنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کرتے کہ یہ اتنی باتیں کرنا ہم نے کہاں سے سیکھا ہے اور ان باتوں کے لیے یہ بے شمار الفاظ کہاں سے آئے ہیں۔ آپ کہیں گے 'عجیب بے معنی سا سوال ہے کون نہیں جانتا کہ باتیں کرنا ہم نے اپنے بڑوں سے سیکھا ہے اور الفاظ کا ایک بڑا حصہ بھی انہی سے حاصل کیا ہے پھر یہ کتابوں کے انبار پہ انبار سب الفاظ ہی سے تو بھرے پڑے ہیں۔' آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن ذرا یہ تو سوچیں کہ آپ کے آباؤ اجداد نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں اور کتابوں کے یہ ڈھیر کے ڈھیر الفاظ کہاں سے آگئے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب کوئی کتاب موجود نہ تھی بلکہ ابھی تک فن تحریر بھی عالم وجود میں نہیں آیا تھا، نہ انسان کے پاس الفاظ کا کوئی ذخیرہ موجود تھا اور اسے اپنے اظہار خیال کے لیے صرف ہاتھوں کے اشاروں اور معمولی ہا... ہے... ہو... ہی... وغیرہ قسم کی بے ربط اور بے ضبط آوازوں سے کام لینا پڑتا تھا۔ آج ہم آپ کو اسی دور کی طرف لے چلتے ہیں جب انسان صرف زبان اور ہونٹوں کو اپنے اظہار مطلب کے لیے استعمال کرنے کی کوشش میں ہے اور جہاں الفاظ ابھی تک سانچے ہی میں ڈھل رہے ہیں تکمیل تو ایک طرف ان کی تشکیل تک بھی پوری طرح نہیں ہو پائی۔ اس سے پہلے کہ ہم زبان کے ارتقاء کا جائزہ لیں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان کاوشوں پر بھی ایک سرسری سی نظر ڈال دی جائے جو کہ اس تحقیق و تدقیق کی راہ میں صرف کی گئی ہیں۔

لسانیات کی ابتداء

زبان کی ابتداء کا مسئلہ ہمیشہ انسان کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے لیکن شروع شروع میں اسے کسی مافوق الفطرت قوت کے نام منسوب

کر کے دل میں پیدا ہونے والی الجھنوں کی تشفی کر لی۔ کہیں اسے منروا کے نام سے منسوب کیا تو کہیں سرسوتی، ایتھنا اور ٹوٹ کو اس کا خالق قرار دیا لیکن جب ہم دنیا کی قدیم ترین کتاب رگ وید میں 'واک' (بمعنی لفظ) کے عنوان سے دیے ہوئے ایک نغمہ حمد کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسے موجودہ لسانیات کے نظریوں سے کافی حد تک منطبق پا کر حیران رہ جاتے ہیں۔ اس نغمہ میں مرقوم ہے :

”جب ازمنہ قدیم میں روشن ضمیر مہارشی برہسپتی نے منہ سے پہلے پہل نکلمنے والی آوازوں کو الفاظ کی شکل دی تو وہ پاکیزہ جذبات جنہیں انسان عرصے سے اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے تھا (سب پر) ظاہر ہو گئے۔“

”دانشوروں نے سوچ سمجھ سے کام لے کر الفاظ کو سنوارا اور جس طرح سے غلے کو چھلنی میں ڈال کر چھانا جاتا ہے انہیں چھانٹ کر (فضولیات سے) علاحدہ کیا۔“

”انہوں نے الفاظ کی تلاش میں بڑی جانفشانی سے کام لیا اور انہیں دور دراز بسنے والے رشیوں منیوں سے حاصل کر کے اکٹھا کیا، پھر انہیں اکناف عالم میں ہر طرف بکھیر دیا اور سات مغنیوں نے مل کر انہیں گیتوں کی شکل میں گایا۔“

اسی کا نتیجہ ہے کہ :

”ایک آدمی تو بیٹھا ہوا شعروں کے حسین پھول بکھیر رہا ہے، دوسرا ہے کہ میٹھی دھنوں میں ایک نغمہ الاپ رہا ہے، تیسرا بطور ایک برہمن کے اس عالم موجودات کے قانون بیان کر رہا ہے اور چوتھا مقدس قربانی کے حصوں کے لیے پیمانے مقرر کر رہا ہے۔“

اگر اس نغمہ حمد میں مذکور مہارشی برہسپتی کو ایک ایسی ہستی تسلیم کر لیا جائے جس نے اپنے عہد میں مروجہ الفاظ کی چھان بین یا ترتیب و تدوین میں سب سے پہلے یا سب سے زیادہ حصہ لیا تو یہ بیان حمد فیصد درست نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ

حقیقت آنکھوں سے پوشیدہ ہوتی گئی اور انسان اپنی اوبہا پرست فطرت کی بناء پر زبان کو قدرت کا ایک کرشمہ شمار کرنے لگا۔ خود قدیم ہند میں ایک وقت ایسا آیا کہ رگ وید کے مذکورہ بالا صریح بیان کے باوجود سرسوتی دیوی کو زبان کا مبداء قرار دے دیا گیا حالانکہ رگ وید میں اس دیوی کا ذکر محض ایک دریا کی دیوی کے آیا ہے۔

عہد نامہ عتیق

عہد نامہ عتیق میں زبان کی ابتداء کے متعلق مرقوم ہے :
 ”اور خداوند خدا نے کل دشتی جانور اور ہوا کے کل پرندے مٹی سے بنائے اور ان کو آدم کے پاس لایا کہ دیکھئے کہ وہ ان کے کیا نام رکھتا ہے اور آدم نے جس جانور کو جو کہا وہی اس کا نام ٹھہرا۔“ (کتاب پیدائش)

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حقیقی طور پر وہ آدم ہی تھا جس نے ہر ایک چیز کو علیحدہ علیحدہ نام دیا لیکن لوگوں نے اس امر کو اس طرح سے توڑ مروڑ کر پیش کیا کہ ان ناموں یا الفاظ کو براہ راست خدا سے منسوب کیا جانے لگا یعنی یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ الفاظ یا نام ان کی صوتی ہیئت میں خود خدا نے انسان کو سکھائے۔ ایک بڑے عرصے تک اس خیال کو امر مسلمہ کا درجہ حاصل رہا اور ایک بڑے طبقے میں ابھی تک یہی نظریہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

فلاطو و سقراط

مشہور یونانی فلاسفر اور مفکر فلاطو (۴۲۷ تا ۳۴۷ ق م) بھی زبان کے مافوق الفطرتی مآخذ کا حامی نظر آتا ہے اگرچہ وہ اس پہلو میں کچھ متذبذب ضرور تھا جیسا کہ اس کی تصنیف ’کریٹیلوس‘ (Cratylus) سے ظاہر ہے جس میں وہ ایک جگہ یہودی نظریہ کو تسلیم کرنے کے بعد لکھتا ہے :

”آخر زبان کے اولین الفاظ کس طرح سے وضع کیے گئے اور وہ کون سے اصول و ضوابط تھے جنہوں نے الفاظ کی تشکیل کے عمل میں رہنمائی کی؟“

لیکن فلاطو کے کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچ سکنے کی سب سے بڑی وجہ اس کی غیر ملکی زبانوں سے لاعلمی تھی جس کی بناء پر وہ اپنی زبان کا دوسری زبانوں سے مقابلہ و موازنہ کرنے سے قاصر رہا اور اس کے بغیر مجموعی طور پر زبان کی تخلیق کے پس پردہ کار فرما محرکات تک رسائی محال ہے۔ اس امر کا اظہار خود اس کے استاد اور پیشرو سقراط (۴۶۹ تا ۳۹۹ ق م) نے بھی کیا ہے۔ اس نے یونانی زبان میں دخیل غیر ملکی الفاظ کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ 'اہل یونان نے یہ الفاظ پڑوسی اقوام سے مستعار لیے ہیں' آگے چل کر مذکور ہے کہ :

''زبان کی اصل کا اندازہ لگانے کے لیے غیر ملکی الفاظ کی اس حقیقی صورت کا جائزہ لینا ضروری ہے جس طرح کہ وہ اپنے اصل وطن میں بولے جاتے ہیں لیکن اہل یونان وحشی پڑوسیوں کی زبان سے ناواقفیت کی بناء پر اس تحقیق و تدقیق سے قاصر ہیں۔''

یہ غیر ملکی زبانوں سے لاعلمی یا ان سے دلچسپی کی کمی اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ کلکتہ کے مشہور علمی مرکز ایشیاٹک سوسائٹی کے بانی مہانی سر ولیم جونز (Sir William Jones) (۱۷۴۶ تا ۱۷۹۴ء) نے سنسکرت زبان کا سراغ نہیں لگا لیا۔

روسو

اٹھارھویں صدی عیسوی میں یہ خیال زور پکڑ رہا تھا کہ زبان کی ابتداء کسی مافوق الفطرت طریقہ سے نہیں بلکہ عین فطری طریقہ سے شروع ہوئی ہے۔ اس پہلو میں مشہور انقلابی انشاء پرداز روسو (Rousseau) (۱۷۱۲ تا ۱۷۷۲ء) کی تصنیف 'زبانوں کی ابتداء' خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں بھی فلاطو کی 'کریٹیلس' کی طرح ایک تذبذب کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس میں ایک طرف تو زبان کے مافوق الفطرتی مآخذ کی تائید کی گئی ہے اور ساتھ ہی زبانوں کو کچھ قدرتی امور کا نتیجہ بتلایا گیا ہے مثلاً وہ ایک جگہ کہتا ہے :

''آدم نے فرمایا (یعنی چرندوں اور پرندوں کے نام لیے) بالکل بچا، آدم کو خود خدا نے سکھلایا تھا۔ . . . کوئی

اتنی کم ظرفی پر نہیں اتر سکتا کہ وہ ان صدیوں پرانی روایات کو محض قصہ کہانی کہہ کر جھٹلا دے۔“ لیکن کتاب کے خاتمہ پر چل کر خود ہی لکھتا ہے : ”میں موسیو ڈکلس (M. Duclos) کے اس بیان پر اپنے تاثرات کو ختم کرتا ہوں کہ یہ محققین کا کام ہے کہ وہ پوری جانچ پڑتال کے بعد باقاعدہ مثالیں دے کر بتلائیں کہ ہماری زبان کی ہیئت پر عوام کی قومی خصوصیات، طور طریقے اور مشاغل کس طرح سے اثر انداز ہوئے۔“

مسئلہ ارتقاء کا ظہور

اٹھارہویں صدی عیسوی کا سب سے اہم واقعہ نظریہ ارتقاء کا ظہور تھا۔ اس مسئلہ نے ہمارے تمام علوم و فنون بلکہ تمام انسانی تصورات کو جس حد تک متاثر کیا ہے ہمارے لیے اس کا صحیح صحیح احاطہ کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس سے قبل ہر ایک بات کی ابتداء محض ایک ایسے حادثہ کا نتیجہ سمجھی جاتی تھی جو ایک مافوق الفطرت قوت کے ایما پر ظہور میں آیا ہو۔ مثلاً زمین، چاند، سورج اور ستارے ایک دم خلا میں ظاہر ہو گئے اور انسان و دیگر جاندار آناً فاناً اس میں آباد ہو گئے۔ انسان نے دنیا میں وارد ہونے ہی کشتکاری اور پارچہ بافی شروع کر دی اور وہ شروع ہی سے بات چیت کرنے پر پوری طرح قادر تھا۔ ایسے ہی تصورات کا نتیجہ تھا کہ ہم ماضی کا صحیح طور پر جائزہ لینے سے قاصر رہے۔ حال کے وجود کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی اور مستقبل کو قسمت کے سہارے چھوڑ دیا جاتا تھا لیکن نظریہ ارتقاء کے ظہور میں آتے ہی انسان نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ یہ سب کچھ جو کہ ہم دیکھ رہے ہیں محض حادثوں اور کرشموں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کے پس منظر میں ایک ایسا مادی قانون جاری و ساری ہے کہ جس کی بدولت ہم غاروں کی زندگی سے بتدریج ترقی کرتے ہوئے اس موجودہ اشتراک باہمی کے ترقی یافتہ دور تک پہنچے ہیں۔ یہ معلوم ہوتے ہی انسان نے زندگی کے ہر ایک شعبے کو تحقیق و تفتیش کی آماجگاہ بنا لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جتنی ترقی انسان اپنی زندگی کے ہزاروں برسوں میں نہ کر سکا اس سے کہیں زیادہ ترقی

اس نے صرف ان دو صدیوں میں کر لی اور اب زندگی بجائے رینگنے کے
باد رفتاری سے آگے کی طرف رواں ہے اور انسان نے چاند ستاروں پر کمندیں
پھینکنا شروع کر دی ہیں۔ اب کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب کوئی نہ
کوئی نئی دریافت ظہور پذیر نہ ہوتی ہو یا کوئی انوکھی ایجاد عالم
وجود میں نہ آتی ہو۔

کانٹ اور گوٹے

ہمارا موضوع اگرچہ مسئلہ ارتقاء پر بحث کرنا نہیں ہے لیکن چونکہ
علم اللسان براہ راست نظریہ ارتقاء کا نتیجہ ہے اس لیے ہم اسے نظر انداز
نہیں کر سکتے۔ عام طور پر نظریہ ارتقاء کو الفریڈ والس (Alfred Walls)
اور چارلس ڈارون (Charles Darwin) کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے
لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس خیال کی ابتداء اس سے بہت پہلے ہو چکی تھی
جیسا کہ ارسمس ڈارون (Erasmus Darwin) (۱۷۳۱ تا ۱۸۰۲ء)
بوفان (Buffan) (۱۷۰۷ تا ۱۷۸۸ء) لی مارک (Lamarch) (۱۷۴۴ تا
۱۸۲۹ء) کانٹ، ہرڈر اور گوٹے کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔
خاص کر جرمنی میں تو اس نظریہ کو کافی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔
مشہور فلاسفر کانٹ (Kant) (۱۷۲۴ تا ۱۸۰۴ء) نے جو کہ شروع
میں ایک سائنسدان اور ماہر ریاضی تھا، اپنی سب سے پہلی تصنیف 'اجرام
فلکی کی حقیقت اور متعلقہ نظریات کی تاریخ' میں اس امر کا اظہار کیا
ہے کہ موجود عالم کائنات بعض قدرتی اصولوں کے تحت ایک بہت طویل
عرصے میں بتدریج ارتقاء کی موجودہ منزل پر پہنچا ہے۔ اس کتاب میں اس
نے ارتقاء کے متعلق جو نظریات پیش کیے ہیں ان میں انتخاب خصوصی، بقائے
اصلح، جہد للبقاء، ماحول کے اثرات اور ارثی خصوصیات کا بالکل واضح
الفاظ میں ذکر موجود ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ چارلس
ڈارون نے اس تصنیف سے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔

گوٹے (Goethe) (۱۷۴۹ تا ۱۸۳۲ء) اگرچہ عام طور پر صرف
ایک فلسفی شاعر کے نام سے مشہور ہے لیکن حقیقت میں اس کی زندگی
کا ایک بڑا حصہ سائنس کے مطالعہ اور تحقیقات میں صرف ہوا۔ وہ نظریہ
ارتقاء کا بڑا ہرجوش حامی تھا جیسا کہ 'فاؤسٹ' (Faust) میں روح ارضی

کے نغمہ سے ظاہر ہے۔ اگر شاعری اس کی دوسری خصوصیات پر حاوی نہ ہو جاتی تو وہ اپنی تحقیقات کی بناء پر ضرور ایک نامی سائنس دان کے طور پر یاد کیا جاتا۔

ہرڈر، لسانیات کا پیش رو

اگر ہم اس تاریخ کا پتہ لگانا چاہیں جب کہ زبان کے متعلق سائنسی تحقیقات کی بنیاد رکھی گئی تو وہ ۱۷۷۲ء ہے جس سال میں کہ جان کائفرائیڈ ہرڈر (Johann Gottfried Herder) (۱۷۴۴ تا ۱۸۰۳ء) کی مشہور تصنیف 'زبان کے ماخذ' شائع ہوئی۔

ہرڈر مشہور سائنس دان فلاسفر کانٹ کا شاگرد اور سائنس دان گوٹھے کا گہرا دوست تھا۔ گوٹھے سے پہلے پہل اس کی ملاقات ۱۷۷۰ء میں سٹرابرگ میں ہوئی اور آخر دوستی اس حد تک بڑھی کہ ۱۷۷۶ء میں ہرڈر مستقل طور پر گوٹھے کے پاس ہی وئیہار میں آکر قیام پزیر ہو گیا اور یہیں ۱۸۰۳ء میں وفات پائی۔ اب آپ ہی اندازہ لگائیں کہ سائنس، فلاسفی اور ادب میں سمونی ہوئی جرمنی کی فضا ہو اور اس پر کانٹ اور گوٹھے کی صحبت اور پھر ہرڈر کا جستجو بورا دل تو آپ کے علم و فضل کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس نے اپنی تحقیقات کی بناء پر عالم حیوانات میں طبعی ساخت کی یگانگت کے نظریہ کو اس کی تکمیل کی حد تک پہنچا دیا لیکن یہاں اس کے ارتقاء کے متعلق نظریات سے سروکار نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ لسانیات کی ترقی کے لیے اس نے کیا خدمات سرانجام دیں۔

لسانیات میں ہرڈر کو سب سے زیادہ اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے اس امر کو ثابت کیا کہ زبان کسی مافوق الفطرت ہستی کا عطیہ نہیں بلکہ انسان کی اپنی کوششوں اور جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ اس نے عہد نامہ عتیق میں دیے ہوئے عقیدہ پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ ہماری زبان اتنی نامکمل اور ناقص ہے کہ اسے قادر مطلق کی طرف منسوب کرنا اس کی شان اکملیت کی نفی کرنا ہے اس لیے صاف ظاہر ہے کہ زبان صرف انسان کی ناقص کوششوں کا نتیجہ ہے نہ کہ خدا کی ایجاد۔ لیکن جیسا کہ ظاہر ہے زبان کی تحقیق و تفتیش کے لیے

غیر ملکی زبانوں کے کافی سے زیادہ سرمایہ کا مہیا ہونا لازمی ہے جو کہ ۱۷۷۲ء تک جب کہ ہرڈر نے 'زبان کے ماخذ' نامی کتاب شائع کی میسر نہ تھا جس کی بناء پر ہرڈر کو اپنے مضمون میں لکھنا پڑا کہ 'ابھی تک غیر قوموں کی زبانوں کا مواد اتنا کم اور مشکوک ہے کہ اس سے صحیح معنوں میں تقابلی لسانیات کا وجود میں آنا ناممکن ہے۔' اسی کمی کا نتیجہ تھا کہ باوجود صلاحیت کے وہ حقیقت کی تہ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

افق مغرب پر سنسکرت کا طلوع

''سنسکرت بلا لحاظ اپنی قدامت کے ایک نہایت عمدہ ہیئت کی زبان ہے۔ یہ یونانی سے زیادہ تکمیل یافتہ اور لاطینی سے زیادہ جامع ہے اور ان دونوں کی نسبت لطیف اور شائستہ ہے لیکن پھر بھی ان دونوں زبانوں سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ افعال کے مخارج اور صرف و نحو کے لحاظ سے یہ اتنی زیادہ ملتی جلتی ہیں کہ اسے محض ایک اتفاق کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کوئی بھی محقق ان تینوں زبانوں کا بنظر غائر مطالعہ کرے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان تینوں زبانوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اگرچہ اب وہ سرچشمہ بذات خود معدوم ہو چکا ہے۔ نیز اس امر کے تسلیم کرنے کے لیے بھی کافی شواہد موجود ہیں کہ گاتھ قوم کی زبان اور کاٹی زبان بھی اسی سرچشمہ سے پھوٹی ہیں اور پھر قدیم فارسی کو بھی اسی رشتہ میں منسلک کیا جا سکتا ہے۔''

سرولیم جونز نے یہ تاریخی الفاظ ۲ ستمبر ۱۷۸۶ء کو ایشیاٹک سوسائٹی کالکتہ کے تیسرے سالانہ اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران ارشاد فرمائے۔ یہ ایک ایسی پرکشش آواز تھی کہ اس کی صدائے بازگشت یورپ کے کونے کونے میں گونج اٹھی اور جگہ جگہ سنسکرت کی تعلیم کے مراکز قائم ہو گئے جہاں اپنے وقت کے بہترین دماغوں نے اس کے درس و تدریس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں ایک

طرف صدیوں کی مردہ زبان از سر نو زندہ ہو گئی وہاں اس سے تقابلی لسانیات کی بنیادیں بھی استوار ہو گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دن سے لے کر آج تک سنسکرت اور لسانیات کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اب تک جتنے بھی قابل ذکر ماہرین لسانیات گزرے ہیں وہ قریباً سب کے سب سنسکرت زبان کے بھی ماہر تھے۔

سنسکرت کی دریافت کو اگر ایک اتفاقی حادثہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اس کی تلاش کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی بلکہ حالات کے دھارے نے خود بخود اسے مغربی شائقین علم کے سامنے لا پھینکا اور انہوں نے اس چمکتی ہوئی چیز کو اٹھا کر اپنے دامنوں میں ڈال لیا۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں فرانس اور برطانیہ کے درمیان ہندوستان کی جاں بلب لاش پر قبضہ جانے کے لیے زبردست رسہ کشی جاری تھی۔ اسی اثناء میں بہت سے فرانسیسی اور انگریز طالبان علم بھی جہد للبقاء کی غرض سے یا مہم بازی کے شوق کی وجہ سے فوجی یا غیر فوجی خدمات کے سلسلے میں ہندوستان میں وارد ہوئے۔ یہاں قدرتی طور پر ان کا سنسکرت سے تعارف ہوا۔ سب سے پہلے ایک فرانسیسی یسوعی (Jesuit) پادری نے ۱۷۶۷ء میں فرانس کے مرکزی تعلیمی ادارہ کو ایک یادداشت بھیجی جس میں ذکر تھا کہ لاطینی اور سنسکرت کے بہت سے الفاظ ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں لیکن ادارہ مذکور نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ اس یادداشت کو چالیس سال بعد پہلی بار اس وقت شائع کیا گیا جب یورپ میں سنسکرت کے متعلق کافی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔

تقابلی لسانیات کی بنیاد

یورپ کو سنسکرت سے روشناس کرانے کا سہرا در حقیقت سر ولیم جونز کے سر بندھتا ہے۔ اس نے آکسفورڈ میں اپنے طالب علمی کے زمانہ سے ہی مختلف زبانوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ ابھی چوبیس برس کا تھا تو اسے دس مختلف زبانوں پر عبور حاصل ہو چکا تھا جن میں یونانی، لاطینی، عبرانی، عربی اور فارسی بھی شامل تھیں۔ باوجود اتنا بڑا عالم ہونے کے اس نے اپنے ذریعہ معاش کے لیے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور ۱۷۸۳ء میں کلکتہ کی سپریم کورٹ کا جج مقرر ہو کر

ہندوستان آیا۔ یہاں اس نے سنسکرت زبان کو بڑے شوق سے سیکھنا شروع کر دیا۔ اس زبان میں اس کی دلچسپی یہاں تک بڑھی کہ دوسروں کو بھی سنسکرت کی تعلیم کا شوق دلانے کے لیے ایک اور ماہر سنسکرت سر چارلس ولکنز (Sir Charles Wilkins) (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۶ء) سے مل کر ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی بنیاد رکھی جو اپنے وقت میں مشرقی دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ تھا۔

اگرچہ سر ولیم جونز نے صاف صاف لفظوں میں آریائی گروہ کی بڑی بڑی زبانوں میں باہمی مماثلت اور ان کے ایک ہی ماخذ سے مشتق ہونے کا نظریہ پیش کر دیا تھا لیکن افسوس کہ اس کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ تفصیل طلب موضوع 'تشنہ' تکمیل ہی رہ گیا۔

فریڈرک شلیگل (Friedrich Schlegel) (۱۷۷۲ تا ۱۸۲۹ء) نے ۱۸۰۸ء میں ایک کتاب 'اہل ہند کی زبان اور حکمت' نامی شائع کی جس میں ولیم جونز کے تجویز کردہ خیال کے مطابق یورپی زبانوں کا سنسکرت سے تفصیلی موازنہ کیا گیا تھا۔ ان زبانوں کے الفاظ اور صرف و نحو کی مماثلت کے مطالعہ کے بعد اس خیال کی پرزور حمایت کی کہ سنسکرت اور یورپی زبانوں خاص کر یونانی، لاطینی اور جرمن کے مابین ایک گہرا رشتہ اور یک گونہ مطابقت موجود ہے۔ یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے سب سے پہلے 'تقابل لسانیات' کی اصطلاح وضع کی۔

جرمنی میں لسانیات کی نشو و نما

شلیگل کی مذکورہ کتاب سے متاثر ہونے والی ہستیوں میں سے باویریا کا ایک طالب علم فرانز بوپ (Franz Bopp) (۱۷۹۱ تا ۱۸۶۷ء) بھی تھا۔ اپنے شوق اور قابلیت کی بناء پر وہ حکومت باویریا سے وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ۱۸۱۲ء میں سنسکرت کے مطالعہ کے لیے پیرس پہنچا جہاں چار سال کے گہرے مطالعہ کے بعد اس نے 'فارسی اور یورپی زبانوں کا سنسکرت سے موازنہ' نامی کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں بوپ نے دلائل و براہین کی مدد سے اس امر کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا کہ سنسکرت فارسی اور مشہور یورپی زبانوں کا ماخذ کوئی ایک ہی زبان ہے جسے قدیم آریائی زبان کہا جا سکتا ہے۔

۱۸۲۲ء میں اسے برلن یونیورسٹی میں سنسکرت اور تقابلی صرف و نحو کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں اس کی پہلی کتاب کی گولڈن جوبلی

کے موقعہ پر اس کی خدمات کے اعتراف میں دنیا کے ہر حصے کے اہل علم حضرات کے چندہ سے برلن میں اس کے نام پر سنسکرت اور تقابلی صرف و نحو کی تعلیم کے لیے ایک بوپ ادارہ قائم کیا گیا اور یہی وہ ادارہ تھا کہ جس کی کوششوں سے لسانیات بھی دیگر صف اول کے سائنسی علوم میں شمار ہونے لگی۔ اس ادارے سے ایک طرف میکس مولر تعلیم پا کر نکلا اور برطانیہ میں لسانیات کے مطالعہ کی بنیاد ڈال دی دوسری طرف مولر کا ہم عصر اور امریکہ میں لسانیات کا پیش رو ولیم وہٹنے بھی اسی ادارہ کا فارغ التحصیل طالب علم تھا۔

مولر اور وہٹنے

اینگلو جرمن فلاسفر اور ماہر لسانیات میکس مولر (Max Muller) (۱۸۲۲ تا ۱۹۰۰ء) اور امریکن ماہر لسانیات ولیم وہٹنے (William Whitney) (۱۸۲۷ تا ۱۸۹۳ء) دونوں کو فرانز بوپ کے شاگرد ہونے کا فخر حاصل تھا۔ پچھلے ستر سالوں میں لسانیات کے بارے میں جو کچھ لکھا جا چکا تھا انہوں نے اسے جمع کیا اور گہری چھان بین کے بعد جو نتائج اخذ کیے انہیں مجموعی طور پر عوام کے سامنے پیش کیا۔ خوش قسمتی سے ان دونوں کو اظہار خیال پر پورا پورا عبور حاصل تھا اور ان کا طرز تحریر بھی اتنا شگفتہ تھا کہ انہوں نے خالص سائنس جیسے خشک موضوع کو بھی ناول جیسی دلکشی عطا کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لسانیات کے متعلق مضامین عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ اس طرح سے میدان میں اس نئی نئی آئی ہوئی سائنس کی کافی سے زیادہ ہمت افزائی ہوئی۔ خاص کر لسانیات کے بارے میں تحقیقات کے نتیجے میں انسانی تاریخ اور اس کے ارتقاء کے متعلق کئی ایک راز ہائے سر بستہ سے لاعلمی کے دبیز پردے اٹھ جانے پر اس نئی سائنس کی وقعت میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا۔

میکس مولر جرمنی میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ لیپزیگ (Liepzig) یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں اس نے فرانز بوپ سے تقابلی لسانیات اور شیلنگ (Schelling) سے فلاسفی کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ ۱۸۵۰ء میں آکسفورڈ آگیا اور اپنی باقی ماندہ زندگی یہیں درس و تدریس اور

تصنیف و تالیف میں بسر کردی - لسانیات کے متعلق اس کا نظریہ اور نصب العین وہی تھا جو کہ چارلس ڈارون کا حیاتیات کے متعلق تھا لیکن ڈارون کو ارضیات اور حیاتیات کے متعلق نئی نئی دریافتوں سے کافی سے زیادہ مدد ملی اور مولر کو اس قسم کی کوئی آسانی فراہم نہ تھی، اس لیے اس کی تصنیفات اور تالیفات میں وہ ٹھوس پن موجود نہیں جو کہ ڈارون کا حصہ ہے -

امریکی ماہر لسانیات ولیم وہٹنر ییل (Yale) یونیورسٹی سے سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۵۰ء میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے برلن یونیورسٹی میں داخل ہوا جب کہ میکس مولر اپنی تعلیم ختم کر کے آکسفورڈ کو روانہ ہو رہا تھا - یہاں تین سال کے مطالعہ کے بعد وہ واپس امریکہ پہنچ گیا - یہاں اسے ییل یونیورسٹی میں سنسکرت کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا - لسانیات میں نہایت اہم تحقیقات کی بناء پر ۱۸۷۰ء میں اسے بوپ ادارہ کی طرف سے سب سے اول انعام ملا - اس کی تصنیفات میں سے دو کتابوں 'زبان اور اس کا مطالعہ' اور 'زبان کی پیدائش اور اس کی نشو و نما' کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اپنی مقبولیت و افادی حیثیت کی بناء پر دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے -

ڈارون کی آمد آمد

ماہر علم الانسانیات جولین ہکسلی (Julian Huxley) نے چارلس ڈارون کی پچاسویں برسی پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ :

”چارلس ڈارون ان معدودے چند ہستیوں میں سے ایک ہے جنہوں نے انسانی خیالات کے دھارے کو ایک نئے زاویے کی طرف موڑ دیا اور انسانی زندگی کے قریباً تمام شعبوں میں ایک نیا رنگ پیدا کر دیا۔“

ڈارون کے ایک پرجوش حامی ڈینس ہرڈ (Dennis Hird) کا قول

ہے کہ :

”اس بطل جلیل کے متعلق بغیر کسی مبالغہ آمیزی کے دعوے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے انسانی نظریات کے مرکز ثقل کو اپنی جگہ سے ہلا ڈالا اور شہنشاہیت کو اس کی بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔“

ڈارون کے نظریات کا اثر اتنا ہمہ گیر اور وسیع ہے کہ اس کا احاطہ کرنا تو ایک طرف اس کا پوری طرح جائزہ لینا بھی قریباً ناممکنات میں سے ہے۔ ایک طرف اس کے جہد للبقا اور بقائے اصح کے نظریات کی آڑ لے کر مسولینی (Mussolini) نے کہا کہ:

”اٹلی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ آگے پھیلنے کے لیے جگہ حاصل کیے بغیر زندہ رہ سکے۔“

بٹلر نے اسی بناء پر کہا تھا کہ:

”جرمنی کی زندگی کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی قدیم آریائی مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی کو اختیار کرنے اور اپنی نسلی برتری کو از سرنو دنیا پر ثابت کر دے۔“

حقیقت تو یہ ہے کہ پچھلی دونوں بڑی جنگوں کے پس منظر میں یہی نظریات کارفرما نظر آتے ہیں۔ آج بھی مغربی اقوام بقائے اصح کے نظریہ کی آڑ لے کر مشرقی دنیا کے خلاف ایک خفیہ محاذ قائم کیے ہوئے ہیں اور اس کے ثبوت کے لیے کوریا، ملایا، ویت نام، فلسطین، جنوبی افریقہ، کینیا اور شمالی افریقہ کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈال لینا کافی ہے۔

جہد للبقا اور بقائے اصح کا ایک روشن بلکہ تابناک پہلو بھی ہے اور وہ عوامی قوتوں میں جہد للحیات کے احساس کا پیدا ہونا ہے۔ اگر فلسفہ اشتراکیت کے بانی کارل مارکس (Karl Marx) اور فریڈرک اینجلز (Friedrich Engels) کے نظریات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو وہ کافی حد تک ڈارون کے نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ خاص کر دنیا کی جتنی بھی کمزور اور پسماندہ قومیں تھیں، جب ان کے ذہنوں میں یہ نظریہ ٹکرایا کہ:

”دنیا میں زندہ وہی رہ سکتا ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت

موجود ہے۔“

تو انہوں نے اس زندہ رہنے کی صلاحیت کی منزل پر پہنچنے کی سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی غلامی کی زنجیریں پکے بعد دیگرے ٹوٹی چلی گئیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

حیوان ناطق اور حیوان مطلق

ڈارون کے تعارف کے بعد ہم اپنے حقیقی موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ میکس مولر نے اپنی مشہور تصنیف 'علم اللسان' میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ:

”انسان اور حیوان کے درمیان سب سے بڑی حد فاصل زبان ہے۔“

ولیم وہٹن نے اپنی کتاب 'زبان کی پیدائش اور اس کی نشو و نما' میں اس نظریہ کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”ہی نوع انسان کا ہر گروہ اپنی ایک مشترکہ زبان کا حامل ہے لیکن یہ امر ہمیں باقی ذی حیات دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آتا اور ان میں سے اکثر جن آوازوں کو مختلف تاثرات کے اظہار کے لیے استعمال بھی کرتے ہیں انہیں ہرگز زبان کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔“

لہکن ڈارون جسے کہ امیبا (Amoeba) سے لے کر انسان تک کائنات حیات کی تمام کڑیوں کے پس منظر میں صرف ایک ہی قانون جاری و ساری نظر آتا تھا، اس تفریق کے نظریہ کو کیسے خاموشی سے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'انسان کا سلسلہ نسب' (Descent of man) میں اس نظریہ کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ:

”عرصہ سے انسان اور حیوان کے درمیان سب سے بڑا فرق

زبان کو قرار دیا جاتا رہا ہے لیکن آرک بشپ وہیٹلی

(Arch Bishop Whately) نے فرمایا ہے کہ 'انسان ہی

صرف ایک ایسا جاندار نہیں جو کہ زبان کو اپنی کیفیات باطنی

کے اظہار کے لیے استعمال کرنے اور اس قسم کے اظہارات کو

سمجھنے پر قادر ہے۔“

پھر اس نے روز مرہ کے مشاہدہ سے مثالیں دے کر واضح کیا کہ کس طرح سے جانور اپنے تاثرات کے اظہار کے لیے مختلف قسم کی آوازوں کو کام میں لاتے ہیں اور اپنی نوع کے جانوروں کی آوازوں کو باسانی سمجھ لیتے ہیں کہ آیا یہ خطرے کا الارم ہے یا کھانے کی دعوت۔ ڈارون نے کہا کہ انسانی زبان اور حیوانوں کے بولنے میں جو فرق ہے وہ کوئی نوعی حیثیت کا نہیں بلکہ یہ فرق صرف درجہ کا ہے جو کہ محض ذہنی نشو و نما کے درجہ پر انحصار رکھتا ہے۔

مولر اور اس کے دوسرے ہم خیال ماہرین لسانیات نے ڈارون کے اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ انسان کی بالکل واضح زبان اس کی قوت متمیزہ کا مکمل ثبوت ہے اور یہ قوت انسان کو باقی جانوروں کے زمرہ سے بالکل الگ لا کھڑا کرتی ہے۔ اس کے جواب میں ڈارون اور اس کے حواریوں نے کہا کہ نہیں صرف انسان ہی نہیں بلکہ دیگر جانور بھی قوت متمیزہ کے حامل ہیں اور اپنے اس نظریہ کی حمایت میں انہوں نے حیوانات کی روزمرہ کی زندگی سے ناقابل تردید حقائق کا ایک بڑا بھاری مجموعہ سامنے لا کر رکھ دیا جو کہ رائے عامہ کو سیلاب کی طرح اپنے ساتھ بہا کر لے گیا اور مخالفت کی آواز عوام کی صدائے تحسین و آفرین کے شور میں گم ہو کر رہ گئی۔ آج باوجود اس کے کہ ڈارون کا بڑے سے بڑا حامی بھی انسانی زبان اور حیوانی آوازوں میں ایک واضح فرق محسوس کرتا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ اس کے بڑے سے بڑے مخالف کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ اس کے پیش کیے ہوئے حقائق کی تردید کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم 'چیونٹیوں کی زبان' اور 'مکھیوں کی زبان' قسم کی اصطلاحیں بے چوں و چرا قبول کر لیتے ہیں۔

اشاراتی زبان

لسانیات کے متعلق تحقیق و تدقیق کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان تمام کاوشوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، اس لیے ہم زیادہ تر اس کی مرکزی رو کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں اور اس نے جو راستہ اختیار کیا یا جس شکل و صورت میں یہ ڈھلتی رہی صرف اسی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے اور وہ ندی نالی جو وقتاً فوقتاً اس میں آ کر ملتے رہے یا پھوٹتے رہے ہماری بحث سے خارج ہی رہے ہیں۔ لیکن یہ مضمون

لسانیات کی ایک خاص شاخ کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں کہہ سکتا اور وہ شاخ یا مسلک ان ماہرین لسانیات سے متعلق ہے جن کا دعویٰ ہے کہ زبان کی ابتداء اشاروں سے شروع ہوئی ہے۔ اس خیال کا بانی موسیو ڈی کیملپان (M. D. Camplon) (فرانس) شہر کیا جاتا ہے۔ اس نے ۱۷۹۲ء میں اپنی تحقیقات کے نتائج 'زبان کے میکانکی پہلو' کے نام سے شائع کیے۔ اس میں اس نے بتایا کہ انسانی زبان کا اگر گہرے طور پر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک دوسرے پر اشاروں کے ذریعے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا طریقہ ہے اگرچہ اس میں بجائے ہاتھوں کے ہم ہونٹ، زبان اور منہ کے دیگر اعضاء کو کام میں لاتے ہیں۔ اسی مسلک کے ایک اور رہنما ڈاکٹر رائے (Dr. Ray) (ہونولولو) نے ۱۸۶۲ء میں ۱۴۰۰ الفاظ کی جانچ پڑتال کے بعد ایک کتاب 'پالی نیشیا کی زبان' کے نام سے شائع کی جس میں اس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ بولنے والے الفاظ کی قدیم ترین صورت محض کسی سرزد ہونے والے فعل کا چربہ تھے جس میں ہونٹ، زبان اور منہ کے ذریعے کسی شے یا فعل کی نقل اتارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ قدیم ترین زبان صرف ایک رکنی الفاظ پر مشتمل تھی جن سے قوت، شکل یا حرکت کا اظہار کیا جاتا تھا۔

الفریڈ رسل والس

ڈاکٹر رائے کے بعد جس ہستی نے اس پہلو میں سب سے اہم خدمات سرانجام دیں وہ چارلس ڈارون کا مد مقابل الفریڈ رسل والس (Alfred Russel Willis) تھا۔ اس نے ۱۸۹۵ء میں ایک رسالہ میں انگریزی زبان کے متعلق ایک مضمون میں تحریر کیا کہ :

”یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ زبان، ہونٹ اور جبڑوں کے اشاروں کا الفاظ کی بناوٹ سے گہرا تعلق ہے یعنی ان کے اشاروں یا حرکات کے ساتھ جو آواز منہ سے پیدا ہوتی ہے اسے اس فعل یا شے کے ساتھ منسوب کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم اپ (up) کہتے ہیں تو ہمارا جبڑا اوپر کی طرف حرکت کرتا ہے اور جب ہم ڈاؤن (down) کہتے ہیں تو جبڑا نیچے کی طرف آتا ہے اور حقیقت میں یہی اشاراتی پہلو ہی

سب سے بڑا عنصر ہے جس نے شروع میں انسانی زبان کی تخلیق میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔“

الیگزینڈر جاہنسن

زبان کے اس اشاراتی مأخذ کے نظریہ کو موجودہ سائنس کی صف میں لانے کا سہرا صحیح معنوں میں آئسلینڈ یونیورسٹی کے سابق چانسلر پروفیسر الیگزینڈر جاہنسن (Alexander Johannesson) کے سر بندھتا ہے۔ اس نے ۱۹۴۳ء میں ماہرین لسانیات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

”میں ذاتی طور پر آئسلینڈ کی زبان کے بیس ہزار اور آریائی مأخذ کی زبانوں کے قریباً ڈھائی ہزار الفاظ کے گہرے مطالعہ اور تحقیق و تفتیش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان میں سے ایک بڑے حصہ کا مأخذ منہ کے وہ اشارے ہیں جن میں کہ کوئی فعل سر انجام دیتے وقت ہاتھ کی حرکات و سکنات کی نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہوتی ہے۔“

اس نظریے کی وضاحت کے لیے آپ اردو کے لفظ ’کاٹ‘ کی مثال لیجیے:

جب ہم اس کے پہلے حصے ’کا‘ کی آواز نکالتے ہیں تو جبراً اوپر کی طرف حرکت کرتا ہے اور ’ٹ‘ کی آواز کے ساتھ نیچے گرتا ہے جیسے کہ کلمہاڑے کو ہوا میں اچھالا اور پھر کھٹ سے درخت کے تنے پر دے مارا۔

یہ ہے لسانیات کی چار ہزار سالہ تاریخ کا مختصر سا خاکہ اگرچہ ابھی تک ہم اس منزل پر نہیں پہنچ سکے جب کہ ہم پورے وثوق سے زبان کی ابتداء کے متعلق کوئی دو ٹوک فیصلہ دے سکیں لیکن مختلف حلقوں میں اس بارے میں جو کوششیں جاری ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مطلوبہ منزل اب کچھ دور نہیں۔

زبان کے میکانیکی پہلو

ٹن ... ! ٹن ... !! ٹن ... !!! بگو چہرہ اسی نے سکول کی گھنٹی بجائی ، جماعت میں بیٹھے ہوئے ننھے منے بچوں نے کان کھڑے کیے ، ان کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور وہ ماسٹر جی کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے ۔ ماسٹر جی نے اپنی چھڑی الہاری میں رکھی اور لڑکوں سے یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے کہ دس سے پندرہ تک سوال گھر سے نکال کر لانا ۔ ماسٹر جی کے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی لڑکوں نے بستے بغل میں دبائے اور ہو ... ! ہو ... !! کرتے ہوئے کمرے سے باہر کی طرف بھاگے ۔ ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ پہلے وہ باہر نکلے ۔

اس 'ٹن ٹن' کی آواز میں ایک پیغام پوشیدہ تھا جو کہ گھنٹی کے ارتعاش سے پیدا ہوا اور فضا میں لہروں کی شکل میں سفر طے کرتا ہوا کان کے پردوں سے ٹکرایا ۔ یہاں سے اعصابی ریشوں کے ذریعے دماغ میں پہنچا جہاں دماغی خلیوں نے اس ٹن ٹن کے سگنل کو چھٹی کے مفہوم میں سمجھ لیا ۔

انسانی آواز اور اس ٹن ٹن میں بظاہر کوئی فرق نہیں ۔ دونوں آوازیں ایک ہی قانون فطرت کے تحت پیدا ہوتی ہیں ۔ ایک ہی طرز سے فضا میں مرتعش لہروں کی صورت میں سفر کرتی ہیں اور ایک ہی طرح سے انسانی اعضائے سماعت کو متاثر کرتی ہیں ۔ ان کے ساتھ کسی مفہوم کے وابستہ ہونے کے لیے پہلے سے باہمی ربط کے ذریعے ایک طے شدہ فیصلہ موجود ہونا لازمی ہے ۔ مثال کے طور پر شام کے وقت تین گھنٹیوں کا بجنا یا ایک لمبی سیٹی کا لگنا بھی اسی طرح سے چھٹی کا مفہوم دے دیتا ہے جس طرح سے کہ خود چھٹی کا لفظ کیونکہ جس طرح سے چھٹی کے لفظ کے معنی آپس میں پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں ایسے ہی گھنٹی یا سیٹی کے بارے میں بھی طے کر لیا جاتا ہے ۔

زبان کیا ہے ؟

اگر ایک عام انسان سے یہ سوال کیا جائے کہ زبان کیا ہے تو وہ بلا جھجک جواب دے گا کہ :

”جناب! جس واسطے سے ہم دوسروں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں وہ زبان کہلاتی ہے۔“

اگر یہی سوال آپ کسی انشاء پرداز سے کر دیں تو وہ بنا سنوار کر جواب دے گا کہ :

”حضرت! زبان ایک ایسا مجموعہ الفاظ ہے جس میں ایک خاص ترتیب جاری و ساری ہو اور اس سے کوئی خاص مطلب اخذ ہوتا ہو۔“

لیکن ماہرین کے نزدیک اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں ہے۔ اس بارے میں کئی ایک متضاد نظریات پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ :

”زبان ایک ایسے صوتی سلسلے کا نام ہے جو کہ انسان کے اعضاء نطقی کے ذریعے ظہور میں آتا ہے اور اعضاء سماعی کے ذریعے سماعت پذیر ہوتا ہے۔“
ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ :

”زبان کا حقیقی مقصد صرف اظہار مطلب ہے۔ اس کے لیے آواز کا ہونا کوئی ضروری شے نہیں بلکہ چہرے کے تاثرات اور اشاروں کے ذریعے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ یہ صوتی پہلو تو زبان کا محض ایک ثانوی جز ہے۔“

اس مؤخر الذکر گروہ کے ایک انتہا پسند حامی مسٹر سیٹورٹ وانٹ (E. H. Sturte Vant) نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ :

”چونکہ حقیقی جذبات اور احساسات کا اظہار فطری اشاروں ، چہرے کے تاثرات اور موقع محل کے مطابق حلق سے خود بخود پیدا ہونے والی آوازوں (اوہ ، آہ وغیرہ) کے ذریعے بے ساختہ طور پر سامنے آجاتا ہے لیکن گندم نما جو فروشانہ ذہنیت

رکھنے والے انسان نے محض دوسروں کو دھوکا اور فریب دینے کے لیے زبان کے صوتی پہلو کی ایجاد کر لی تاکہ اس طرح حقیقی احساسات کو آسانی سے چھپایا جا سکے۔“

بہر حال زبان کا صوتی پہلو گو انسان کی ریاکاری کا نتیجہ ہی کیوں نہ ہو لیکن یہی انسان کی معراج ترقی کا زینہ بھی ثابت ہوا ہے۔ یہ الفاظ کی اکائیاں ہی تو ہیں کہ جس صورت میں ہم اپنے تجربات اور احساسات کو اپنے دماغ کی گہرائیوں میں محفوظ رکھتے ہیں اور بوقت ضرورت کام میں لاتے ہیں۔ انہی الفاظ کے ذریعے ہم اپنے تجربات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ تحریر بھی حقیقت میں انہی الفاظ کو ظاہر کرنے کا ایک دوسرا طریقہ ہے۔ اسی ذریعے سے ہم آج بھی سقراط، فلاطو اور ارسطو کے مکالمات سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں وگرنہ ان کے چہروں کے تاثرات اور باتوں کے اشارے صدہا سال قبل ان کے ساتھ ہی ختم ہو چکے ہیں۔

نظریہ ارتقاء کے بانی چارلس ڈارون نے زبان کے اشاراتی پہلو کے ہمہ گیر حیثیت اختیار نہ کر سکنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”اشاراتی زبان کے لیے باتوں کا استعمال ضروری ہے جہاں کہ صوتی زبان کی صورت میں باتوں کو دوسرے کاموں کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اشاراتی زبان کے لیے روشنی اور ایک دوسرے کے مد مقابل ہونا لازمی ہے۔ اس کے برعکس صوتی زبان کو اندھیرے اور دیوار وغیرہ کی اوٹ کی صورت میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ آج جب بھی زبان کی ابتداء کے بارے میں بحث کی جاتی ہے تو اس کی شروعات ہمیشہ قوت گویائی اور قوت سہامت کے جائزہ سے کی جاتی ہے۔ فلاسفر جان ڈیوی (John Dewy) نے کہا ہے کہ :

”زبان کے وجود کا دار و مدار صرف بولنے والے پر ہی نہیں بلکہ سننے والے پر بھی منحصر ہے۔“

زبان کا تجزیہ

ہم باتیں کیوں کر کرتے ہیں؟ سب سے پہلے انسانی دماغ کے ایک

مخصوص حصے میں ایک قسم کا بیجان سا پیدا ہوتا ہے۔ بعض محققین اس بیجان کو منفیہ برقی (Electronic) مہیجات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس پہلو میں ابھی بہت کچھ تحقیق کرنا باقی ہے۔ اس بیجان سے خاص قسم کی برقی روئیں پیدا ہو جاتی ہیں جو کہ اعصابی ریشوں کے ذریعے قوت گویائی کے اعضاء (پھیپھڑا، نرخرہ، منہ، زبان، جبڑے اور ہونٹ وغیرہ) پر اثر انداز ہو کر ان میں مطلوبہ حرکات کا باعث بنتی ہیں۔ ان اعضاء کی مختلف حرکات کے نتیجے میں فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے اور شش جہت میں ایک قسم کی لہروں کی شکل میں پھیل جاتا ہے۔ یہی مرتعش لہریں مختلف آوازوں کے تسلسل کی شکل اختیار کر کے الفاظ کو جنم دیتی ہیں۔ لیکن یہ آواز کہاں پیدا ہوئی اور الفاظ نے کہاں جنم لیا؟ یہ مرتعش لہریں بذات خود کچھ شے نہیں جب تک کہ یہ کسی انسان کے اعضاء سمعی کو متاثر نہ کریں۔ کیونکہ جب یہ لہریں انسانی کان کے پردوں سے ٹکراتی ہیں تو ان پردوں میں بھی ایک مخصوص ارتعاش پیدا کر دیتی ہیں۔ یہی ارتعاش آخر میں برقی روؤں کی شکل اختیار کر کے سننے والے کے دماغ میں ایک خاص قسم کا بیجان پیدا کر دیتا ہے۔ یہی بیجان بالآخر آوازوں کے تسلسل کی شکل میں انسانی فہم کے پردے پر الفاظ کی صورت میں جلوہ گر ہو جاتا ہے، بس ایسے ہی کہ جیسے سینا کے سفید پردہ پر صرف روشنی اور سائے کی سرعت سے بدلتی ہوئی حالتیں لاجوہ متحرک اجسام کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

غرضیکہ لسانیات کا مطالعہ ہمیں علم الحیات کی حدوں سے نکال کر نفسیات کے گوشوں کو چھوتا ہوا علم الطبیعیات کے میدان میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے اور ہم یہ محسوس تک نہیں کر پاتے کہ نفسیات کی حدیں کہاں ختم ہوئیں اور علم الطبیعیات کس مقام سے ساتھ ہو لیا، نہ ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آیا علم الحیات ان دونوں قسم کے عناصر پر حاوی ہے یا ان دونوں کے ملاپ سے حیاتیاتی پہلو ظہور پذیر ہوتا ہے۔ پھر بعض نظریات کی رو سے انسانی حسیات کے دماغ تک پہنچنے اور وہاں اثر پذیر ہو کر مفہوم کی شکل اختیار کرنے کے اثناء میں انسانی نظام اعصابی میں خاص قسم کی کیمیاوی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں جو کہ ہمیں علم الکیمیا کے مطالعے کی دعوت دیتی ہیں لیکن زیر بحث موضوع میں ان

پیچیدہ مسائل کی بھول بھلیوں کی عقدہ کشائی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہم یہاں مختصر طور پر صرف زبان کے طبیعیاتی پہلو کا جائزہ لینے پر ہی اکتفاء کریں گے۔

آواز اور زبان

اگر زبان کا مقصد صرف اظہار مطلب ہی لیا جائے تو اس کے لیے ہم صوتی اور غیر صوتی^۱ دونوں پہلو استعمال کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ جہاں تک صوتی پہلو کا تعلق ہے اس میں گو انسانی آواز کو ایک حد تک فوقیت ضرور حاصل ہے لیکن یہ کوئی استثنائی حیثیت کی حامل نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں: سکول کی گھنٹی صبح سے لے کر شام تک کئی ایک پیغامات نشر کرتی رہتی ہے۔ صبح حاضری کی گھنٹی، سکول لگنے اور تفریح کی گھنٹی پھر آخر میں چھٹی کی گھنٹی۔ علاوہ ازیں سکول کے مختلف اوقات میں یہی گھنٹیاں حساب، انگریزی، اردو، فارسی اور تاریخ وغیرہ کے پیغامات لے کر آتی ہیں اور ان کے ساتھ ہی پنڈت سری نواس، مولوی سردار عالم اور ماسٹر سادھو سنگھ کے گھنٹوں کے تصورات بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ افریقہ کے حبشی صرف ڈھول کی مختلف تالوں کے ذریعے

۱۔ زبان کے غیر صوتی پہلو: تتلیوں کا غیر محسوس قسم کی بو کے ذریعے کوسوں دور واقع اپنے محبوب کو محبت کا پیغام پہنچانا۔ چیونٹیوں کا اپنے سینگ نما بالوں کے ذریعے ایک دوسرے سے گفتگو (?) کرنا۔ شہد کی مکھیوں کا رس کی سمت اور فاصلہ بتلانے کے لیے زبان رقص سے کام لینا۔ پرندوں کا اپنے محبوب کو اپنی طرف رجوع کرنے کے لیے رقص کناں ہو جانا۔ بلی کا اپنے آقا کو دیکھ کر مجسم انکسار کی صورت اختیار کر لینا اور کتے کا دشمن کو دیکھتے ہی تن کر کھڑے ہو جانا۔ اسی طرح انسان کا بعض موقعوں پر اظہار مطلب کے لیے محض اشاروں اور کنایوں سے کام لینا اور بعض تاثرات کا فطری طور پر خود بخود ظہور میں آجانا جیسے کہ آنکھوں کا خوشی سے چمک اٹھنا یا مایوسی اور غم سے ان میں مردنی چھا جانا، چہرے کا خوشی سے دمک اٹھنا، غم سے اتر جانا، ڈر سے زرد پڑ جانا اور غصے کی حالت میں سرخ ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔

آن واحد میں سینکڑوں میلوں تک طرح طرح کے پیغامات پہنچا دیتے ہیں۔ تار گھر میں تار برقی، ایجد کی گٹ گر، گر گر گٹ کو بھی یہی شرف حاصل ہے۔

جھینگر جیسا ننھا سا کیڑا اپنی ٹانگوں کی رگڑ سے ہی محبت کے پیغامات نشر کرتا رہتا ہے۔ مرغی کی کٹ کٹ کی تیز آواز کو سنتے ہی ننھے منے چوزے چیل کے حملے سے بچنے کے لیے دوڑ کر فوراً ہی ادھر ادھر جا چھپتے ہیں۔ کوا کوئی کھانے کی چیز دیکھ کر کائیں کائیں کا نعرہ بلند کرتا ہے اور اس کی سیاہ پوش برادری ہر چہار طرف سے اڑتی ہوئی چلی آتی ہے۔ پرندوں کے محبت کے نغموں، خطرے کے الارم اور خوراک کی دعوت کی صدا میں واضح فرق موجود ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مرغی جب خطرے کا الارم دیتی ہے تو چوزے جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں لیکن جب یہی مرغی کھانے والی چیز کو دیکھ کر مخصوص انداز میں کٹ کٹ کرتی ہے تو تمام چوزے بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ بندر کی ایک قسم گبن (Gibbon) کی آوازوں کے تجزیہ سے معلوم ہوا ہے کہ وہ موقعہ محل کے مطابق نو مختلف قسم کی بامعنی آوازیں نکال سکتا ہے پہلی آواز 'آؤ ہم پھلوں کی تلاش کو چاہیں'، دوسری آواز 'میری بیوی کے نزدیک مت آؤ' وغیرہ وغیرہ۔

خود انسان بھی اکثر صرف تالی بجا کر اپنی پسندیدگی یا خوشنودی کا اظہار کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ محض زبان کے مختلف چٹخاروں کی مدد سے ہی نفرت، افسوس، ناپسندیدگی، نفی اور مذاق کا اظہار کر دیتا ہے۔ گڈریے اور گلہ بان بھیڑ بکریوں اور گائے بھینسوں کی اکثر چٹخاروں کی مدد سے ہی مختلف طرح سے رہنائی کرتے ہیں۔ چٹکی بجانے سے مراد 'بس فوراً ہی' ہے۔ بہت زیادہ غصہ کی حالت میں انسان اکثر بغیر کچھ بات کیے صرف غزاتا اور چنگھاڑتا ہی ہے۔ منہ سے سیٹی بجا کر وہ کئی ایک پیغامات کسی مخصوص انسان تک پہنچا دیتا ہے لیکن ان سب باتوں کا باتیں کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔

اشارہ ہائے لب

انسانی زبان جو کہ بامعنی الفاظ پر مشتمل ہے شروع میں صرف بے ربط آوازوں یا پکر کنی الفاظ تک محدود تھی۔ ہونو لولو یونیورسٹی

کے ڈاکٹر جے رائے (J. Rae) نے ۱۸۶۲ء میں اپنی تحقیقات کے نتیجے میں اس امر کا دعویٰ کیا کہ 'بولے جانے والے الفاظ کی قدیم ترین صورت محض کسی سرزد ہونے والے فعل کا چربہ ہوتی تھی جس میں ہونٹ، زبان اور منہ کے ذریعے کسی شے یا فعل کی نقل اتارنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ قدیم ترین زبان صرف یک رکنی الفاظ پر مشتمل تھی جن سے قوت، شکل یا حرکت کا اظہار ہوتا تھا۔' اسی طرح پروفیسر الیگزینڈر جاہنسن (Professor Alexander Johannesson) چانسلر آئس لینڈ یونیورسٹی نے ۱۹۴۳ء میں ماہرین لسانیات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا 'میں گہرے مطالعے اور تحقیق و تفتیش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمارے سرمایہ الفاظ کے ایک بڑے حصے کا ماخذ منہ کے وہ اشارے ہیں جن میں کوئی فعل سر انجام دیتے وقت ہاتھ کی حرکات و سکنات کی نقل اتارنے کی کوشش کی گئی ہوتی ہے۔' خود بہاری زبان بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثناء نہیں ہے۔ اگر ہم غور سے مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ بہاری زبان میں بھی ایسے الفاظ کا ایک بڑا حصہ موجود ہے جو کہ ہونٹ اور زبان کے ذریعے ہاتھ کی حرکات یا دوسرے افعال کی نقل اتارنے کی کوشش کے نتیجہ میں فطرتی طور پر خود بخود تشکیل پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً جب آپ کسی دور کھڑے ہوئے انسان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے مخاطب کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنے کے لیے نرخرہ سے قدرتی آواز پیدا کرتے ہیں تو اس اشارہ میں ہاتھوں کا ساتھ دیتے ہوئے ہونٹوں سے جو آواز باہر نکاتی ہے وہ فطرتی طور پر 'وہ' کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح 'تو' کہتے وقت ہونٹ اشارہ کرتی ہوئی انگلی کی نقل میں لمبوتری تہوتہنی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر زبان بھی اس اشارہ میں ان کا ساتھ دیتی ہے۔ اس طرح منہ سے قدرتی طور پر نکلنے والی آواز 'تو' کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ 'یہ' کا بھی یہی حال ہے کہ زبان، نیچے کا جبڑا اور اوپر والے ہونٹ نیچے سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 'میں' میں بھی نیچے کا جبڑا اپنی ہی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے (یعنی اگر آپ نے منہ سے بات نہ کرنی ہوتی اور کسی کے استفسار پر یہ بتانا مقصود ہوتا کہ یہ کام آپ نے کیا ہے تو آپ بعینہ سر سے اسی طرح کا اشارہ کرتے جیسا 'میں' کہتے وقت کرتے ہیں) ایسے ہی بعض افعال کی صورت ہے۔ مثال کے طور پر لفظ 'کاٹ' کو لیجیے۔

جب ہم اس کے پہلے حصے 'ک' کی آواز نکالتے ہیں تو جبڑا اوپر کی طرف حرکت کرتا ہے۔ 'ٹ' کی آواز کے ساتھ نیچے گرتا ہے اور زبان تالو کے اگلے حصے سے آٹکراتی ہے جیسے کہ کلمہ ہاڑے کو پہلے ہوا میں اچھالا اور پھر کھٹ سے درخت کے تنے پر دے مارا۔

یہ ایک علاحدہ موضوع ہے اس لیے اسے کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ فی الحال ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پتھروں کے لڑھکنے، پرندوں کے چمچہانے اور انسانی قوت گویائی میں جو فرق ہے وہ صرف اس قوت کا ہے جو کہ ان آوازوں کے پس پردہ کار فرما ہے۔ ایک طرف کمان کی وہ ڈوری ہے جس کی لرزش باوجود فضا میں ارتعاش پیدا کرنے کے محض ایک ایسی آواز کی تخلیق کرتی ہے جس کا کوئی خاص مقصد نہیں جس میں کوئی گہرائی نہیں۔ بس ایک اندھی قوت کا مظاہرہ ہے جس نے کہ تیر چلانے کے لیے تانت کو کھینچا اور چھوڑ دیا۔ لیکن جب یہی ڈوری، یہی تانت ایک بربط میں لگا دی جاتی ہے تو اس سے ایک فن کار کی پیدا کی ہوئی لرزش فضا کو نغموں سے معمور کر دیتی ہے۔ کیوں؟ کیونکہ اب اس ڈوری کی لرزش کے پس پردہ چند خاص ذہنی قوتیں سرگرم عمل ہیں اگرچہ ان دونوں کی لرزش کا سرچشمہ وہی ہے جان ڈوری ہے۔

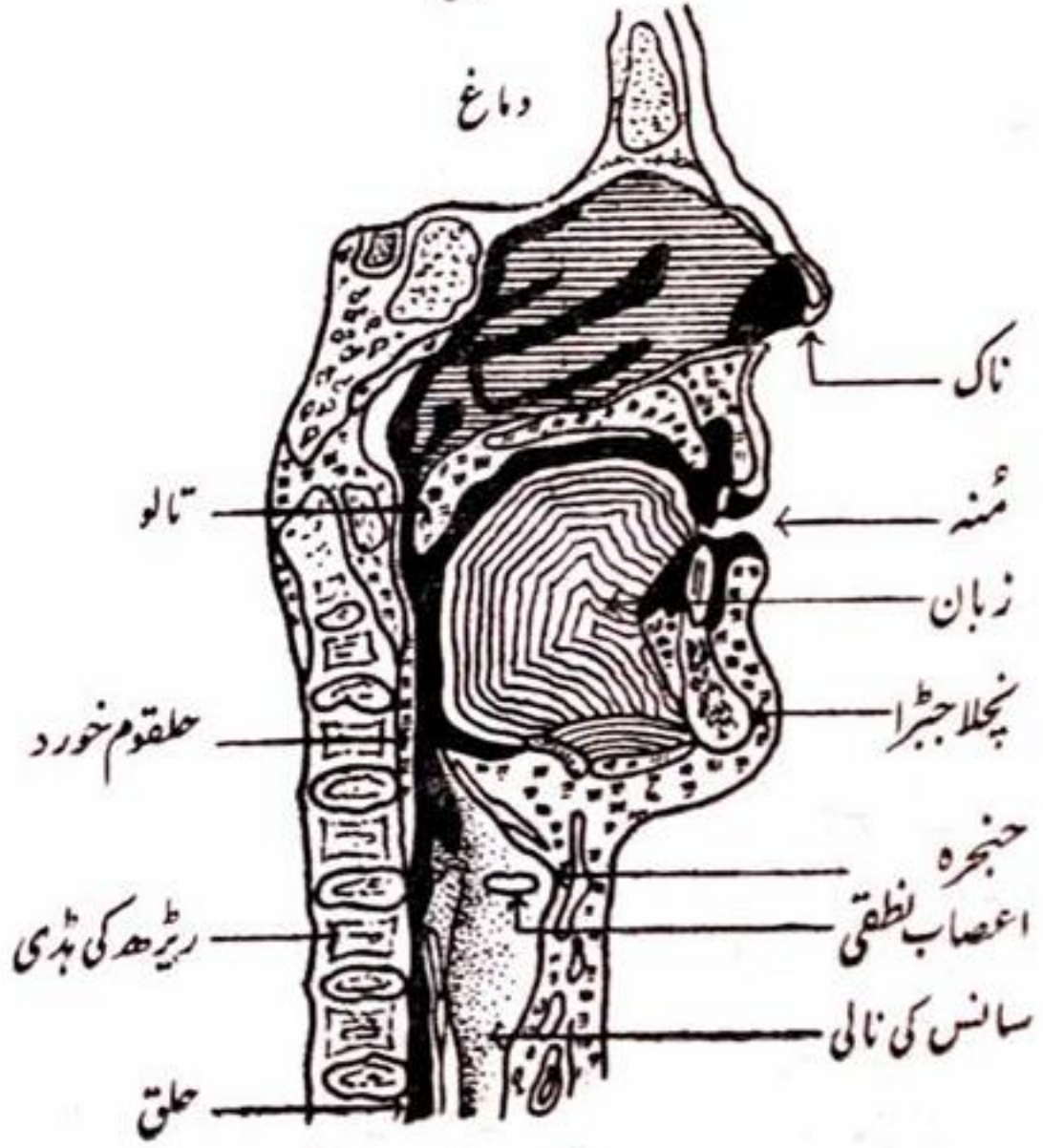
انسانی آلات صوت

بولی جانے والی زبان انسانی صوتی اعضاء سے ظہور میں آتی ہے اور انسانی کانوں کے ذریعے سماعت پذیر ہو کر دماغ کے ایک مخصوص حصے میں ایک بیجان کی صورت میں پہنچنے کے بعد کسی مفہوم کی شکل اختیار کرتی ہے۔

انسانی آواز بھی دوسری قدرتی اور غیر قدرتی آوازوں کی طرح مخصوص فطرتی قوانین کی پابند ہے۔ صوتی لہریں ایک معینہ رفتار کے مطابق سفر کرتی ہیں جو کہ آواز کی نوعیت اور واسطہ سفر (Medium) کی ماہیت کے مطابق کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ تمام صوتی لہریں مخصوص تعداد ارتعاش کی حامل ہوتی ہیں۔

انسانی آواز کی پیدائش میں مندرجہ ذیل اعضاء مل کر صوتی آلات کے فرائض سر انجام دیتے ہیں - پھیپھڑے ، حلقوم ، بلعوم ، حنجرہ ، اعصاب لفظی ، منہ ، ناک ، تالو ، زبان ، دانت اور ہونٹ (ملاحظہ ہو خاکہ الف) -

اعضائے صوتی



خاکہ (الف)

انسانی کے لیے اعضائے لفظی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - پھیپھڑے ، حلق اور منہ - حلق میں حنجرہ (نرخرہ) اور اعصاب لفظی خاص طور پر اہم ہیں -

پھیپھڑے دھونکنی کا کام کرتے ہیں اور یہ ہوا کے بہاؤ کو مطلوبہ دباؤ یا رفتار سے حلق میں سے گزارتے ہیں اور اس تسلسل کو ضرورت کے مطابق قائم رکھتے ہیں - آواز کا اصلی سرچشمہ حلق ہے - جس میں واقع اعصابی ریشے اس ہوا کے دباؤ سے متاثر ہو کر تھرتھرانے لگتے ہیں جس

سے اس ہوا کے بہاؤ میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ارتعاش کو آپ دوسرے معنوں میں آواز سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ منہ میں پہنچ کر یہ مرتعش ہوا مختلف دباؤ کے اثرات کے تحت مخصوص صوتی اکائیوں کے تسلسل کی صورت میں مطلوبہ الفاظ کو جنم دیتی ہے۔

گلو

انسانی گلا محض ایک سیدھی سادی نالی نہیں بلکہ ایک پیچیدہ قسم کا آلہ ہے جو کہ کئی ایک کل پرزوں سے مل کر بنا ہے اور مختلف قسم کے فرائض بجا لاتا ہے۔ اس میں ضرورت کے مطابق خود بخود کھانے اور بند ہونے والے سوراخ ہیں۔ اس میں ایسے اعصاب موجود ہیں۔ جن سے موقع محل کے مطابق کسی خاص حصہ کو ابھارا، دبایا یا پیچھے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے ہم کھاتے پیتے، سانس لیتے اور باتیں کرتے ہیں۔ اس کے کسی حصے کو ذرا سا بند کر دو تو زندگی کے لالے پڑ جائیں اور کسی حصے کو ذرا سا نقصان پہنچ جائے تو گو آواز باقی رہ جائے گی، مگر الفاظ کا جامہ نہیں پہن سکتے گی۔ عام حالات میں حلق سے گزرتے وقت ہوا کی رفتار قریباً دس میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ لیکن چھینک اور کھانسی کے وقت یہ ہوا ایک طوفان سے بھی زیادہ تیز ہو جاتی ہے اور اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ تک پہنچ جاتی ہے یہ ہے انسانی گلا جس کے ذریعے ایک عام انسان اگر اس نے چپ روزہ نہیں رکھا ہوا تو ایک دن میں باتیں کرتے ہوئے قریباً پچیس ہزار الفاظ ادا کرتا ہے اب اندازہ لگائیں کہ دن میں کتنی دفعہ گلے کے مختلف اعصاب تنتے اور ڈھیلے پڑتے ہوں گے۔

باوجود اس پیچیدہ ساخت کے ہارا گلا الفاظ کو جنم نہیں دیتا، یہ تو صرف آواز پیدا کرنے کا ایک آلہ ہے۔ اگر دوسرے متعلقہ کل پرزے (منہ، زبان، دانت اور ہونٹ وغیرہ) اس کے ساتھ تعاون نہ کریں تو انسانی آواز محض غاؤں غاؤں اور غوں غوں کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ بعض پرندوں کا گلا انسانی گلے سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ ان میں طوطا اور مینا بھی شامل ہیں جو کہ انسانی آواز کی ہو جو نقل اتارنے پر قادر ہیں۔ اکثر پرندے اس گلے کی مدد سے اتنی سریلی قسم کے نغمے لپتے ہیں کہ نہ تو انسانی آواز اور نہ کوئی ساز ان کی صحیح نقل اتار سکتا ہے۔ لیکن یہ سب نغمے محض

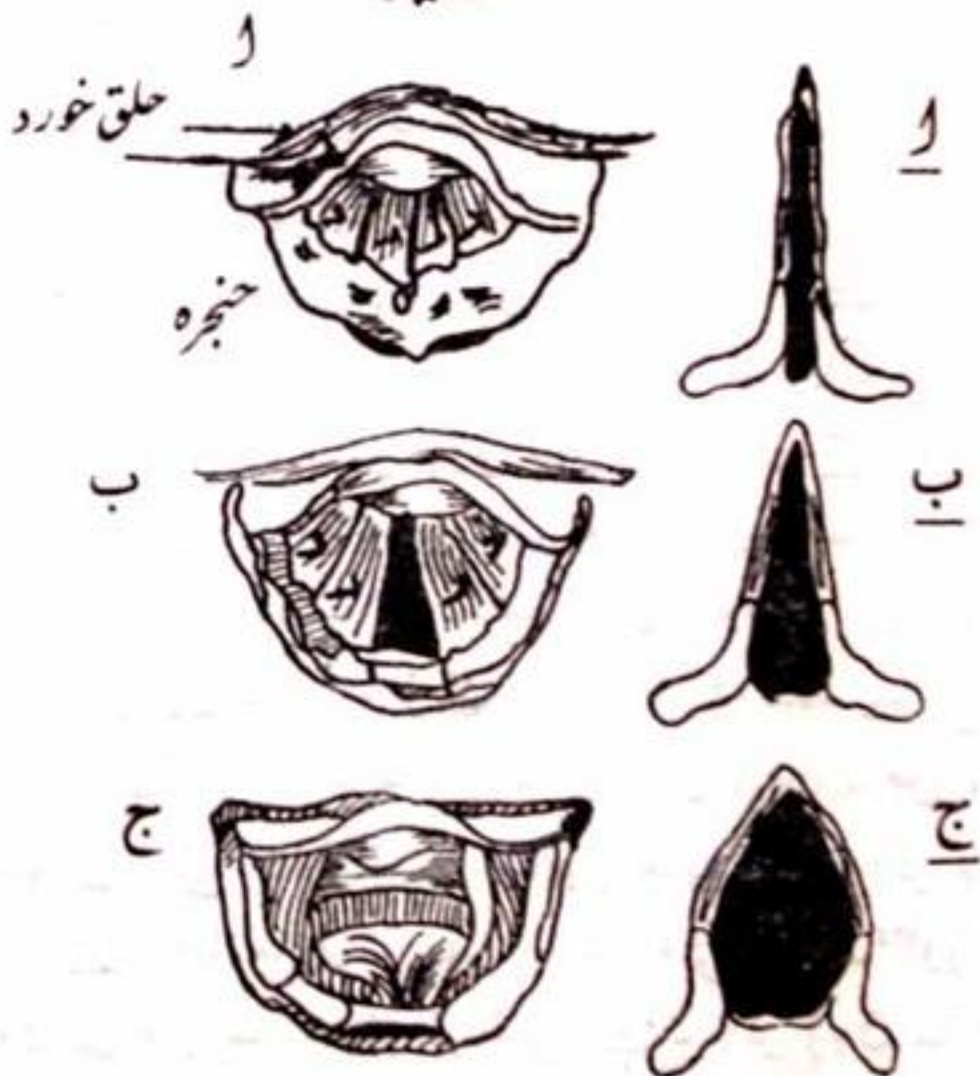
ایک وقتی ہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں جن میں نہ کوئی گہرائی ہوتی ہے نہ ان کا ماضی کی شیریں یادوں سے تعلق ہوتا ہے اور نہ مستقبل کے سنہرے سپنوں سے۔ یہاں وہ ذہنی قوتیں بھی مفقود ہیں۔ جو کہ ان آوازوں کو کسی نظم اور ضبط کے تحت لا کر ان سے مطلوبہ صوتی اکائیوں کو جنم دے سکیں۔ اس بھری دنیا میں یہ خصوصیت صرف حضرت انسان کو ہی حاصل ہے۔

منہ : زبان کا منبع

آپ نے دیکھ لیا کہ جب دل (در حقیقت دماغ) میں بات چیت کرنے کی خواہش پیدا ہوتی تو سینہ معمولی سا ابھرا۔ پھیپھڑوں کو کچھ خلا

اعصابِ لفظی اور حلقومِ خورد

مختلف حالتوں میں



حاکہ (ب)

مل گیا اور وہ بھیل گئے۔ اس سے پھیپھڑوں کے اندر بھی ایک قسم کا خلا پیدا ہو گیا جسے بھرنے کے لیے ناک اور منہ کے ذریعے ہوا اندر داخل ہو گئی۔ یہی ہوا انسانی زندگی کی اساس ہے اور اسی ہوا سے انسانی آواز جنم لیتی ہے۔ اب غیر ارادی طور پر سینے نے پھیپھڑوں پر معمولی سا دباؤ ڈالا اور وہ کچھ سکڑ گئے۔ کھلے منہ کے غبارے کی طرح ہوا حلق کے راستے باہر کو دوڑی۔ اب اگر آپ آرام کی حالت میں ہیں اور کوئی باتیں وغیرہ نہیں کر رہے تو یہ ہوا آپ کے آرام میں خلل ڈالے بغیر چپکے سے باہر نکل جائے گی۔ لیکن اگر آپ باتیں کرنے پر تلے ہوئے ہوں تو غیر ارادی طور پر گلے کے بعض پٹھوں کی مدد سے اعصاب نطقی میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے (ملاحظہ ہو خاکہ ب)۔ اب جیسے ارغنون کی مہین پتیوں میں ہوا کا دباؤ ارتعاش پیدا کر کے آواز کا باعث بنتا ہے ایسے ہی حلق سے گزرنے والی ہوا ان تنے ہوئے اعصابی ریشوں میں ایک تھر تھراہٹ پیدا کر دیتی ہے جس سے خود اس ہوا میں بھی ایک قسم کا ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مرتعش ہوا جو کہ اب آواز کا روپ دھار چکی ہے گلے سے نکل کر منہ میں پہنچ جاتی ہے۔

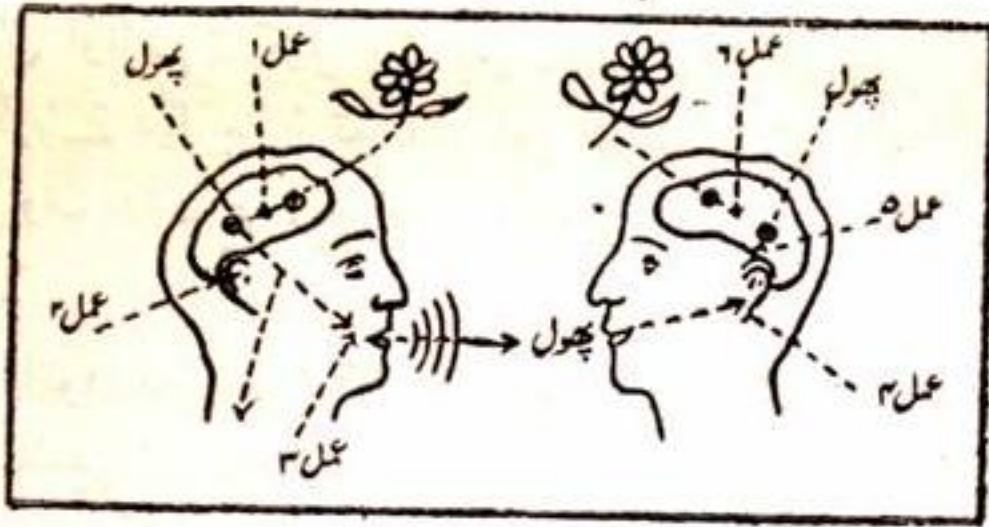
منہ انسانی آلات صوتی کا تیسرا اور سب سے اہم آلہ ہے۔ یہاں گلے سے آنے والی آواز کو ضرورت کے مطابق ڈھال کر مختلف قسم کے الفاظ گھڑ لیے جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی زبان کی مدد سے ہوا کے اس بہاؤ کو روک کر یک دم اس طرح سے چھوڑ دیں کہ زبان کا سرا تالو کو دانتوں کے اوپر والے حصے کو چھو جائے تو زبان کے سرے کے مختلف طریقوں سے تالو کے مخصوص حصوں کو چھونے سے ت، ٹ، د، ڈ، ژ، ط، ل اور ن وغیرہ قسم کے الفاظ کی آوازیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر اس مرتعش ہوا کے بہاؤ کو زبان اور تالو کی مدد سے بنے ہوئے تنگ راستہ سے گزارا جائے تو ٹ، ذ، ز، س، ش، ص، ض، ظ اور یائے مصوتی کی قسم کی سیٹی نما آوازیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ تنگ راستہ ہونٹوں کی مدد سے بنایا جائے تو پھر یہ مرتعش ہوا 'ف' اور 'واؤ' مصوتی قسم کی آوازوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر زبان ساکت رہے اور ہونٹوں کو یک دم کھول کر رکی ہوئی مرتعش ہوا کو چھوڑ دیا جائے تو ہونٹوں کے مختلف اندازوں کے مطابق ب، پھ، پ، پھ اور م وغیرہ

قسم کی آوازیں جنم لیتی ہیں۔ اگر آنے والی آواز پر حلق کے اگلے اور زبان کی جڑ والے سرے پر دباؤ ڈالا جائے تو خ، غ، ق، ک اور گ وغیرہ قسم کی آوازیں تشکیل پاتی ہیں۔ اگر آواز کو بغیر کسی رکاوٹ کے آزادانہ گزرنے دیا جائے تو منہ اور ہونٹوں کے مختلف اندازوں کے مطابق یہ حروف علت ع، ح اور ہ وغیرہ قسم کی آوازوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

باتوں باتوں میں پھول کا ذکر بھی آگیا۔ گو اس وقت کوئی پھول آنکھوں کے سامنے نہ تھا پھر بھی متکلم کے دماغ میں ایک نیم شگفتہ پھول کا تصور سا کھنچ گیا۔ اس کے دماغ کے کسی مخصوص حصہ کے خلیوں میں ایک خاص قسم کا بیجان سا پیدا ہوا اور انہوں نے ماضی کے طاقچوں میں سے اس لفظ اور اس سے متعلقہ تصور کو ڈھونڈ نکالا۔ اب اعضائے صوتی کو علاحدہ علاحدہ احکام صادر کر دیے گئے۔ پھیپھڑوں نے سینہ کی مدد سے ہوا کو حلق کی طرف خارج کر دیا۔ حنجرہ میں واقع اعصاب نطقی میں ایک تناؤ سا پیدا ہو گیا جس نے اس آنے والی ہوا میں ایک ارتعاش کا عالم پیدا کر دیا۔ جب یہ مرتعش ہوا کا بہاؤ منہ میں پہنچ گیا تو ہونٹوں نے ایک بند شگوفے کی شکل بناتے ہوئے اس مرتعش ہوا کے بہاؤ کو روک دیا۔ پھر یک دم ایک کھلتے ہوئے شگوفے کی طرح ہونٹ تھوڑا سا کھل گئے۔ ہوا کے تھمے ہوئے بہاؤ نے ہونٹوں کے اس تنگ راستے سے باہر کا رخ کیا اور اس طرح خارج ہوتے ہوئے 'پھ' کی آواز پیدا کر دی۔ اب ان نیم وا ہونٹوں نے تھوڑا سا اور آگے بڑھ کر تھوتھنی کی صورت اختیار کر لی جیسے یہ کنول کے پھول کی صوری نقل اتارنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اس طرح مرتعش ہوا کا بہاؤ کچھ دیر اور جاری رہا اور 'آ... او' کی آواز ظہور میں آ گئی۔ اب ہونٹ تھوڑا کھل گئے اور کچھ پیچھے ہٹ گئے، زبان جو اب تک آرام سے لیٹی ہوئی تھی خلیوں کی حکومت سے حکم پاتے ہی حرکت میں آ گئی اور مقررہ احکام کے مطابق اٹھ کر اپنے اگلے سرے سے تالو کو دانتوں کے اوپر والے حصہ پر مس کر دیا۔ اس طرح سے 'ل' کی آواز کی تشکیل ہو کر 'پھول' کا لفظ مکمل ہو گیا (ملاحظہ ہو خاکہ ج)۔

لیکن قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ جنگل میں پھول کھلا کس نے دیکھا؟ یعنی پھول کھلنے کے ثبوت کے لیے دیکھنے کی شرط لازمی ہے

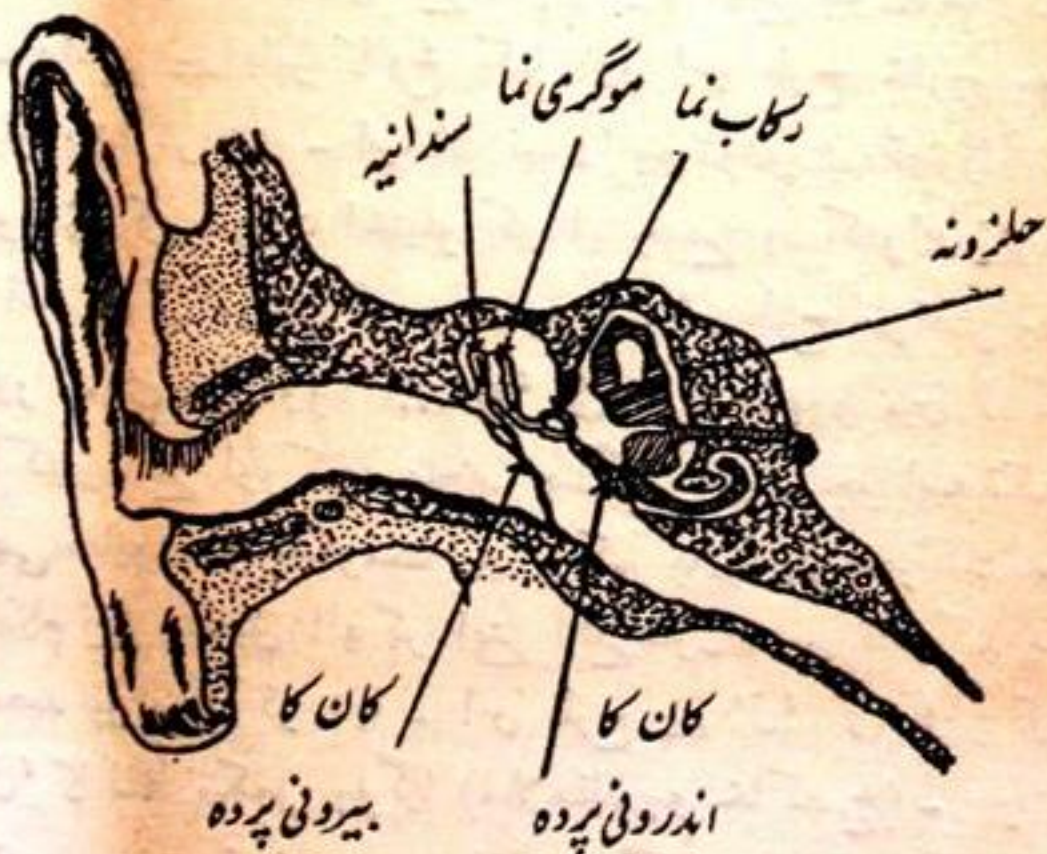
پھول کا سفر



خاکہ (ج)

وگر نہ کون کہہ سکتا ہے کہ آیا پھول کھلا بھی یا نہیں۔ اسی طرح جب تک کوئی سننے والا اس بات کی شہادت نہ دے تو صرف منہ کی حرکات ہی اس امر کا ثبوت نہیں ہیں کہ آیا کسی نے پھول کہا بھی یا نہیں۔ ممکن ہے کہ ظاہراً طور پر منہ ان تمام حرکات کو عمل میں لاتا رہا ہو جو پھول کہنے کے لیے ضروری ہیں لیکن اعصاب نطقی نے ان کا ساتھ نہ دیا ہو۔

اعضائے سماعت



خاکہ (د)

گوش بر آواز

پھول کہتے وقت متکام کے منہ سے نکلتی ہوئی مرتعش ہوا کے اس سلسلے نے فضا میں بھی لہروں کی شکل میں ایک قسم کے ارتعاش کا تسلسل سا پیدا کر دیا جو کہ قریباً بارہ سو فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے ہر شش جہت میں پھیل گیا۔ یہ مرتعش لہریں سفر کے دوران مخاطب کے کانوں کے پردوں سے بھی جا ٹکرائیں (ملاحظہ ہو خاکہ د)۔

حلزونہ



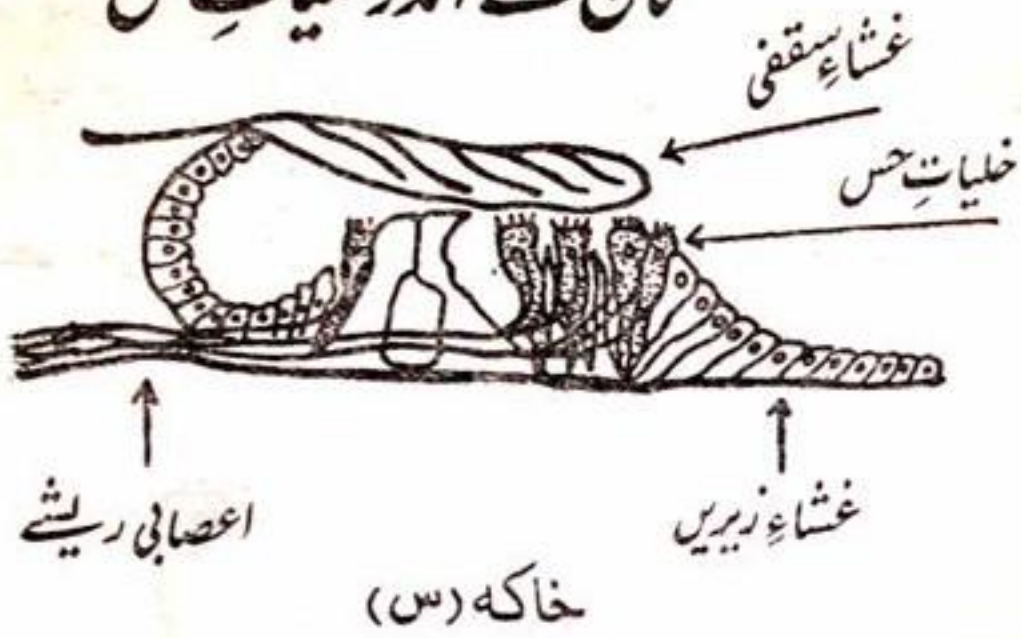
خاکہ (س)

کان کا یہ پردہ اتنا نازک واقع ہوا ہے کہ ان لہروں کے ٹکرانے سے اس میں بھی اسی طرز کا ارتعاش پیدا ہو گیا۔ یہاں سے یہ ارتعاش ملحقہ ہڈیوں، موگری نما، مندانیہ اور رکاب نما کے ذریعے کان کے اندرونی حصہ کے دہن بیضوی تک پہنچ گیا۔ صحیح معنوں میں کان کا یہی اندرونی حصہ قوت سماعت کا سب سے اہم عضو ہے۔ گھونگھے کی شکل کا ہونے کی بنا، پر اسے کن گھونگھہ یا حلزونہ کہتے ہیں (ملاحظہ ہو خاکہ ر)۔

علاوہ قوت سماعت کے یہ انسانی توازن کو برقرار رکھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ یہ مختلف پیچیدہ سی نالیوں سے مل کر بنا ہے۔ یہ نالیاں ایک قسم کے سیال مادے سے بھری ہوتی ہیں۔ آنے والے ارتعاش کی وجہ سے اس سیال مادے میں بھی لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ لرزش ایک ملحقہ لچک دار پردہ (غشا زیری) میں چھوٹے سے پیمانہ پر ایک جوار بھانٹا کی

کیفیت پیدا کر دیتا ہے (ملاحظہ ہو خاکہ (س) -

کان کے اندر خلیاتِ حس



اس پردے پر مسہین بالوں کی طرح اعصابی ریشے واقع ہیں جو کہ پردے کی اوپر نیچے کی حرکت کے ساتھ ساتھ اوپر نیچے ہوتے ہیں اور اس طرح سے اوپر ڈھکنے کی طرح واقع پردے (غشاءِ سقفی) کے ساتھ چھوتے ہیں۔ لچک دار پردے کے مسہین ریشوں کا لمس ایک قسم کی برقی رو کی صورت میں اعصابی ریشوں کے ذریعے تلغراف کے گٹ گر، گٹ گٹ گر، کی طرح دماغ میں اپنے مخصوص حصے میں واقع قوت سہاعت سے متعلق بھورے مادے کے خلیوں تک پہنچ گیا۔ یہاں ان مخفی حروف کو ان کی صحیح آوازوں کی صورت میں سمجھ لیا گیا۔ پھر ان آوازوں کو ذہن کے طاقتوں میں سے پہلے سے محفوظ شدہ ہزار ہا آوازوں کے تصورات سے موازنہ کر کے متکلم کے صحیح مفہوم کا پتہ لگا لیا۔ یعنی مخاطب کو معلوم ہو گیا کہ متکلم نے پھول کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ ماہرین کے اندازہ کے مطابق ایک عام چار سالہ بچے کا سرمایہ^۱ الفاظ کوئی پانچ ہزار ۵,۰۰۰ الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں یہ سرمایہ چودہ ہزار ۱۴,۰۰۰ الفاظ تک جا پہنچتا ہے۔ ایک عام بالغ انسان کا سرمایہ^۲ الفاظ پنتیس ہزار (۳۵,۰۰۰) سے ستر ہزار (۷۰,۰۰۰) الفاظ تک ہوتا ہے جب کہ کالج کے ایک طالب علم کا سرمایہ^۳ الفاظ ڈیڑھ لاکھ (۱,۵۰,۰۰۰) سے بھی زیادہ تک جا پہنچتا ہے۔ اب ان الفاظ کی صوتی اکائیوں کا اندازہ خود ہی لگائیں۔

بظاہر متکلم کے دماغ میں 'پہول' کے لفظ کے اظہار کرنے کے تصورات پیدا ہونے سے لے کر سامع کے دماغ میں 'پہول' کے مفہوم کے تصورات کی تخلیق ہونے تک نفسیاتی ، برقی ، کیمیاوی اور طبیعیاتی افعال کا ایک نہایت ہی پیچیدہ اور طویل سلسلہ عمل پذیر ہوتا ہوا نظر آتا ہے لیکن انسانی دماغ کے وہ حصے جو قوت گویائی ، قوت سماعت اور قوت فہم کے لیے مخصوص ہیں ایک اعلیٰ پائے کی خودکار مشین کی طرح یہ سب فرائض آن واحد میں سرانجام دے دیتے ہیں یعنی جب ہم گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ اس دوران میں ہمارے جسم کے مختلف حصوں میں کیا کیا کیفیات اور کیا کیا حرکات پیدا ہو رہی ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دماغ میں واقع کروڑہا خلیے لاکھوں سال کے تجربات کی بناء پر اپنے فرائض کی بجا آوری میں اس حد تک ماہر ہو چکے ہیں کہ وہ ہلک جھپکنے سے بھی کم وقفہ میں بالکل صحیح نتائج اخذ کر لیتے ہیں ۔ یہاں لاکھوں سالوں کا تجربہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے ۔ خلیے نسل در نسل اپنے کام میں مہارت حاصل کرتے رہے ہیں اور اپنی حاصل کی ہوئی خصوصیات آنے والی نسلوں کو ودیعت کرتے چلے آ رہے ہیں اور پھر ہر آنے والی نسل اس مہارت میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتی رہی ہے ۔ اس کا نتیجہ اور ثبوت موجودہ انسان کا دماغ اور اس کے کارنامے ہیں ۔

ایک نظریے کا ارتقا

روم ایک ہی دن میں پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ گیا۔ صدیوں سے انسان کی تخلیقی قوتیں برسرِ کار رہیں۔ فلک بوس محلات اور پر شکوہ منادر کھنڈرات میں تبدیل ہوتے رہے۔ ان کی بنیادوں پر نئے روم ابھرتے اور اجڑتے رہے۔ روم آج بھی اسی تعمیر و تخریب کے چکر میں گرفتار ہے۔ فضائے بسیط کی بے کراں پہنائیوں میں لڑھکتی ہوئی اس ننھی سی گیند پر جب تک انسانی ہستی کے نشانات موجود ہیں۔ تب تک یہ روم کبھی بھی تکمیل پذیری کی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔

صرف روم پر ہی کیا منحصر! انسانی تخلیقات کا کوئی بھی پہلو حرفِ آخر کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ غور و فکر کی راہیں کبھی بھی مسدود نہیں ہوئیں۔ ان پر جگہ جگہ بابل، بڑپہ، اہرام مصر، تاج محل، فلاطو، نطشے، بدھ اور سپوٹنک کی صورت میں منگ میل تو ضرور ایستادہ ہیں لیکن ان کی آخری منزل مستقبل کے دھندلکوں میں جا کر گم ہو جاتی ہے۔ جب انسان اجنٹا کے غاروں میں اڑتے ہوئے انسان کے ہیولے بنا رہا تھا اس وقت اس کے وہم و گمان بھی نہ ہوگا کہ ایک دن اس کا یہی تصور حقیقت کا روپ دھار کر چاند اور ستاروں کو اپنی آماجگاہ بنا لے گا۔ آج بھی کسے معلوم کہ یہ پرواز خیال کہاں جا کر دم لیتی ہے۔

برصغیر کے شمالی حصے کی جملہ زبانوں کی اساس کا مسئلہ بھی صدیوں سے اسی قسم کی ادھیڑ بن کا شکار ہے۔ آج سے کوئی ساڑھے تین ہزار سال قبل جب آریائی قبائل وادی سندھ میں وارد ہوئے تو یہاں بسنے والے قبائل کی زبانوں کو مختلف ناموں سے یاد کیا۔ کبھی اسے 'مردھراواک' (غیر زبان) کا نام دیا۔ یعنی ایسی زبان جو ان کی اپنی زبان سے بالکل مختلف تھی کبھی 'ناگ بانی' کے نام سے پکارا یعنی ایسی زبان جو ناگ قبائل بولتے تھے یا وہ زبان جو ناگ دیوتا کے ماننے والے استعمال کرتے

تھے 'اسر بنہاشا' یعنی وہ زبان جو یہاں کے غیر آریائی قبائل بولتے تھے اور ملیچہ بنہاشا یعنی ناپاک زبان قرار دیا۔ جب ذرا بعد میں علم کا چرچا ہوا اور مختلف زبانوں کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا تو آریائی زبان کے مقابلے میں مقامی زبانوں کو 'دیسا جا' یعنی دیسی زبانیں کہا گیا یعنی وہ اپنی آریائی زبان کو غیر ملکی تصور کرتے تھے۔ زمانہ اور آگے بڑھا تو سنسکرت بمعنی فطری زبان کے مقابلے میں مقامی زبانوں کو پراکرت یعنی خود رو زبان اور 'اپ بھرنش' یعنی روبہ زوال زبان کا نام دیا گیا۔ غرضیکہ برہمنی گروہ سنسکرت جسے وہ دیوبانی تصور کرتے تھے اور مقامی زبانوں کے درمیان ہمیشہ ایک مصنوعی حد فاصل قائم رکھنے میں کوشاں رہا۔

اسی برہمنی ذہنیت کے زیر اثر برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں نے شروع ہی سے دو مختلف صورتیں اختیار کر لیں : اول سنسکرت اور دوسری پراکرت۔ سنسکرت زیادہ تر مذہب اور ادب کی زبان تھی اس لیے اسے ہمیشہ مذہبی اور بالائی طبقے کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس روایاتی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اکثر فرسودہ تراکیب اور متروک الفاظ کا سہارا لیا جاتا تھا لیکن ان کاوشوں کے باوجود یہ مقامی اثرات سے دامن نہ بچا سکی اور تو اور خود ویدوں کی زبان میں بھی مقامی عناصر موجود ہیں۔ ہاں! اس سعی لاحاصل کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ یہ دیوبانی عوام سے دور ہو کر زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکی۔ اس کے برعکس پراکرتیں یعنی مقامی غیر آریائی زبانیں جنہیں عوامی زبانیں کہنا زیادہ موزوں ہوگا ہمیشہ عوام میں بول چال کے لیے استعمال ہوتی رہیں۔ یہ زمانے کے ساتھ ساتھ بداتی رہیں اور تمام تر لسانی محرکات سے اثر پذیر ہوتی رہیں۔ انہوں نے اپنے حقیقی ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے میں آریائی عناصر کو سمولبنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ گو ادبی اور عوامی زبانیں پہلو بہ پہلو نشوونما پاتی رہیں لیکن طبقاتی تفاوت کی بناء پر ایک بڑی حد تک ایک دوسری سے الگ تھلگ رہیں۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت جب برصغیر میں چھوٹے رجواڑے ختم ہو کر ایک متحدہ مرکزی حکومت کی بنیادیں استوار ہو گئیں تو قدیم ادبی زبان یعنی سنسکرت اپنے سرپرستوں سے محروم ہو جانے پر بطور ایک زندہ زبان کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اس طرح

عوامی زبانوں کو آگے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقعہ مل گیا۔ اب انہیں مذہبی اور ادبی تخلیقات کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ برصغیر کے شمالی حصے کی موجودہ زبانیں براہ راست انہی عوامی زبانوں کے ارتقائی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زبانوں کی بعض صرفی و نحوی ترکیبوں کا کلاسیکی ادبی زبان میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔

جب اہل مغرب برصغیر میں وارد ہوئے تو ان میں سے بعض متجسس ذہنوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کے مطالعہ میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ یہ بات ان کے لیے ایک اچنبھے سے کم نہ تھی کہ ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت کے سرمایہ الفاظ کا ایک بڑا حصہ یورپی زبانوں سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ یورپ کے طول و عرض میں اس بات کا چرچا جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ جگہ جگہ سنسکرت کے درس و تدریس کے لیے دارالعلوم کھول دیے گئے اور تمام بڑی بڑی درسگاہوں میں سنسکرت کے بارے میں تحقیقی مراکز قائم ہو گئے۔ اس سلسلے میں جرمنی سب سے پیش پیش تھا۔ ان تحقیقی مراکز کی بدولت یورپ اور ایشیا کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور زبانوں کے بارے میں معلومات کے ذخیرہ میں ایک گرانقدر اضافہ ہوا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ان کے ذہنوں پر سنسکرت کا بھوت کچھ اس حد تک سوار تھا کہ انہوں نے خالص تحقیقی کارناموں کے ساتھ ساتھ اپنے یکطرفہ مطالعہ کی بناء پر بعض اوقات کئی ایک غیر متوازی نظریوں کو بھی جنم دیا جنہیں کہ ان کے بلند بانگ دعووں اور بلند آہنگ ناموں کی وجہ سے بے چون و چرا قبول کر لیا گیا۔ برصغیر کے شمالی حصے کی جملہ زبانوں کے سنسکرت الاصل ہونے کا مسئلہ بھی ان غیر متوازی نظریات میں سے ایک ہے جو کہ ان زبانوں کے سرمایہ الفاظ میں محض آریائی عنصر کی موجودگی کی بناء پر قائم کر دیا گیا تھا۔ شروع شروع میں اس کے خلاف چند کمزور سی آوازیں اٹھیں لیکن وہ میکس مولر، ہارنلے، جاہن بیمر، جارج گریسن اور ولیم جونز جیسے باون گزوں کے سامنے کارگرنہ ہو سکیں۔ یہ نام طلباء لسانیات کے ذہنوں پر کچھ اس طرح سے سایہ فگن رہے کہ قریباً پچھلی ڈیڑھ صدی میں کسی میں یہ جرات پیدا نہ ہوئی کہ وہ اس غلط نظریے کو چیلنج کر سکے۔

برصغیر کی آزادی کے بعد پھر سے زبانوں کے بارے میں تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا ہوا اور حقائق کا نئے سرے سے جائزہ لیا جانے لگا

جس سے غور و فکر کی کئی ایک نئی راہیں کھل گئیں۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے وادی سندھ کی زبانوں کی اصل کا مسئلہ میرے لیے ہمیشہ گہری دلچسپی کا باعث رہا۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق اس بارے میں سوچنے کی کوشش کی ہے۔

۱۹۵۲ء کے اوائل کا ذکر ہے کہ میں نے 'ارتقاء اردو کی چند ابتدائی کڑیاں' کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون ترتیب دیا۔ اس میں معلومہ نظریات سے بحث کرتے ہوئے لکھا کہ:

''آثار قدیمہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے قبل وادی سندھ میں جو قوم آباد تھی وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے تہذیب و تمدن کے ایک بلند مقام پر فائز تھی۔ لامحالہ اس کی زبان بھی اسی حد تک ترقی یافتہ ہوگی۔ منقش مہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قوم علامتی فن تحریر سے آشنا تھی۔ افسوس ہے کہ اب تک یہ رسم الخط پڑھا نہیں جاسکا۔ اس لیے اس زبان کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہاں یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس زبان کے سرمایہ الفاظ کا کچھ حصہ موجودہ پنجابی، سندھی، بلوچی، براہوئی اور پشتو میں ضرور موجود ہوگا۔ کیونکہ اگر ان زبانوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کے سرمایہ الفاظ میں کئی ایک غیر آریائی اصل کے الفاظ بھی ملیں گے۔ لامحالہ ان الفاظ کا ایک بڑا حصہ اسی قدیم زبان سے تعلق رکھتا ہے۔''

آریائی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ:

''آج سے قریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل جب آریائی قبائل وادی سندھ میں وارد ہوئے تو وہ اپنے ساتھ ایک نئی تہذیب اور ایک نئی زبان لے کر آئے جو کہ ان کی فتوحات کے ساتھ ساتھ تمام ملک پر چھا گئی۔ لیکن اس سے یہاں کی مروجہ مقامی زبان مٹ نہیں گئی بلکہ آنے والی زبان میں جذب ہو گئی گو یہ جذب و تحلیل کا عمل بتدریج وقوع پذیر ہوا۔ نتیجہً سنسکرت اپنا خالص پن کھو بیٹھی اور اس نے پراکرت بھاشا کا روپ دھار لیا۔ آخر کار خالص سنسکرت بطور ایک عوامی زبان

کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی اور اس کی جگہ
پراکرتوں نے لے لی۔“

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مذکورہ مضمون میں نہ تو اس غیر
آریائی عنصر کی کوئی نشاندہی کی گئی تھی اور نہ آریاؤں سے قبل کی
زبان کے بارے میں کوئی وضاحت کی کہ یہ زبانوں کے کون سے گروہ سے
تعلق رکھتی تھی۔ نیز اس میں یہ بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ قدیم زبان
نے آریائی زبان میں جذب ہو کر اپنی انفرادیت کھو دی۔

۱۹۵۶ء میں مزید مطالعہ کی روشنی میں مذکورہ مضمون پر
نظر ثانی کرتے ہوئے اس کے بنیادی خیال سے انحراف کرتے ہوئے لکھا :

”شروع میں جب کہ علم اللسان ابھی اپنی ابتدائی منازل میں
ہی تھا تو اکثر ماہرین شرقیات نے اردو زبان کے سرمایہ
الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے سنسکرت زبان کی شاخ
قرار دے دیا گو عصر حاضر میں سوئین جوڈز و اور ہڈرہ وغیرہ
مقامات کی کھدائیوں کی بدولت کئی ایک نئے تاریخی شواہد
سامنے آچکے ہیں لیکن پھر بھی اردو زبان پر وہی سنسکرت
الاصل والا پرانا لیبل چسپاں ہے۔ فی زمانہ مغربی محققین
یا تو مردہ اور قدیم زبانوں کی کھوج میں سرگرداں ہیں یا پھر
مغربی زبانوں کی چھان بین میں مصروف ہیں۔ مشرقی محققین
اکثر مغرب کی کاہلیسی ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں
اور آزادانہ طور پر تحقیق و تدقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں
کرتے۔“

سنسکرت اور اردو کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد نتیجہ نکالا کہ :

”صرف و نحو کے لحاظ سے اردو اور سنسکرت میں نہ صرف
فروعی بلکہ اصولی اور بنیادی اختلافات موجود ہیں۔ یہ بات
عقل سے بعید ہے کہ ایک زبان کی شاخ اس سے بالکل مختلف
ہو۔ کم از کم دنیا کی زبانوں کی تاریخ میں ہمیں ایسی کوئی
مثال نہیں ملتی۔ اگر محض سرمایہ الفاظ کے اشتراک کو ہی باہمی
رشتے کا معیار قرار دے دیا جائے تو خود فارسی زبان میں
عربی الاصل الفاظ کا اتنا زیادہ عنصر موجود ہے کہ اس لحاظ سے

اسے بجائے آریائی گروہ کی شاخ کے سامی زبانوں کے گروہ سے منسلک تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اگر فارسی زبان کو باوجود اس کی لغوی مماثلت کے سامی زبانوں کی شاخ نہیں مانا جا سکتا تو پھر اردو زبان کو محض لغوی مطابقت کی بناء پر سنسکرت کی شاخ کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔“

ابھی تک مجھے دراوڑی زبانوں کے گہرے مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا تھا اس لیے انیسویں صدی کے ماہر لسانیات ڈاکٹر لیتھم کے نظریات کی اساس پر دراوڑی زبانوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھا کہ :

”انیسویں صدی کے اوائل میں بعض ماہرین لسانیات نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ برصغیر کے شمالی حصے کی زبانیں دراوڑی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اردو اور پنجابی کا دراوڑی زبانوں کی صرف و نحو اور سرمایہ الفاظ سے اس قدر اختلاف ہے کہ اس نظریے کو کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی۔“

آخر میں نتیجہ نکالا کہ :

”جب تحقیق و تدقیق کے بعد یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ وحیح معنوں میں سنسکرت اور دراوڑی زبانوں میں سے کوئی بھی اردو کی جد امجد قرار نہیں دی جا سکتی تو ہمارے لیے یہ تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں کہ اردو زبان کا حقیقی سرچشمہ خود وادی سندھ کی وہ قدیم زبان ہے جو کہ آریاؤں کی آمد سے قبل یہاں رائج تھی۔“

اب میں ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکا تھا کہ جہاں اردو زبان کی اساس کے بارے میں تمام سابقہ نظریات کو بزعم خود رد کر دیا لیکن اپنی طرف سے کوئی واضح متبادل نظریہ پیش کرنے سے بھی قاصر رہا۔ سوائے اس کے کہ سنسکرت اور دراوڑی کے مقابل وادی سندھ کی قدیم زبان کو لا کھڑا کیا جس کے بارے میں اس وقت بات کرنا ہوا میں قلعے تعمیر کرنے کے مترادف تھا۔ مجھے بخوبی احساس تھا کہ یہ نظریہ اس وقت تک ریت کی دیوار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھ سکتا جب تک کہ

اس کی اساس ٹھوس حقائق پر استوار نہیں کی جاتی -

دل میں بار بار یہ سوال ابھرتا تھا کہ آخر آریاؤں کی آمد سے قبل اس پانچ دریاؤں کی سر زمین میں کون سی زبان بولی جاتی ہوگی - اس امر کا تو مجھے یقین واثق تھا کہ ہڑپائی تہذیب کے درخشندہ دور کی زبان سراسر نیست و نابود نہیں ہوئی بلکہ اس کی کچھ نہ کچھ باقیات یہاں کی موجودہ زبانوں میں ضرور بضرور موجود ہوں گی - اس سلسلہ میں میری نگاہ رہ رہ کر برصغیر کی قدیم اقوام کی طرف جاتی تھی - جیسے کہ کوہ ہالیہ کے دامن میں بسنے والی پہاڑی اقوام جو کہ انداخ سے لے کر بنوٹان تک پھیلی ہوئی ہیں - ناگا قبائل جو کہ مشرقی پاکستان اور آسام کے جنگلات میں آباد ہیں - منڈا قبائل یعنی کول، بھیل اور سنتھال وغیرہ جو کہ راجستھان کے تپتے صحراؤں اور وسط ہند کے گھنے جنگلات میں بود و باش رکھتے ہیں اور جنوبی بھارت میں بسنے والی دراوڑی اقوام - لیکن ان قوموں کی زبانوں کے مطالعہ کے لیے میرے پاس کوئی ذرائع موجود نہ تھے -

ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ۱۹۵۷ء کے اوائل میں کوئٹہ جانے کا اتفاق ہوا - حسب معمول سب سے پہلے کباڑی مارکیٹ میں پرانی کتابوں کی دکانوں کا طواف کیا - کتابوں کی دکانوں میں جا کر ورق گردانی کی اور لائبریریوں میں کتابوں کی فہرستوں کا مطالعہ کیا - آخر میونسپل کمیٹی کی لائبریری میں کچھ کام کی کتابیں نظر پڑیں اور ان سے نوٹ لینے شروع کر دیے - ایک حد تک گم شدہ کڑیوں کا کچھ سراغ ہاتھ لگا ، پھر بھئی یہ مواد میرے مطمع نظر کی وضاحت کے لیے کافی نہ تھا لیکن سوال یہ تھا کہ مطلوبہ لٹریچر کہاں سے آئے - کیا اس نظریے کو ایک لامحدود عرصے تک کولڈ سٹوریج میں رہنے دیا جائے یا پھر اسی خام صورت میں مارکیٹ میں بھیج دیا جائے - انہی دنوں میں نے ہفت روزہ 'لیل و نہار' میں 'سرمایہ' اردو کے عنوان سے لسانی بحث کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا جس سے متاثر ہو کر ماہنامہ 'پنجابی ادب' لاہور کے ایڈیٹر جناب محمد آصف خاں صاحب نے اپنے رسالہ کے لیے پنجابی زبان میں کچھ لکھنے کی فرمائش کی - اگرچہ میں پچھلے دس بارہ برس سے متواتر لکھ رہا تھا لیکن پنجابی زبان میں لکھنا میرے لیے ایک

بالکل نئی بات تھی۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ یہ موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ شاید یہ خام مال یہیں بہتر طور پر کھپ سکے۔ اس خیال کے پیش نظر جو بھی معلومات اس وقت تک فراہم ہو سکیں انہیں یکجا کر کے 'پنجابی زبان دیاں جڑاں' (پنجابی زبان کی جڑیں) کے عنوان سے بہ ہزار دقت پنجابی زبان میں قلمبند کر دیا۔ جب یہ مضمون ماہنامہ 'پنجابی ادب' اکتوبر ۱۹۶۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا تو قارئین نے اس پر اپنی پسندیدگی کی مہر ثبت کر دی۔

اس مضمون کی تمہید میں لکھا کہ :

''پنجابی زبان دا سنسکرت دی لڑی دسیا جانا کوئی انوکھی گل نہیں سی کیوں جے اج توں تھوڑا چر پہلاں ساڈے دیس دی تاریخ آریاں دے ہلے توں شروع بندی سی اتے ایس توں پہلاں دے حال دا کچھ اتا پتا نہیں ملدا سی۔ ایس لئی جدوں وی کوئی ودوان ایس زبان دے مڈھ بارے کھوج لاؤن دا جتن کر دا تاں او آریاں دے ہلے تے آکے رک جاندا سی پر بن زمانہ بدل چکیا اے۔ پرانے کھنڈراں دی کھوج بھال کرن والیاں دیاں کدالان نے کوٹ دیجی، موئن جو دڑو اتے ہڑپہ دے پرانے شہراں دے منہ متھے توں زمانے دی مکڑی دے بنے ہوئے گھنے جالیاں نوں لا سٹیا اے۔ پر ایہہ آریاں توں پہلاں دے وسنیک کمہڑی بولی بولدے سن اجے تکر ایس گورگھ دھندے تے ہڑپہ اتے موئن جو دڑو توں ملن والیاں گونگیاں مہراں دے جندے وجے ہوئے نیں۔ میں ایہہ کہواں گا پئی مہراں تے کچھ وی لکھیا ہووے پر ساڈے ساہمنے اوس زبان دا کھوج لاؤن لئی اک دوسرا راہ وی کھلا ہوئیا اے اتے او اے ساڈی اپنی زبان جمہیدے وچ اجے تکر اوس بیتے ہوئے سمے دیاں نشانیاں باقی بن۔''

(پنجابی زبان کا سنسکرت کی شاخ بتایا جانا کوئی نئی بات نہ تھی۔ کیونکہ آج سے تھوڑا عرصہ پہلے ہمارے ملک کی تاریخ آریاؤں کے حملے

سے شروع ہوتی تھی اور اس سے پہلے کے حالات کا کچھ اتنا پتہ نہیں ملتا تھا اس لیے جب بھی کوئی محقق اس زبان کی اصل کے بارے میں تحقیق کرنے کی کوشش کرتا تو وہ مجبوراً آریاؤں کے حملے پر آ کر رک جاتا لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ کی کدالوں نے کوٹ دیچی، موئن جو دڑو اور ہڑپہ کے پرانے شہروں کے چہروں سے زمانے کی مکڑی کے بنے ہوئے گہنے جالوں کو اتار پھینکا ہے لیکن آریاؤں سے پہلے کے باشندے کون سی زبان کے حامل تھے اب تک اس گورگھ دھندے پر ہڑپہ اور موئن جو دڑو کے کھنڈرات سے دستیاب ہونیوالی گونگی مسہروں کے تالے پڑے ہوئے ہیں۔ میں یہ کہوں گا کہ ان مسہروں پر کچھ بھی لکھا ہو لیکن ہمارے سامنے اس زبان کا کھوج لگانے کے لیے دوسرا راستہ بھی کھلا ہے اور وہ ہے ہاری اپنی زبان جس میں آج بھی اس گزرنے ہوئے دور کی باقیات موجود ہیں)۔

آگے چل کر اسی مضمون میں اپنی مجبور یوں کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ :

”پنجاں دریاواں دی دھرتی دے پرانے وسنیکاں دی زبان دا کھوج لاؤنا کچھ سوکھا وی اتے کچھ اوکھا وی۔ سوکھا ایس لئی پئی سانوں اوس راہ دا پتہ اے جمہیدے تے چل کے اسپں تہاں ٹکانے لگ سکدے ہاں۔ اوکھا ایس لئی پئی جھڑیاں کتاباں ایس راہ تے چائنن پا سکدیاں نیں اوہ اپنی اپڑتوں باہر ہن۔ پرایہناں دی اڈیک وچ بیٹھے رہن نال وی پند کھوٹی ہندی اے۔ ایس انہیری رات وچ تاریاں دی نمتی نمتی لوای راہ چلن لئی کافی اے۔“

(پانچ دریاؤں کی سر زمین کے قدیم باشندوں کی زبان کا کھوج لگانا کچھ آسان بھی ہے اور کچھ مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ ہمیں اس راستے کا سراغ مل گیا ہے کہ جس پر چل کر ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ مشکل اس لیے کہ وہ کتابیں جو ان راہوں کے لیے مشعل کا کام دے سکتی ہیں ہاری دسترس سے باہر ہیں لیکن ان کے انتظار میں بیٹھے رہنے سے بھی منزل مقصود پر پہنچنے میں دیر لگتی ہے۔ اس اندھیری رات میں تاروں کی دھیمی دھیمی روشنی ہی راستہ دکھانے کے لیے کافی ہے)۔

اس کے بعد اسی مضمون میں پنجابی اور اردو زبان کے کچھ الفاظ کا دراوڑی زبانوں کے الفاظ سے تقابلی موازنہ پیش کیا ان میں صرف و نحو کی بعض مماثلتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دراصل پنجابی زبان کا دھارا دراوڑی سرچشموں سے پھوٹا ہے۔ اس سلسلے میں سنسکرت کا کردار صرف اس حد تک محدود ہے کہ اس نے اس کے لغوی سرمایہ کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔

اس پہلو میں جہتجو کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ ہر قدم پر نئی نئی الجھنوں سے دو چار ہوتا رہا اور دھندلکوں میں چھپے ہوئے راستوں پر ٹٹول ٹٹول کر قدم آگے بڑھاتا رہا لیکن اب افق پر روشنی کے آثار نمودار ہو رہے تھے اور شک و شبہ کی جگہ اعتماد اور یقین نے لے لی تھی۔ ایک سال کی متواتر تگ و دو کے بعد اس نظریے کو واضح حقائق اور ٹھوس دلائل کی مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان حقائق و دلائل کو یکجا کیا اور انہیں نئے سرے سے ترتیب دے کر 'وادی' سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات' کے عنوان سے قلمبند کرنے کے بعد جھجکتے جھجکتے اردو زبان کے سنجیدہ ترین علمی مجلہ 'اردو نامہ' کراچی کو ارسال کر دیا۔ اس مؤقر جریدہ کے شمارہ ششم (اکتوبر، دسمبر ۱۹۶۱ء) میں اس مضمون کی اشاعت میرے لیے ایک اچنبھا بھی تھی اور باعث مسرت بھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

اس مضمون میں بھی اپنے اسی نظریہ کو دہرایا اور مختلف مستشرقین کے نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ :

”جب کولبروک، الفنسٹن، لیتھم، ولیم ہنٹر اور جارج گریسن وغیرہ تحقیقات میں مصروف تھے تو اس وقت برصغیر کے شمالی حصے کی تاریخ آریاؤں کی آمد سے شروع ہوتی تھی اور اس سے پہلے ایک ایسا خلا تھا جس پر تاریکی کا گہرا پردہ پڑا ہوا تھا اس لیے ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ موجودہ زبانوں کے سرچشمہ کو سنسکرت سے مختلف مگر آریائی الاصل زبان قرار دیں۔“

اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے اور ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ زبان جس سے آنے والے آریائی قبائل کو واسطہ پڑا بڑبڑا اور موئن جو دڑو کے باشندوں کی زبان تھی۔ اس طرح مقامی اور نووارد زبانوں کی باہمی آمیزش سے کئی ایک بولیوں نے جنم لیا جو کہ موجودہ زبانوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ سنسکرت نے مقامی زبانوں کو محض متاثر کیا ہے انہیں نیست و نابود کر کے کسی نئی بولی کی طرح نہیں ڈالی بلکہ حق تو یہ ہے کہ مقامی بولیوں کی مقبولیت کے زیر اثر خود ختم ہو گئی۔ مقصد یہ کہ کسی زبان کا دوسری زبان سے متاثر ہونا اگرچہ یہ اثرات کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں اور اس کا دوسری زبان سے مشتق ہونا دو مختلف باتیں ہیں۔“

مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد مضمون کے خاتمہ پر بیان کیا کہ :

”دراوڑی اور وادی سندھ کی موجودہ زبانوں میں لغوی مطابقت پیشہ وارانہ فرقوں کے مشترک نام اور اسمائے ضمیر کی باہمی مماثلت اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ آریاؤں سے قبل وادی سندھ میں دراوڑی اور منڈا اقوام کا دور دورہ تھا اور ان کی زبانیں عوامی زبانوں کا درجہ رکھتی تھیں۔ جب آریائی قبائل آئے تو جہاں خود انہوں نے یہاں کی مقامی زبانوں سے گہرا اثر قبول کیا وہاں کسی حد تک مقامی زبانوں کو بھی متاثر کیا۔ لیکن ان کے اقلیت میں ہونے کی بناء پر یہ اثرات اتنے ہمہ گیر نہ تھے۔ اس سے زیادہ تر مقامی زبانوں کا لغوی پہلو ہی متاثر ہوا اور صرف و نحو کے ڈھانچے نے کوئی خاص اثر قبول نہ کیا۔ اہل علم حضرات نے ان مقامی زبانوں کو قدیم پراکرت کے نام سے یاد کیا ہے اور اسی قدیم پراکرت کو وادی سندھ کی موجودہ زبانوں کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ دوسرے معنوں میں ان کی پورٹ اعلیٰ سنسکرت نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر دراوڑی زبانیں ہیں۔“

اگرچہ یہ نظریہ ان تمام روایتی نظریات کو باطل قرار دے رہا تھا جو کہ پچھلی دو صدیوں سے تسلیم کیے جا رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس نئے خیال کو ہمارے علمی و ادبی حلقوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا کچھ اندازہ اس مضمون کے بارے میں ذیل کے حوالہ جات سے لگایا جا سکتا ہے :

(ا) شعبہ پنجابی، محکمہ لسانیات پٹیالہ، (بھارتی پنجاب) کے ڈائریکٹر ڈاکٹر جیت سنگھ سیتل، ایم اے، پی ایچ ڈی، نے اس مضمون کو پنجابی محکمہ کے سرکاری مجلے ماہنامہ 'پنجابی دنیا' (پٹیالہ) کے دسمبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں شائع کیا اور اس بارے میں ذاتی طور پر تعریفی خط بھی لکھا۔

(ب) مجلس ترقی ادب، لاہور نے ۱۹۶۳ء کے انعامی ادبی مقابلے میں اس مضمون کو ۶۲ - ۱۹۶۱ء کے دوران کا پاکستان بھر میں بہترین تحقیقی مضمون قرار دیا اور اس پر ایک ہزار روپے کا گرانقدر انعام دیا۔

(ج) ادارہ تاریخ ادبیات، پنجاب یونیورسٹی نے اسی مضمون سے متاثر ہو کر اپنے اشاعتی پروگرام کے سلسلے میں مجھے 'پنجابی زبان کی تاریخ' کے بارے میں مقالہ لکھنے کا شرف بخشا۔

(د) بورڈ آف انٹرمیڈیٹ و سیکنڈری ایجوکیشن، لاہور کی طرف سے انٹرمیڈیٹ امتحان کے لیے پنجابی زبان کی منظور شدہ نصابی کتاب 'پہلواری' کے فاضل مؤلفین جناب ڈاکٹر مسہر عبدالحق ایم اے، پی ایچ ڈی اور پروفیسر شریف کنجاہی صاحب نے اسے اپنی اس گرانقدر تالیف میں شامل کیا۔

(ر) مرکزی اردو بورڈ، لاہور کی طرف سے شائع کردہ 'اردو سندھی کے لسانی روابط' (مطبوعہ ۱۹۷۰ء) کے فاضل مصنف ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے آریاؤں سے قبل کی زبانوں کا تذکرہ اسی مضمون کے حوالے سے کیا ہے۔

(س) پاکستان رائٹرز گڈ، ملتان ریجن نے ۱۹۶۴ء میں اسے اپنے انتخابی مجموعے 'سب رنگ' میں جگہ دی۔

(ص) دراوڑی گروہ کی پاکستانی شاخ براہوئی زبان کے واحد ترجمان ہفت روزہ 'ایلیم' مستونگ (بلوچستان) نے ۱۹۶۴ء میں اس مضمون کی افادی حیثیت کے پیش نظر اپنے صفحات میں نئے سرے سے قسط وار شائع کیا۔

(ط) بزم ثقافت، ملتان کی طرف سے شائع کردہ 'سرائیکی شاعری' (مطبوعہ، ۱۹۶۹ء) کے مؤلف جناب کیفی جام پوری نے اپنی اس فاضلانہ تالیف میں پنجابی زبان کی ملتانی بولی کی ابتداء کے بارے میں اپنی تحقیق کی بنیادیں اسی مضمون پر استوار کی ہیں۔

(ع) بزم ثقافت، چکوال (ضلع جہلم) کی طرف سے شائع کردہ تحقیقی کاوش 'دھنی ادب و ثقافت' (مطبوعہ، ۱۹۶۸ء) کے مصنف پروفیسر انور بیگ اعوان نے پنجابی زبان کی ابتدائی کڑیوں کا جائزہ لیتے وقت اسی مضمون کے حوالے سے بات کی ہے۔

(ف) عالی جناب جی یزدانی ملک 'نغمہ' پاکستان نے اسی مضمون کے خطوط پر ترتیب دیے گئے میرے اس مضمون کے حوالہ جات کو 'لغات سرائیکی'، مؤلفہ ظامی بہاولپوری کے عالمانہ مقدمہ میں ایک نمایاں جگہ دی۔

یہ وہ حوالہ جات ہیں جو کہ میری نظروں سے گزر چکے ہیں ممکن ہے کہ ان کے علاوہ بھی دوسرے صاحب نظر حضرات نے اس مضمون کے حوالے سے بات کی ہو۔

غرضیکہ اتنے قلیل عرصے میں یہ مضمون ایک مستند دستاویز کا درجہ حاصل کر چکا ہے خاص کر پنجابی اور اس کی مختلف بولیوں کے بارے میں تحقیق کرتے وقت اس مضمون کے حوالے کے بغیر بات مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ مضمون مزید تحقیقات کی روشنی میں نظر ثانی کے بعد زیر نظر کتاب میں شامل ہے۔ ضروری ترمیم و اضافے سے اس کی افادی حیثیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

آج سے چند سال پیشتر ہمارے عامی اور ادبی حلقوں کے لیے دراوڑی ایک نامانوس اور غیر متعلقہ لفظ تھا لیکن اب لسانی تحقیقات کے سلسلے میں دراوڑی گروہ کی زبانوں کا ذکر ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتا ہے مثلاً جناب سہیل بخاری صاحب اپنے ایک تحقیقی مقالے بعنوان 'قدیم دکنی اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ' میں رقمطراز ہیں کہ :

”ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس برصغیر کی تمام زبانیں دراوڑی یعنی ہندوستانی ہیں۔ ان کا اپنا ایک خاندان ہے جو بیرون ہند کے دوسرے خاندانوں سے مختلف ہے۔ چنانچہ وہ خصوصیات جو اسے ہالیہ کے اس پار کی زبانوں سے ممتاز کرتی ہیں ان تمام زبانوں میں مشترک ملتی ہیں کہ یہی ان کے دراوڑی ہونے کی پہچان ہے۔“

اسی مضمون میں آپ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ :

”ویدک اور سنسکرت کو دیکھ کر جو کہ ایرانی اور ہندوستانی یعنی آریائی اور دراوڑی کا آمیزہ ہیں مشرق و مغرب کے محققین کو یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ پاکستان اور شمالی بھارت کی تمام زبانیں انہی سے مشتق ہیں۔“

(اردو نامہ ، کراچی ، دسمبر ۱۹۶۴ء)

اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا صاحب اپنے ایک تحقیقی مضمون بعنوان اردو زبان کا پس منظر، میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

”ایک ہزار پانچ سو سال قبل از مسیح کے لگ بھگ آریاؤں نے پہلی بار ہندوستان پر یلغار کی اور وادی سندھ کی دراوڑی تہذیب سے متصادم ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ آریاؤں کی زبان بھی دراوڑی زبان سے متصادم ہوئی ہوگی۔“

”یہ کہنا کہ نووارد زبان نے دیسی بھاشا کو ختم کر کے خود ایک مرکزی حیثیت اختیار کر لی حقائق کے بالکل برعکس ہے۔ یہ طے ہے کہ ہندوستان میں بولی جانے والی دیسی بھاشائیں سنسکرت کی بگڑی ہوئی صورتیں نہیں تھیں، بلکہ یہ وہ زبانیں

تھیں جو کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے ہی یہاں بولی جاتی تھیں۔“
(سیپ ، شماره نمبر ۴ ، ۱۹۶۵ء)

مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ یہ نئی لہر میرے ہی پیش کردہ نظریہ کی صدائے بازگشت ہے۔ ہاں میرے لیے یہ امر باعث مسرت ضرور ہے کہ اب میں اس نئی ڈگر پر اکیلا ہی گامزن نہیں ہوں بلکہ کچھ اور دوست بھی میرے ہم رکاب ہیں۔ مجھے امید واثق ہے کہ ایک دن یہی پگڈنڈی ایک عظیم شاہراہ کی حیثیت اختیار کر لے گی۔

اُردو زبان کا پس منظر

اردو زبان کی ابتداء کیسے ہوئی ، کب ہوئی اور کہاں ہوئی ؟ یہ چند ایک ایسے سوالات ہیں کہ جن کے بارے میں پچھلے سو سو سال سے متواتر بحث و تمحیث کا سلسلہ جاری ہے ۔ قیام پاکستان کے بعد بہاری قومی زندگی میں اردو کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہے اس کے پیش نظر ان سوالوں کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ بعض اہل علم اصحاب اس سلسلے میں تحقیق و تدقیق کی نئی راہیں تلاش کرنے کی فکر میں ہیں ۔

محترم حافظ محمود شیرانی مصنف 'پنجاب میں اردو' کے یہ الفاظ آج بڑی اتنے ہی صحیح ہیں جتنے کہ آج سے تیس سال قبل قلمبند کرتے وقت تھے کہ :

”اردو زبان کے آغاز کا مسئلہ اگرچہ دلچسپ ہے لیکن اس پر بہاری موجودہ معلومات کی روشنی میں قلم اٹھانا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے اور صحیح اطلاعات کی بہم رسانی کے لیے شاید ابھی ایک عرصہ درکار ہوگا۔“

گو آج کئی ایک نئے حقائق سامنے آچکے ہیں جن میں کہ بڑپائی اور کوٹ دیچی کی تہذیبوں اور وسط ایشیا کے کشان عہد کے کھنڈرات سے دستیاب ہونے والے کتبوں کی دریافت خاص طور پر قابل ذکر ہے لیکن ان حقائق کے گہرے مطالعے کے بعد نتائج اخذ کرنے کے لیے ابھی کچھ وقت درکار ہے ۔ زیر نظر کاوش اسی سلسلے کی ایک تعارفی کڑی ہے ۔

کئی ایک اہل علم اصحاب نے اس بارے میں اپنی اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کا مطالعہ ہمارے لیے کسی واضح نظریے تک پہنچنے میں مدد و معاون ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ان کے نقطہ ہائے نظر میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ اردو زبان امیر خسرو کی ایجاد ہے ۔ کوئی اس کی دریافت کا سہرا ولی دکنی

کے سر باندھتے ہیں ، کچھ اہل علم اسے عہد شاہجہان میں قلعہ معلیٰ کی پیداوار بتلاتے ہیں تو دوسرے اس کے آغاز کو محمد بن قاسم کے حملے سے منسوب کرتے ہیں ۔ جیسے زبان بھی کوئی فطریات کی قسم کی شے ہو جو شام کے وقت تو صفحہ ہستی پر موجود نہ تھی لیکن صبح ہوئی تو عالم وجود میں آچکی تھی ۔

کسی بھی زبان کی ابتداء کا مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زبان نے انسان کے ساتھ ہی جنم لیا اور پھلتی پھوٹی ، ادلتی بدلتی ہم تک پہنچی ہے ۔ یعنی دنیا کی زبانوں کا بنیادی عنصر اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود حضرت انسان کا وجود ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زبان انسان سے بھی پہلے صفحہ ہستی پر موجود تھی ۔ کیونکہ جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جہاں تک باہمی اظہار اور ابلاغ کا تعلق ہے وہ جہد للمبقاء کے تقاضے کی بدولت یک خلیہ امیبا سے لے کر ارتقاء حیات کی آخری کڑی تک کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے ۔ لیکن یہاں زبان کے اس عمومی پہلو سے بحث کرنا مطلوب نہیں اور نہ مجموعی طور پر انسانی زبان ہمارا موضوع بحث ہے ۔ ہمیں تو صرف اردو زبان کے بارے میں بات کرنا ہے ۔ یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ اردو زبان کو کوئی خاص استثناء حاصل نہیں ۔ اس کی تشکیل بھی انہی قوانین فطرت کی مرہون منت ہے جن کے تحت دوسری انسانی زبانوں نے جنم لیا اور ان کی طرح ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کر کے موجودہ صورت اختیار کی ہے ۔

آغاز اردو کے بارے میں چند نظریات

اس مسئلہ پر مزید بحث سے پہلے اس بارے میں اہل الرائے حضرات کے نظریات کا جائزہ لینا ضروری ہے ۔

سر سید ، امام بخش صہبائی اور مولانا آزاد کے نظریات کے مطابق اردو زبان عہد شاہجہان (۱۶۲۸ تا ۱۶۵۸ء) میں دہلی کے گردونواح میں پیدا ہوئی ۔

میر امن اور سید خدا بخش اسے عہد اکبری (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء) میں مختلف قوموں کے آزادانہ میل جول کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ۔

ڈاکٹر گلکرائسٹ (Gilchrist) اپنی تصنیف 'ہندوستانی لسانیات' (Hindostani Philology) میں رقمطراز ہیں کہ:

”ہندوستانی (اردو) زبان نے امیر تیمور کے حملے (۹۹-۱۳۹۸ء) کے دوران موجودہ صورت اختیار کی۔“

مولوی محمد حسین آزاد اور سعید مارہروی کا خیال ہے کہ اردو زبان برج بھاشا اور فارسی کی ملاوٹ سے ظہور میں آئی جسے ہم زیادہ سے زیادہ قطب الدین ایبک (۱۱۹۲ تا ۱۲۱۰ء) کے دور سے شمار کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور سید سجاد ظہیر 'ہندوی' اور فارسی کی آمیزش کو محمود غزنوی (۹۹۸ تا ۱۰۳۳ء) کے زمانے سے منسوب کرتے ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کی رائے ہے کہ اردو کی ابتداء محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے (۷۱۲ء) کے وقت سے ہی شروع ہو گئی تھی۔

مغربی محققین نے اس پہلو میں کافی محتاط روش اختیار کی ہے۔ سر جارج گریسن (G.A. Grierson) اور سر چارلس لائل (Sir Charles Layall) نے صرف یہی کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے جب مقامی زبانوں میں فارسی الفاظ کی آمیزش شروع ہوئی تو اس کے نتیجے میں ایک نئی زبان نے جنم لیا جو آگے چل کر اردو کہلائی۔

ان سب نظریات کی تہہ میں ایک ہی خیال کارفرما نظر آتا ہے کہ اردو زبان کی پیدائش پراکرتوں میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ یہ مفروضہ قائم کرنے کے بعد اب صرف یہ تعین کرنا باقی تھا کہ یہ آمیزش کب ہوئی۔ اس بارے میں ہر ایک نے اپنی اپنی فہم و فراست کے مطابق اندازہ لگانے کی کوشش کی اور اس طرح محمد بن قاسم کے حملے ۷۱۲ء سے لے کر عہد شاہجہان (۱۶۲۸ تا ۱۶۵۸ء) تک کوئی ہزار سال کے عرصے میں مختلف ادوار کو اردو زبان کی پیدائش کی طرف منسوب کر دیا۔ سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ نظریات قائم کرتے وقت نہ صرف اردو زبان کے سرمایہ الفاظ کے مختلف عناصر کو ہی یکسر نظر انداز کر دیا گیا بلکہ اس کی صرف و نحو اور صوتی پہلو کو درخور اعتناء

تصور نہیں کیا گیا حالانکہ اس مسئلہ کے حل کے لیے اس پہلو کو باقی سب امور پر فوقیت حاصل ہونا چاہیے تھی۔ ماہر لسانیات ڈاکٹر آر۔ جی۔ لیتھم نے کہا ہے کہ :

”درخت کی عمر کا اندازہ اس کے تنے کے غیر مرکزی دائروں سے لگایا جا سکتا ہے لیکن زبان ایک ایسی شے ہے کہ نہ تو اس میں درختوں کی طرح غیر مرکزی دائرے ہیں نہ گھوڑوں کی طرح دانت اور نہ کسی روزنامچہ میں اس کی تاریخ پیدائش درج ہے کہ جس سے اس کی عمر کا صحیح تعین کیا جا سکے۔ اس کا سراغ لگانے کا فقط ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے تحقیق... ! اور تحقیق...!! اور زیادہ تحقیق...!!!“

ہند آریائی زبانوں کا گورکھ دھندا

جب اردو زبان کی ابتداء کا سوال سامنے آتا ہے تو مختلف نظریات کی رو سے اس پہلو میں اکثر چار زبانوں یعنی پراکرت ، اپ بھرنش ، شور سینی اور برج بھاشا کو اس کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نام بذات خود وضاحت طلب ہیں اور ہمارے ہاں اکثر ان کے صحیح مفہوم کا تعین نہیں کیا جاتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قدماء کے ہاں بھی کہ جن سے یہ اصطلاحات ورثے میں ملی ہیں ان زبانوں کے بارے میں کوئی متفقہ وضاحت موجود نہ تھی بلکہ جو مفہوم ان سے منسوب تھے انہیں زیادہ سے زیادہ ایک ایسے ڈھیلے ڈھالے چولے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ جسے موقعہ محل کے لحاظ سے مختلف معانی کے اجسام پر موزوں کیا جا سکے۔ اس لیے اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان اصطلاحات کا مختصر سا جائزہ لے لیں :-

ہند یورپائی گروہ :

اکثر یورپائی ، فارسی اور سنسکرت پر مشتمل زبانوں کا گروہ

قدیم ہند یورپائی :

موجودہ ہند یورپائی زبانوں کی فرضی جد اعلیٰ

ہند آریائی :

ماہرین لسانیات اسے تین مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں :

- اول :** ہند یورپائی گروہ کے مترادف کے طور پر
- دوم :** آریائی گروہ کی وہ شاخ جس سے کہ سنسکرت اور اوستائی مشتق ہیں -
- سوم :** ان آریائی قبائل کی زبان جو کہ قریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل از مسیح مغربی پاکستان میں وارد ہوئے -

ویدک زبان

برصغیر کے شمالی حصے میں وارد ہونے والے آریائی قبائل کی مذہبی کتابوں یعنی ویدوں کی زبان خاص کر رگ وید کی زبان -

ویدوں کا زمانہ تالیف . . . ۱۴۰۰ ق م ان کے برصغیر میں ورود سے شروع ہوتا ہے - اس سلسلے کی آخری کتاب یعنی 'اتھروید' کے بارے میں تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ اس کی تالیف کا عہد . . . ۱۴۰۰ ق م کے لگ بھگ ہے - یعنی چاروں ویدوں کی تخلیق کا زمانہ کوئی ایک ہزار سال کے عرصے تک پھیلا ہوا ہے -

یاد رہے کہ برصغیر میں فن تحریر قریباً چوتھی صدی قبل از مسیح میں رائج ہوا - ظاہر ہے کہ اتنے طویل عرصے میں ویدوں کے بھجن سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہے - لازمی طور پر یہ بھجن زبان کے فطرتی ارتقاء سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے - علماء کے ایک بڑے طبقے کا خیال ہے کہ ویدوں کی زبان مقامی غیر آریائی عناصر سے متاثر ہوئی ہے - اس پہلو میں ہم بھارت کے مشہور ہندو مؤرخ ڈاکٹر رادھا کامود مکر جی کا قول پیش کرتے ہیں :

”ویدوں کی زبان ، کلاسیکی سنسکرت اور پراکرتوں میں بلکہ خود برصغیر کے شمالی حصہ کی زبانوں میں دراوڑی عنصر موجود ہے - ماہرین لسانیات تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شمالی ہند میں ورود کے بعد آریائی زبان میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی جو کہ براہ راست دراوڑی اثرات کا نتیجہ تھا - رگ وید کی زبان میں لٹوی اصوات کی موجودگی اسے اوستائی اور دوسری آریائی زبانوں سے متمیز کرتی ہے -“

واضح رہے کہ ویدک آریائی زبان ہونے کے باوجود ایک ہزار سال قبل وارد ہونے والے آریائی قبائل کی زبان سے کافی حد تک مختلف ہو گی لیکن چونکہ اس اولین عہد کی زبان کے کوئی نمونہ فراہم نہیں ہیں اس لیے ان اختلافات کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہاں! البتہ باقی آریائی زبانوں سے تقابلی جائزے کے بعد اس کا کچھ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔

سنسکرت

اس سے مراد شستہ اور سنواری ہوئی زبان ہے۔ برہمنی طبقے نے اسے دیوبانی کا لقب دے رکھا تھا یہ نام ویدوں سے لے کر ہندومت کی تمام مذہبی، ادبی اور رزمیہ تخلیقات کی زبان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ویدوں کے علاوہ اپنشدیں، سمرتیاں، سماہارت، رامائن اور کالیداس کے ڈرامے وغیرہ سب اسی زبان میں ہیں۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے سنسکرت کو ایک ایسی خالص آریائی زبان تصور کیا جاتا تھا جو کہ یکسر غیر آریائی عناصر سے مبرا و منزہ ہو لیکن جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ اس قسم کے نظریات سراسر جذبات پر مبنی تھے۔ درحقیقت دوسری زندہ زبانوں کی طرح اپنے ارتقاء کے دوران سنسکرت بھی اپنے گرد و پیش میں بولی جانے والی غیر آریائی زبانوں سے گہرے طور پر متاثر ہوئی ہے۔ اس پہلو میں ہم دو روسی ماہرین سنسکرت جناب ایوانوف اور تاپوروف کی حالیہ تصنیف 'سنسکرت' مطبوعہ ماسکو ۱۹۶۸ء سے اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

”یہ باور کرنے کے لیے شواہد موجود ہیں کہ برصغیر کے شمالی حصے میں سنسکرت کے پہلو بہ پہلو غیر آریائی زبانیں بھی مروج تھیں جہاں کہ اب بھی بعض علاقوں میں یہ قدیم زبانیں موجود ہیں (غالباً برا ہوئی کی طرف اشارہ ہے ع ح)۔ سنسکرت کا ان (قدیم غیر آریائی) زبانوں سے ایک طویل عرصے تک متواتر میل جول رہا۔ سنسکرت میں غیر آریائی عنصر کی موجودگی اس کا بین ثبوت ہے۔ جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سنسکرت کے سرمایہ الفاظ میں یہ

(غیر آریائی عنصر کے) انجذاب کا عمل قدیم ہی سے شروع ہے اور اس کے اثرات ہمہ گیر ہیں۔“

پراکرت

برصغیر کی ہند آریائی زبانوں کے ذکر میں پراکرت کا تذکرہ ایک پہلی سے کم نہیں۔ عام طور پر سنسکرت کے مقابل میں اس کے معنی خود رو یا غیر شائستہ زبان کے لیے جاتے ہیں۔ متقدمین نے سنسکرت کے مقابلے میں جسے کہہ وہ دیوبانی کہتے تھے پراکرتوں کو ناگ بانی (سانپوں کی زبان یا سانپ کے پجاریوں کی زبان) یا اسر بھاشا (شیطانوں کی زبان) وغیرہ قسم کے ناموں سے یاد کیا ہے۔

عہد وسطیٰ کے علماء بھی پراکرت کے بارے میں کسی واضح نظریے کے حامل نہ تھے۔ علماء کا ایک طبقہ اسے سنسکرت سے مشتق قرار دیتا تھا جیسے کہ ہیم چندر کا قول ہے کہ:

”سنسکرت ایک بنیاد ہے اور جس زبان نے بھی اس سے جنم

لیا وہ پراکرت کہلائی۔“

اس کے برعکس ’کویا لنکارا‘ کے مفسر نامی سادھو کا قول ہے کہ:

”پراکرت کا لفظ پراکرتی بمعنی ازلی اور قدیم سے مشتق ہے۔

یہ ایک ایسی زبان ہے جسے بچے اور عورتیں بھی بآسانی سمجھ سکتی ہیں اور یہی تمام زبانوں کی بنیاد ہے۔ بارش کے پانی کی طرح قدیم میں اس کا ایک ہی روپ تھا لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ علاقائی اثرات کے تحت اس کی ہیئت میں اختلافات رونما ہو گئے جس نے آگے چل کر سنسکرت اور

دوسری زبانوں کی صورت اختیار کر لی۔“

اسی طرح علماء کے درمیان اس بارے میں بھی اختلافات موجود ہیں

کہ پراکرت میں کون کون سی زبانیں شامل ہیں:

ورہ روچی: (پراکرت کی مشہور گرامر ’پراکرت پرکاش‘ کے

مؤلف) کے نزدیک صرف مہاراشٹری، پشاجی، ماگدھی

اور شور سینی پراکرت کہلائے جانے کی حقدار ہیں۔

ہیم چندر: (سڈھا ہیم چندر کا مؤلف) اوپر دی گئی زبانوں کے

علاوہ آرشا، چولیکا، پشاجی اور اپ بھرنش کو بھی

پراکرتیں تصور کرتا ہے۔

مارکنڈیہ کا وندرا: (مؤلف پراکرت سروا سوا) پراکرت کو ذیل کے چار مختلف زمروں میں تقسیم کرتا ہے:

بہاشا: جس میں مہاراشٹری، شورشینی، پراشیہ، آوتی اور ماگدھی شامل ہیں۔

روبہاشا: اس میں شاکی (ساکا قبائل کی زبان موجودہ اصطلاح میں سیتھین)، چندالی (بعض جنگلی قبائل کی زبان)، شاباری (کول، بھیل اور سنتھال وغیرہ قبائل کی زبان) شامل تسلیم کی جاتی تھیں (یاد رہے کہ یہ تینوں زبانیں غیر آریائی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں ع ح)۔

اپ بھرنش: اس میں ناگرا، وراچڈہ اور آپ ناگرہ زبانیں شامل تھیں۔
پشاچی: اس میں کیکہ اور پنچال زبانیں شامل تسلیم کی جاتی تھیں۔

اہل مغرب کی تقلید میں ہارے ہاں بھی اکثر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ پراکرت کسی ایک زبان کا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بذات خود پراکرت کسی زبان کا نام نہیں بلکہ زبانوں کے ایک گروہ کا نام ہے جس میں کہ بنگال سے لے کر سندھ تک کی مختلف زبانیں شامل تھیں۔

اپ بھرنش: بمعنی ایسی زبان جو صرف و نحو کے اصولوں کے مطابق نہ ہو یا عامیانہ زبان۔ اپ بھرنش کے بارے میں بھی علماء کے ہاں گہرا تضاد پایا جاتا ہے بلکہ اس پہلو میں تو نظریاتی اختلافات نہایت شدید ہیں۔ مارکنڈیہ کے نزدیک اپ بھرنش پراکرت کی ہی ایک شاخ ہے لیکن ورہ روچی اسے پراکرت سے خارج تصور کرتا ہے۔ اس نے اپنی پراکرت کی معروف گرامر پراکرت پرکاش میں اپ بھرنش کا ذکر تک نہیں کیا۔

’کویا درس‘ کے مولف داندن کے نزدیک وہ تمام زبانیں جو سنسکرت سے مختلف ہیں اپ بھرنش کہلاتی ہیں۔ اس نے پنچال، مالوہ، گرجرا کے ساتھ گاؤڈا (مندا گروہ کی زبانیں)، اوڈرا (اوڈ قبائل کی زبان)، کالنگیہ

(جنوبی ہند کی دراوڑی گروہ سے تعلق رکھنے والی ایک زبان) اور دراوڑیہ (دراوڑی گروہ کی زبانیں) کو بھی اپ بھرنش بیان کیا ہے جو کہ غیر آریائی گروہ سے تعلق رکھنے والی زبانیں ہیں۔

واگ بھٹ نے اپنی تالیف 'واگ بھٹ النکار' میں زبانوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی سنسکرت، پراکرت، اپ بھرنش اور پشچی۔ اس کے نزدیک اپ بھرنش مختلف علاقوں کی مقامی خالص زبانوں کا نام ہے۔

'مرچھا کاٹیکا' کے مولف پرتھوی دھارانے ساکاری، چنڈالی، ساہری، کے علاوہ ڈھاکہ (موجودہ مشرقی پاکستان کی قدیم زبان) کو بھی اپ بھرنش بیان کیا ہے۔

غرضیکہ، قدماء اور عہد وسطیٰ کے علماء کے ہاں زبانوں کی تقسیم کے سلسلے میں کوئی مسلمہ اصول یا واضح نظریات موجود نہ تھے۔ اس عہد کے علماء اپنی اپنی سوچ سمجھ کے مطابق اصول وضع کر لیتے تھے اور ان کی بنیادوں پر اپنے افکار کی عمارت استوار کر دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مختلف نظریات کے درمیان زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ موجودہ دور کے سنسکرت دانوں نے جو کہ ساتھ ہی ماہرین لسانیات کا درجہ بھی رکھتے ہیں اپنے خصوصی مطالعہ اور ایک طرف رجحانات کی بدولت برصغیر کے شمالی حصے کی تمام زبانوں کو آریائی گروہ سے منسلک قرار دے دیا اور ان زبانوں پر یہ غلط لیبل اب کچھ اس طرح چسپاں ہو چکا ہے کہ اس کے بغیر ان زبانوں کا ذکر قریب قریب ناممکن نظر آتا ہے۔

وقت کا تقاضا ہے کہ جدید تحقیق کی روشنی میں ان اصطلاحات کا نئے سرے سے جائزہ لے کر ان کے مفہیم کا صحیح تعین کیا جائے۔ اس پہلو میں ہم عہد وسطیٰ کے ایک عالم سوم دیو 'مولف کتھا سرت ساگر' سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے برصغیر کی جملہ زبانوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے یعنی سنسکرت، پراکرتیں اور دیسی بھاشائیں (اس سے تمام غیر آریائی مقامی زبانیں مراد ہیں ع ح)۔

سنسکرت : وسیع معنوں میں ہم اسے ویدوں سے لے کر کالی داس کے ڈراموں میں مستعمل زبان سے مراد لے سکتے ہیں۔

پراکرت : وہ مقامی زبانیں جو کہ گہرے طور پر سنسکرت سے متاثر ہیں یا جن کے ادبی روپ میں سنسکرت کا رنگ نمایاں ہے جیسے کہ ماگدھی ، مہاراشٹری اور ان کی شاخیں -

اپ بھرنش یا دیسی بھاشائیں : وہ مقامی زبانیں جو کہ بنیادی طور پر سنسکرت سے اختلاف رکھتی ہیں جیسے کہ دراوڑی (ملیالم ، تامل ، تلگوکناری اور براہوئی وغیرہ) ، ساہرا یا منڈا (منڈاری ، سنتھالی اور بھیلی وغیرہ) ، پشاپی (پنجابی ، سندھی ، کشمیری ، ہریانوی اور اردو جو کہ پنجابی سے مشتق ہے) ، دردا (پشتو ، بلتی ، شینا اور کافرستان کی مختلف زبانیں) -

شمالی ہند کی قدیم زبانیں

اردو زبان کی جنم بھومی کے بارے میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن علماء کی اکثریت اس امر پر متفق ہے کہ اس کے سرچشمے برصغیر کے شمالی حصے سے ہی پھوٹے ہیں - اس لیے اردو زبان کے حسب و نسب کا تعین کرنے کے لیے اس خطے کی قدیم زبانوں کا جائزہ لینا ضروری ہے -

کلاسیکی ہندو ادب کی رو سے برصغیر کے شمالی حصے میں ذیل کی اپ بھرنشیں مروج تھیں :-

شورسینی : یہ دواہ گنگا جمنا کے علاقے میں مروج تھی جس میں کہ متھرا کو مرکزی حیثیت حاصل تھی - آگے چل کر یہی زبان برج بھاشا کہلائی - اہل اسلام کی آمد کے وقت بھی یہ زبان برج بھاشا کے نام سے موسوم تھی -

کیکیہ : جمنا سے لے کر قدیم درشداوتی (جدید ہاکڑا ندی) کے درمیانی علاقے میں مروج تھی - ہریانوی اسی زبان کی موجودہ ترقی یافتہ شکل ہے -

پشاپی : درشداوتی سے لے کر دریائے اٹک تک یعنی تمام غیر منقسم پنجاب میں مروج تھی - موجودہ پنجابی اور اس کی تمام علاقائی بولیاں مثلاً مالوٹی ، دوآبی ، ماجھی ،

لمی ، ملتانی ، سرائیکی (بالائی سندھ کی پنجابی بولی) ،
دہنی ، پوٹھوہاری ، پہاڑی اور ہندکو (صوبہ سندھ کی
پنجابی بولی) وغیرہ اسی پشاچی کے کنبے کی حیثیت
رکھتی ہیں ۔

برج بھاشا یا پنجابی

جب یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ اردو زبان نے برصغیر
کے شمالی حصے میں جنم لیا ہے تو اس کے سرچشمہ ہونے کی دعویدار کے
طور پر صرف دو زبانیں میدان میں باقی رہ جاتی ہیں یعنی برج بھاشا اور
پنجابی ۔ شروع شروع میں اردو زبان کے برج بھاشا سے مشتق ہونے کا
نظریہ ایک امر مسلمہ کا درجہ رکھتا تھا تاوقتیکہ حافظ محمود شیرانی
مصنف 'پنجاب میں اردو' نے اس نظریے کو چیلنج نہیں کیا ۔ لیکن انسان
فطرتی طور پر کچھ قیامت پسند واقع ہوا ہے اور نئے نظریات کو اپنانے
میں ہمیشہ لیت و لعل سے کام لیتا رہا ہے ۔ آج تک بھی یہی حالت ہے
کہ بغیر کسی دلیل کے اسی برج بھاشا سے مشتق ہونے والے نظریے کو
سبقت دی جا رہی ہے اور پنجابی زبان سے مشتق ہونے کے نظریے کو محض
ایک نئے خیال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ۔ اس لیے ضروری ہے کہ
یہاں اس نظریے کا ایک سرسری سا جائزہ لے کر دیکھیں کہ کہاں
تک تحقیق کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے ۔

جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ برج بھاشا نے قدیم
شورسینی سے جنم لیا ۔ گوگنگ و جمن کا دوآب اسی کی حقیقی جنم بھومی
تھا لیکن یہ جلد ہی اس علاقے سے نکل کر آگرہ ، بھرتپور ، گوالیار ،
جے پور ، گڑگاؤں ، علی گڑھ ، بدایوں اور بریلی وغیرہ کے علاقوں
تک پھیل گئی اور یہاں کافی مقبولیت حاصل کر لی ۔ قدیم شعراء اور
موسیقاروں نے اس زبان کو اپنے ادب و فن کی تخلیق کا ذریعہ بنا کر
اسے چار چاند لگا دیے ۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے وقت دہلی کے
گرد و نواح میں اسی زبان کا طوطی بولتا تھا ۔ چونکہ اردو کے بارے
میں شروع میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ اس نے دہلی کے محلات میں جنم
لیا اس لیے بغیر کسی گہری تحقیق کے اس کے ڈانڈے برج بھاشا سے ملا
دیے گئے ۔

جب ہم اردو زبان کی صرف و نحو کا پنجابی اور برج بھاشا کی صرف و نحو سے موازنہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جہاں اردو اور پنجابی کے درمیان گہرا رشتہ موجود ہے وہاں اس کے برج بھاشا سے اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہے مثلاً مصدر بنانے کے لیے اردو اور پنجابی میں فعل کے آخر میں 'نا' کا لاحقہ زائد کرتے ہیں جیسے مار سے مارنا لیکن برج میں اس کے لیے 'بو' 'دو' یا 'نو' کے لاحقے مستعمل ہیں جیسے 'ماربو' وغیرہ۔ اسماء صفت کے لیے اردو اور پنجابی میں صفت کے آخر میں 'ا' زیادہ کرتے ہیں جیسا کہ کالے سے کالا، میٹھے سے میٹھا اور بھلے سے بھلا لیکن برج میں اس کی جگہ واؤ مجہول کا اضافہ کرتے ہیں جیسا کہ کالو، مٹھو اور بھلو وغیرہ۔ واحد سے جمع بنانے کے لیے بھی اردو اور پنجابی میں اشتراک موجود ہے جیسا کہ گھوڑا سے گھوڑے، نار سے ناریاں اور بات سے باتاں۔ برج (قدیم اردو) میں اس کے لیے اکثر 'ن' کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں جیسے گھوڑن، نارن اور باتن وغیرہ۔ فعل مستقبل کے لیے اردو اور پنجابی میں 'گا' کا لاحقہ لگاتے ہیں اور برج میں 'ہوں' کا جیسا کہ اردو اور پنجابی 'ماروں گا' برج 'مارے ہوں'۔ غرضیکہ جہاں اردو اور پنجابی صرف و نحو میں گہرا اشتراک موجود ہے وہاں اردو اور برج کے درمیان بنیادی اختلافات موجود ہیں۔

زیر نظر کاوش میں اسی پہلو کو سامنے رکھ کر راستہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن مزید آگے بڑھنے سے قبل ایک اور منزل طے کرنا باقی ہے۔ اکثر یہ باور کیا جاتا ہے کہ اردو زبان نے سنسکرت اور فارسی کے سنگم سے جنم لیا۔ اگر ایسا ہوتا تو لازماً اردو زبان کا نہ صرف سرمایہ الفاظ ہی بلکہ اس کی صرف و نحو کی بنیادیں بھی انہی دو آریائی الاصل زبانوں پر استوار ہونی چاہئیں تھیں۔ جہاں تک سرمایہ الفاظ کا تعلق ہے وہاں ان کے اثرات سے انکار ممکن نہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان کی صرف و نحو میں باہمی کیا رشتہ ہے۔

لسانی تقسیم

ماہرین لسانیات نے دنیا کی جملہ زبانوں کو ہیئت کے لحاظ سے تین

زمروں میں تقسیم کیا ہے :

اول : انفرادی (Isolating) اس گروہ کی زبانوں میں بنیادی الفاظ کے ساتھ کوئی لاحقے یا سابقے استعمال نہیں کیے جاتے۔ فقرہ بنانے کے لیے الفاظ کو اپنی اصلی صورت میں پہلو بہ پہلو ترتیب دے دیا جاتا ہے جیسے کہ چینی زبان کی ذیل کی مثالوں سے واضح ہے :

(۱) جین تی فانگ زو ('زو' کا لفظ بے معنی ہے اور صرف)
آدمی کا گھر (تکملے کے طور پر استعمال ہوتا ہے)

(ب) چے جین کان چئین ہائی زو
یہ آدمی آنکھ دیکھا بچہ (اس آدمی نے بچہ دیکھا)

نیز اس گروہ کی زبانوں میں اکثر الفاظ یک رکنی ہوتے ہیں جیسے کہ اردو میں جا ، کھا اور لا وغیرہ۔ اس لیے بعض اوقات ان زبانوں کے لیے یک رکنی کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے۔

علماء کے نزدیک یہ زبانیں ارتقاء کی اولین کڑی کا درجہ رکھتی ہیں۔ چینی ، جاپانی اور مشرق بعید کی بعض دوسری زبانیں اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

دوم : تالیفی یا اتصالی (Agglutinative) اولین گروہ ، سامی اور آریائی گروہ کی زبانوں کو چھوڑ کر دنیا کی قریب قریب تمام دوسری زبانیں اسی گروہ میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں بعض دفعہ بنیادی الفاظ کے ساتھ لاحقات کے اتصال سے مطلوبہ معنی حاصل کر لے جاتے ہیں لیکن ان میں بنیادی الفاظ اور لاحقات کو ایک دوسرے سے باآسانی ممیز کیا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ یہ لاحقے مکمل الفاظ کا مخفف ہوتے ہیں اور انفرادی طور پر بھی معنی کے حامل ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات ان لاحقوں کی اصل گم ہو چکی ہوتی ہے اور یہ انفرادی طور پر کوئی معنی نہیں دیتے بلکہ صرف بنیادی الفاظ کے ساتھ لاحق ہونے کے بعد معنی اختیار کرتے ہیں۔

علماء اسے لسانی ارتقاء کی دوسری کڑی شمار کرتے ہیں۔ پاکستان کی بڑی بڑی زبانیں مثلاً اردو، پنجابی، سندھی اور بنگالی وغیرہ اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی طرح بھارت کی قدیم زبانیں مثلاً دراوڑی، منڈا اور ناگا قبائل کی زبانیں بھی اسی گروہ میں شامل ہیں۔

ماہرین کا ایک بڑا طبقہ برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں کو ہند آریائی گروہ کی شاخیں قرار دیتا ہے حالانکہ ایک نظر دیکھنے ہی سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ ان کی پیٹ کا آریائی گروہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ بنیادی طور پر یہ دراوڑی گروہ کی زبانوں سے مطابقت کھاتی ہیں جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے :

(۱) کناری : اوپاری باہلا بھاگ ونا

پنجابی : اوہ پاری باہلا بھاگوان اے

اردو : وہ بیوپاری بہت امیر ہے

کناری : ہنڈیا میاے ساہی مادو

پنجابی : ہنڈی تے سمہی پادیو

اردو : چیک پر دستخط کر دو

(ب) تلگو : پیٹی کو بیگام دئی

پنجابی : پیٹی نوں (ملتانى: کٹو) جنڈرا لا دئیو

اردو : پیٹی (صندوق) کو تالا لگا دو

تلگو : ای باٹ ایکاڈے کی پوتوندى

پنجابی : ایہ واٹ کتھے (ملتانى: کدائیں) پچوندى اے

اردو : یہ راستہ کدھر پہنچاتا ہے

سوم : تصریفی (Inflectional) سامی، آریائی اور بعض قدیم امریکی

زبانیں مثلاً ایڈٹیک وغیرہ اسی گروہ کی بڑی شاخیں ہیں۔

انہیں زبانوں کے ارتقاء کے سلسلے میں سب سے ترقی یافتہ کڑی

قرار دیا جاتا ہے۔ ان زبانوں میں کفایت لسانی اور سہل لسانی کے

عمل کی ہدولت لاحقوں اور سابقوں کی صورت اس حد تک مسخ ہو چکی ہے کہ ان کی اصل کا صحیح طور پر پتہ لگانا ناممکن ہے اسی طرح حذف و انجذاب کے زیر اثر لاحقات مادہ کے ساتھ اس طرح شیر و شکر ہو چکے ہیں کہ ان کا آپس میں ممیز کرنا مشکل ہے کہ اس میں مادہ کون سا ہے اور لاحقہ کون سا جیسے کہ سنسکرت کی ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے :

دادمس (اوستائی : دادے ہی) : فعل حال جمع متکلم بمعنی ہم دیتے ہیں -

داتا (اوستائی : داستا) : فعل حال جمع مخاطب بمعنی آپ دیتے ہیں -

ان الفاظ میں فاعل (جمع متکلم اور جمع مخاطب) ، فعل ، امدادی فعل اور جمع کی علامت آپس میں اس طرح مدغم ہو چکی ہیں کہ ان کا صحیح طور پر تجزیہ کرنا ناممکن ہے - یاد رہے کہ میں ضمیر جمع متکلم کے لیے 'وایام' اور جمع مخاطب کے لیے 'یویام' کے الفاظ مروج ہیں جن کا 'دادمس' اور 'داتا' کے مرکبات میں کہیں سراغ نہیں ملتا - اس کے برعکس اردو زبان میں فقروں کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے جیسے کہ ذیل کی مثال سے واضح ہے :

ہم دیتے ہیں -

ہ : ضمیر متکلم واحد کی علامت (پراکرت : آہاں اور اپ بھرنش : ہوں)

م : علامت جمع (پراکرت : ن)

دے : مادہ (دینا مصدر سے)

ت : علامت فعل حال

ے : علامت جمع

ہے : امدادی فعل (ہونا مصدر سے)

ن : علامت جمع (پراکرت : ن)

اسی طرح سے دراوڑی زبانوں میں بھی فقرے کے ہر حصے کا تجزیہ

کیا جا سکتا ہے - یہاں ہم دراوڑی گروہ کی کناری زبان سے مثال پیش کرتے ہیں :

(۱) اوانو تَنو تیدانے (اوانو تَنو تیدانے) بمعنی وہ کھا رہا ہے

اوا : علامت ضمیر واحد غائب

نو : علامت مذکر

تَنو : فعل بمعنی کھانا

تیدانے : فعل حال نا تمام کی علامت

(ب) نانُو : نیرُو کڈیو تینے (نانو نیرُو کڈیو تینے) میں پانی پیتا ہوں

نا : علامت ضمیر واحد متکلم

نو : علامت مذکر

نیرُو : مفعول

کڈیو : فعل بمعنی پینا

تینے : علامت فعل حال

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان نہ تو زبانوں کے تصریفی گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور نہ ہی ہیئت کے لحاظ سے اسے آریائی گروہ کی شاخ قرار دیا جا سکتا ہے - اس کے برعکس واضح طور پر یہ زبانوں کے تالیفی گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا ڈھانچہ برصغیر کی قدیم زبانوں کے دراوڑی گروہ سے مطابقت کھاتا ہے -

سنسکرت ، فارسی اور اردو

سنسکرت اور فارسی دونوں آریائی الاصل زبانیں ہیں - تقابلی صرف ونحو کی رو سے یہ تصریفی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں - اس کے برعکس گو اردو زبان کو سنسکرت کی ایک شاخ قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ تالیفی ہونے کی بناء پر اس سے بنیادی طور پر مختلف ہے - ذیل میں ہم تین

نمائندہ آریائی زبانوں کی گردان کا اردو زبان کی گردان سے موازنہ پیش کرتے ہیں تاکہ واضح ہو سکے کہ بنیادی طور پر ان میں کس حد تک اختلاف موجود ہے :

دادن مصدر سے فعل حال کی گردان

فارسی =	مے دھد	مے دھند	مے دھی
	مے دھید	مے دھم	مے دھیم
سنسکرت =	داداتی	دادتی	داداسی
	داتا	دادامی	دادمس
یونانی =	دیداسی	دیدآسی	دیداس
	دیداتی	دیدامی	دیدامن
اردو =	وہ دیتا ہے	وہ دیتے ہیں	تو دیتا ہے
	تم دیتے ہو	میں دیتا ہوں	ہم دیتے ہیں

جہاں اردو اور فارسی میں صرف چھ صیغے ہیں وہاں سنسکرت میں تشبیہ کے تین صیغے ملا کر کل نو صیغے ہوتے ہیں۔ یونانی میں حاضر اور غائب کے تشبیہ کے صیغے ملا کر آٹھ صیغے ہوتے ہیں۔

تذکیر و تانیث

سنسکرت میں تذکیر و تانیث کا جنس کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہیں بلکہ یہ محض ایک رسمی حیثیت کی حامل ہے جیسا کہ اردو میں ہم دکھ کو مذکر اور اسی معنوں میں تکلیف کو مؤنث گردانتے ہیں۔ سینا (فوج) جو کہ صرف مردوں پر مشتمل ہوتی ہے صرف آخری 'الف' کی بناء پر جو کہ سنسکرت میں تانیث کی علامت ہے مؤنث تسلیم کی جاتی ہے اور پنگھٹ جہاں کہ صرف عورتوں کا جمگھٹ ہوتا ہے مذکر شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی چیز کا نام مذکر، مؤنث یا لا جنس ہو سکتا ہے جیسا کہ کنارے کے لیے تٹ (مذکر)، تٹی (مؤنث) اور تٹو (لاجنس) سے کوئی بھی لفظ استعمال کیا جا سکتا۔ چھلنی کے لیے تتو (مذکر)، چالنی (مؤنث) اور پریپون (لاجنس) کے الفاظ موجود ہیں۔ جہاں

تک کہ موقعہ محل کے مطابق بیوی کے لیے بھی دار (مذکر) ، جایا (مؤنث) اور کلنتر (لاجنس) میں سے کوئی بھی لفظ استعمال ہو سکتا ہے ۔ دار کا لفظ ہمیشہ عزت کے لیے بولا جاتا ہے جیسا کہ اردو میں کہہنی بہادر ، ملکہ بہادر ، اور ہم صاحب وغیرہ کے لیے صیغہ مذکر استعمال ہوتا ہے ۔ اسی طرح اکثر کسی قابل عزت عورت کو مخاطب کرتے وقت ہم بجائے 'آپ کہتی ہیں' کے 'آپ کہتے ہیں' استعمال کرتے ہیں ۔ کلنتر کا لفظ بیوی بطور عزت استعمال ہوتا ہے ۔ آریائی حلقہ کی ایک دوسری شاخ المانوی زبان میں بھی عورت کے لیے 'وئب' کا لفظ موجود ہے جو کہ لاجنس کے صیغہ میں استعمال ہوتا ہے ۔

سنسکرت میں تذکیرو تانیث کا صفت تفضیلی سے بھی کوئی تعلق نہیں جیسا کہ اردو میں قاعدہ ہے کہ چھوٹی چیز کے لیے مؤنث اور بڑی چیز کے لیے مذکر کا لفظ استعمال ہوتا ہے مثلاً پہاڑ پہاڑی ، نالہ نالی اور تختہ تختی وغیرہ ۔ اب سنسکرت میں سرسوتو (مذکر) سمندر کے لیے استعمال ہوتا ہے اور سرسوتی (مؤنث) دریا کے لیے لیکن ساتھ ہی سرسو (مذکر) تالاب کے لیے اور سرسی (مؤنث) جھیل کے لیے ۔ اگرچہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں لیکن عام طور پر سنسکرت میں کسی لفظ کی تذکیرو تانیث کا اندازہ بلا لحاظ جنس کے لفظ کے آخری حرف سے لگایا جاتا ہے ۔ جیسے کہ 'الف' کا لاحقہ مؤنث کی علامت ہے اور 'ی' کے لیے معروف (ی) مذکر کی ۔ اس لیے جہاں کنیا (لڑکی) ، سوسا (بہن) ، پرتیبھا (عکس) اور بھاشا (زبان) مؤنث ہیں وہاں سینا (فوج) بھی مؤنث ہے ۔ اسی طرح جہاں پتی (مالک) ، ابھی (سانپ) اور منی (جوہر) وغیرہ مذکر ہیں وہاں سکھی (دوست) بھی مذکر ہے ۔ خواہ اس سے مراد سہیلی ہو یا دوست اگرچہ آج کل اس کا زیادہ تر استعمال سہیلی کے معنوں میں ہوتا ہے لیکن قدماء اسے مذکر ہی شمار کرتے تھے ۔ واؤ کا لاحقہ مذکر ، مؤنث اور لاجنس تینوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے کہ ششو (لڑکا) ، سیتو (پل) اور مدھو (بہار) مذکر ہیں لیکن مدھو (جب شہد کے معنوں میں استعمال ہو) ، دھینو (گائے) اور وسو (دولت) مؤنث ہیں ۔ تنو (جسم) لاجنس ہے ۔

سنسکرت کو گنگا اور سندھ کی وادی میں قدم رکھے ہوئے جب

کچھ عرصہ گزر جاتا ہے تو اس کے گرامری ڈھانچے میں کچھ تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں جیسے کہ ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ سنسکرت میں عام طور پر صیغہ 'مؤنٹ' کے لیے لفظ کے آخر میں 'الف' کا لاحقہ استعمال ہوتا ہے جیسے ایسرا (پانی میں چلنے والی)، سروپ نکھا (خوبصورت ناک والی)۔ اسی قاعدہ کے مطابق قدیم ہندو عورتوں کے نام سرما، رمبھا، یشودھا، رادھا اور سیتا وغیرہ رکھے جاتے تھے لیکن ایک وقت آنا ہے کہ سنسکرت زبان کے بولنے والے مؤنٹ کے لیے 'الف' کے ساتھ یاٹے معروف (ی) کا استعمال بھی شروع کر دیتے ہیں جیسا کہ سرسوتی، گندھاری، کنتی اور دروپدی وغیرہ اور اسی طرح اندر سے اندرانی اور یم سے یمی وغیرہ۔ اگرچہ قدیم سنسکرت میں لفظ کے بعد یاٹے معروف کا لاحقہ مذکور کی علامت تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ واضح طور پر یہی ہو سکتی ہے کہ اکثر دوسری باتوں کی طرح مؤنٹ بنانے کا یہ طریقہ بھی آریاؤں نے وادی 'سندھ' میں پہلے سے آباد قوموں سے مستعار لیا۔ آج بھی پنجاب کے دیہاتوں میں عورتوں کے نام یاٹے معروف کے لاحقہ کے ساتھ رکھے یا پکارے جاتے ہیں جیسے کہ ہرنامی، سنتی، دلاری، راسی، رچی اور بھاگی وغیرہ اور مردوں کے الف کے لاحقے کے ساتھ ہرناما، سنتا، راما، ملکھا، شیرا اور نورا وغیرہ۔ لیکن جہاں زیادہ تر آریائی تہذیب کا زور رہا ہے وہاں آج بھی عورتوں کے نام 'الف' کے لاحقہ کے ساتھ کملا، شیاما، لیلا اور شانتا وغیرہ رکھے جاتے ہیں اور مردوں کے بنارسی، کاشی، اور ملکھی وغیرہ۔

فارسی صرف و نحو کو لیں تو وہاں بھی کوئی ایسا مسلمہ لاحقہ نظر نہیں آتا کہ جس سے کسی چیز کی تذکیر و تانیث کا پتہ چل سکے۔ کچھ اسماء تو ایسے ہیں کہ جن کی صنف خود ان کے نام سے ظاہر ہے جیسے کہ مادر، پدر، دیوپری اور اسپ مادیاں وغیرہ۔ باقی اسماء کے لیے تذکیر و تانیث کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کے لیے مرد و زن کا لاحقہ زیادہ کرتے ہیں جیسے کہ پیر مرد، پیر زن اور جادوگر مرد، جادوگر زن وغیرہ۔ جانوروں کے لیے نر اور مادہ کا لاحقہ لگاتے ہیں جیسا کہ گرہ نر، گرہ مادہ اور شیر نر، شیر مادہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں جہاں اردو میں اسم کی تذکیر و تانیث کے ساتھ فعل کی صورت بھی بدل جانی ہے

وہاں فارسی میں فعل کی صورت دونوں اصناف کے لیے وہی قائم رہتی ہے -

اردو میں سنسکرت اور فارسی کے برعکس تذکیر و تانیث کے لیے مسلمہ قاعدے موجود ہیں جیسا کہ جس مذکر کے آخر میں 'الف' کا لاحقہ ہو تو اس کی تانیث کے لیے آخر کا 'الف' اڑا کر اس کی جگہ یا ئے معروف (ی) لگاتے ہیں جیسا کہ گھوڑا گھوڑی اور لڑکا لڑکی وغیرہ - اگر مذکر کے آخر میں 'ی' کا لاحقہ ہو تو اسے اڑا کر اس کی جگہ 'ن' زیادہ کرتے ہیں جیسے دھوبی دھوبن اور قریشی قریشن وغیرہ - ان کے علاوہ باقی الفاظ کے لیے ی، نی، یا انی کا لاحقہ زیادہ کرتے ہیں جیسے کہ مرغ سے مرغی، مور سے مورنی، ہاتھی سے ہتھنی اور سید سے سیدانی وغیرہ -

بے جان اشیاء کی تذکیر و تانیث کے لیے اردو میں بھی کوئی قاعدہ کلیہ موجود نہیں جیسے کہ موسم کا لفظ خود مذکر ہے - لیکن مختلف موسموں کے نام مؤنث ہیں جیسے کہ گرمی، سردی، بہار اور برسات وغیرہ - اسی طرح صفت تفضیلی کا بھی اس سے کوئی تعلق نہیں جیسے کہ رتی مؤنث ہے ماشہ اور تولہ مذکر، چھٹانک مؤنث ہے پاؤ اور سیر مذکر اور پھر پنسیری (پانچ سیر) مؤنث ہے اور من مذکر - اسے گزرے ہوئے دور میں سنسکرت سے گہرے تعلقات کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے - اگرچہ اردو میں یہاں بھی ایک خاص قاعدہ کار فرما نظر آتا ہے اور وہ ہے لفظی مشابہت - جاندار مذکر الفاظ کے مشابہ بے جان اشیاء اکثر مذکر کہلاتی ہیں جیسے کہ گھنٹہ، ماشہ، محلہ، دریا اور پودا وغیرہ - اس کے مقابلے میں گھڑی، پنسیری، گلی اور ندی وغیرہ مؤنث شمار کی جاتی ہیں -

واحد جمع

سنسکرت میں اپنی مغربی بہن قدیم یونانی اور کئی ایک سامی الاصل زبانوں کی طرح واحد اور جمع کے ساتھ تشبیہ کا صیغہ بھی موجود ہے - تشبیہ کے صیغہ کا اردو میں عدم استعمال بھی اسے سنسکرت سے خاص طور پر ممیز کرتا ہے - دنیا کی اکثر قدیم زبانوں میں جمع کے ساتھ تشبیہ کا صیغہ بھی موجود ہے - یہ امر ہمیں تاریخ کی ان

گہرائیوں تک لے جاتا ہے جہاں کہ زبان ابھی اپنے عہد طفلی میں پرورش پا رہی تھی اور اس کی ہیئت انسان کے محض ذاتی اور نزدیکی مشاہدات کی مرہون منت تھی۔ اس وقت انسان کے لیے 'ایک' کے ساتھ 'دو' کا عدد بھی ایک مسلمہ اکائی کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ جب وہ روزمرہ کے مشاہدہ میں اپنے یا عزیز واقارب کے جسم پر نظر ڈالتا تھا تو اسے آنکھ، ناک، کان، ہونٹ، پستان، ہاتھ، اور پاؤں وغیرہ سب دو دو ہی نظر آتے تھے اور یہی حالت اس کے ماحول کی بھی تھی جہاں کہ چرندوں اور پرندوں کے سینگ، بازو، آنکھ اور کان وغیرہ کی بھی یہی صورت تھی۔ لا محالہ اس کے لیے دو کا عدد جمع کے عدد سے ایک بالکل الگ اور مختلف شے تھی جس کے اظہار کے لیے اسے ایک نئی اصطلاح کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی قدیم سامی اور آریائی الاصل زبانوں میں واحد اور جمع کے ساتھ تثنیہ کا صیغہ بھی موجود ہے۔ اگرچہ اب اس کا استعمال دن بدن متروک ہوتا جا رہا ہے اور دنیا کی اکثر زبانیں اسے بالکل ترک کر چکی ہیں۔

تذکیر و تانیث کی طرح سنسکرت میں واحد اور جمع کے صیغہ میں بھی کئی ایک عجیب و غریب خصوصیتیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر تین سے لے کر انیس تک کے اعداد کے لیے ہمیشہ جمع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اور تذکیر و تانیث کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتا یعنی پندرہ آدمیوں (مذکر) کے لیے پنجد شاپرشا کہیں گے اور پندرہ فوجوں (مؤنث) کے لیے پنجد شامینانی۔ لیکن بیس سے لے کر نوے تک کے اعداد کے لیے ہمیشہ صیغہ واحد مؤنث استعمال ہوتا ہے جیسے کہ 'میرے لیے اکیس آم لاؤ' کا ترجمہ بجائے 'اک ہشتی امرا (مذکر) معانیہ' کے 'اک ہشتمو امرانی (مؤنث) معانیہ' کریں گے۔ اسی طرح صیغہ واحد متکلم کے بجائے جمع متکلم کے صیغہ کے استعمال کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یعنی اپنے لیے بجائے 'اہمو' (میں) کے 'ویامو' (ہم) استعمال کیا جاتا ہے جب کہ اردو میں بڑا آدمی ہی اس استحقاق کو استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس نچلے طبقے کے لیے حقارت کے طور پر زیادہ تعداد کے لیے بھی واحد کا صیغہ ہی استعمال ہوتا ہے۔

جمع بنانے کے لیے اکثر واؤ کا لاحقہ زائد کرتے ہیں مثلاً کرتن (بیوقوف) سے کرتنو، افس (پانی) سے افسو اور بدہ (جنگ) سے بدھو۔ اگر آخر میں 'الف' ہو تو اسے حذف کر کے واؤ لگاتے ہیں جیسے دشا (سمت) سے دشو وغیرہ۔

فارسی میں بھی اس وقت اردو کی طرح صرف واحد اور جمع کے دو صیغے ہیں۔ اگرچہ اوستائی میں باقی آریائی حلقہ کی زبانوں کی طرح تشبیہ کا صیغہ موجود تھا لیکن اب جدید یونانی کی طرح اس کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔

واحد سے جمع بنانے کے لیے جاندار اسماء کے آخر میں 'ان' زیادہ کرتے ہیں جیسے کہ مرد سے مردان، زن سے زناں اور سگ سے سگاں وغیرہ۔ اگر واحد کے آخر میں ہائے مختلفی موجود ہو تو اسے حذف کر کے 'گان' لگا دیتے ہیں جیسے بندہ سے بندگان، بچہ سے بچگان اور کشتہ سے کشتگان وغیرہ۔ اگر واحد کے آخر میں 'الف' یا 'واؤ' ہو تو 'یاں' زیادہ کرتے ہیں جیسے دانا سے دانایاں اور خو برو سے خو برویاں وغیرہ۔

بے جان اسموں کی جمع بناتے وقت واحد کے آخر میں ہا لگاتے ہیں جیسے قلم ہا، صندلی ہا وغیرہ۔ اگر واحد کے آخر میں ہائے مختلفی ہو تو 'ہا' لگانے سے پہلے اسے حذف کر دیتے ہیں جیسے خامہ سے خامہا اور نامہ سے نامہا وغیرہ لیکن اگر آخر میں ہائے ملفوظی ہو تو حذف نہیں کرتے جیسے زرہ سے زرہ ہا اور کلاہ سے کلاہ ہا۔ بعض اوقات واحد کے آخر میں ہائے مختلفی ہونے پر 'جات' زیادہ کرتے ہیں جیسے قلعہ جات اور نقشہ جات وغیرہ۔ بعض فارسی الفاظ کی جمع عربی قاعدہ سے بھی بناتے ہیں مثلاً بیگم سے بیگمات، مکان سے مکانات وغیرہ۔

فی زمانہ جدید فارسی میں جمع بنانے کے لیے جاندار یا بے جان کی تمیز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے 'ہا' کے استعمال کی طرف زیادہ رجحان ہے جیسے کہ درخت ہا، ایرانی ہا، کوچہ ہا، اور بچہ ہا وغیرہ۔

اردو میں فارسی کے برعکس مذکر اسم کے آخر میں اگر 'الف' یا 'ہ' ہو تو جمع بنانے کے لیے یا ئے مجہول (ے) سے بدل دیتے ہیں جیسے گھوڑا

سے گھوڑے، لڑکا سے لڑکے، تولہ سے تولے - جس اسم کے آخر میں 'اں' ہو تو جمع بناتے وقت 'الف' کو یاٹے مجہول اور ہمزہ سے بدل دیتے ہیں جیسے دھواں سے دھوائیں اور کنواں سے کنوائیں۔ اگر مذکر کے آخر میں 'الف' یا 'ہ' نہ ہو تو واحد اور جمع دونوں میں وہی شکل رہتی ہے جیسے دس میل، پندرہ سیر اور چالیس گز وغیرہ۔

مؤنث اسموں کی جمع کے لیے اگر اسم کے آخر میں 'یا' ہو تو نون غنہ زیادہ کرتے ہیں جیسے گڑیا سے گڑیاں، چڑیا سے چڑیاں۔ اگر آخر میں یاٹے معروف (ی) ہو تو 'اں' زیادہ کرتے ہیں جیسے مرغی سے مرغیاں، قینچی سے قینچیاں اور کلی سے کلیاں۔ اگر آخری حرف 'الف' یا واؤ ہو تو 'ئیں' زیادہ کرتے ہیں جیسا کہ ہوائیں، دوائیں اور خوشبوئیں وغیرہ۔ اگر آخر میں مذکورہ بالا حروف میں سے کوئی نہ ہو تو 'یں' زیادہ کرتے ہیں جیسے کہ کتابیں، قلمیں اور بہنیں وغیرہ۔

غیر ملکی الفاظ کی جمع ان کی اردو الفاظ سے مشابہت کی بنا پر بناتے ہیں جیسا کہ الماری سے الماریاں، گرجا سے گرجے، میز سے میزیں اور نب سے نبیں وغیرہ۔

گرامری تفاوت

واضح رہے کہ اردو زبان کا صرف و نحو کے لحاظ سے فارسی اور سنسکرت سے نہ صرف فروعی بلکہ اصولی اور بنیادی طور پر اختلاف ہے۔ یہ بات کسی طرح ذہن میں نہیں آتی کہ ایک زبان کی شاخ اس سے اتنی مختلف ہو۔ دنیا کی زبانوں کی تاریخ میں ہمیں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ اگر محض لغوی اشتراک کو ہی زبانوں کے باہمی رشتے کا معیار قرار دے دیا جائے تو فارسی اور ہسپانوی زبانوں میں عربی الاصل الفاظ کا اتنا حصہ موجود ہے کہ انہیں بجائے آریائی الاصل ہونے کے سامی زبانوں کی شاخیں قرار دیا جا سکتا ہے خاص کر جب کہ فارسی زبان کا تو نہ صرف سرمایہ الفاظ ہی بلکہ ایک حد تک اس کی صرف و نحو بھی عربی زبان سے متاثر ہے اور اس کا رسم الخط بھی سامی ہے۔ اگر فارسی

اور ہسپانوی کر لغوی اور دیگر پہلوؤں میں مشابہت کی بناء پر سامی زبان کی شاخیں نہیں مانا جاتا تو پھر اردو زبان کو محض لغوی مطابقت کی بناء پر کس طرح سنسکرت یا آریائی زمرہ کی شاخ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر فارسی اور ہسپانوی میں عربی اور اردو میں فارسی الفاظ کا عنصر مسلمان حملہ آوروں کا مریون منت ہے تو پھر اردو زبان میں سنسکرت الاصل الفاظ کی موجودگی کو آریائی قبائل کے ورود کا نتیجہ قرار دینے میں کونسا امر مانع ہے۔ اردو اور سنسکرت کی صرف و نحو کے اس تفاوت مگر باہمی لغوی مطابقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مشہور ماہر لسانیات مسٹر جارج گریسن کو اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'ہندوستان کا لسانی جائزہ' (Linguistic Survey of India) میں یہ کہنا پڑا کہ :

”ہندوستانی (اردو) سنسکرت سے نہیں بلکہ سنسکرت سے ماتی جلتی کسی دوسری آریائی زبان سے نکلی ہے جس کا کہ اب کوئی نشان ہمارے سامنے موجود نہیں۔ اگر ہم ہندوستانی اور سنسکرت کے باہمی رشتے کا اظہار کرنا چاہیں تو یہ اس طرح ہو گا کہ سنسکرت اور ہندوستانی کی جد امجد آپس میں بہنیں تھیں۔ پراکرت جو کہ ہندوستانی کی ماں ہے وہ سنسکرت کی بہن کی لڑکی یعنی بھانجی ہے۔“

آگے چل کر ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں کہ :

”سنسکرت صد ہا سال سے ہندوستانی زبان کو گہرے طور پر متاثر کرتی رہی ہے لیکن ان اثرات کا نتیجہ صرف لغوی پہلو ہی میں نمایاں ہے۔ گرامری پہلو اس سے شہہ بھر بھی متاثر نہیں ہوا یا پھر وہ اثرات اتنے کم اور غیر اہم ہیں کہ انہیں باسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔“

لیکن باوجود اس کے گریسن اپنے عہد کی رائے عامہ سے دامن نہیں بچا سکے اور انہوں نے اس صرف و نحو کے اختلاف میں بھی تطبیق کی ایک راہ تلاش کر لی اور اردو زبان کو سنسکرت کی بجائے اس کی کسی نا معلوم ہم عصر آریائی زبان سے مشتق قرار دے کر اپنے زمانہ کے ہمہ گیر

نظریات کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ حالانکہ یہ نظریہ حقائق و شواہد کی کسوٹی پر کسی طرح پورا نہیں اترتا۔

ہڑپہ کی طرف

جب یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ اردو زبان کا سرچشمہ نہ تو سنسکرت ہے اور نہ فارسی تو ایک صدیوں پرانا مفروضوں کا فلک بوس محل آن واحد میں زمین پر آ رہتا ہے اور ہمارے سامنے میدان پھر خالی کا خالی رہ جاتا ہے۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ جاتا کہ ہم نئی بنیادوں پر ایک نئی عمارت کھڑی کریں لیکن اس کے لیے اینٹ مسالا کہاں سے آئے سوائے اس کے کہ کھنڈرات سے تلاش کر کے جو کام کی چیز نظر آئے اکٹھی کر لیں لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں کیونکہ انقلابات زمانہ نے ان آثار کو جو کہ اس پہلو میں مدد و معاون ثابت ہو سکتے تھے پیس کر اتنا مہین کر دیا ہے اور طوفان حوادث نے انہیں اس طرح سے بکھیر دیا ہے کہ بظاہر انہیں اکٹھا کر کے کسی واضح شکل میں لانا محال نظر آتا ہے۔

سنسکرت اور فارسی کے بعد کوئی ایسی غیر ملکی زبان میدان میں نہیں رہ جاتی کہ جسے اردو زبان کی اصل کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ اس لیے لا محالہ ہمیں برصغیر کی قدیم زبانوں کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ جب ہم اردو زبان کے لغوی سرمایے اور صرف و نحو کا موازنہ برصغیر کی موجودہ زبانوں سے کرتے ہیں تو جو زبان اس کے سب سے زیادہ نزدیک نظر آتی ہے وہ پنجابی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا کہ صرف و نحو کے لحاظ سے پنجابی کے علاوہ کوئی دوسری زبان اردو سے گہری مطابقت نہیں رکھتی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیادیں وادی سندھ ہی میں استوار ہوئی ہیں اور اس کا سلسلہ نسب پنجابی، اپ بھرنش اور مقامی پراکرت سے ہوتا ہوا قدیم ہڑپائی عہد کی زبان سے جا ملتا ہے جو کہ آریاؤں کی آمد سے قبل وادی سندھ میں مروج تھی۔

اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ ہڑپائی تہذیب کے دور میں یہاں کونسی زبان مروج تھی اور برصغیر کی قدیم زبانوں کے کون سے کنبے

سے تعلق رکھتی تھی - زیر نظر کاوش میں اسی سوال کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اگرچہ اس خاکہ میں رنگ بھر کر اس کے خد و خال کو پوری طرح اجاگر کرنے کے لیے ابھی وقت درکار ہے -

اردو زبان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے مندرجہ ذیل موضوعات زیر غور ہیں جن پر بشرط زندگی تفصیلی بحث کرنے کا ارادہ ہے - زیر نظر کاوش میں ان میں سے بعض موضوعات کا صرف اجمالی سا خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے :

- ۱ - زبان کے اشتقاقی پہلو
- ۲ - بڑپہ سے پہلے (ایک لسانی مطالعہ)
- ۳ - بڑپائی تہذیب کا لسانی جائزہ
- ۴ - بڑپائی تہذیب کے لسانی رشتے
- ۵ - سنسکرت اور آریائی زبانیں (ایک تقابلی جائزہ)
- ۶ - اردو زبان کا پراکرتی دور
- ۷ - وادی سندھ اور ترکی و تاتاری زبانیں
- ۸ - وادی سندھ کی زبان پر یونانی اثرات
- ۹ - وسط ایشیا کے پاکستانی نو آبادکار (ایک لسانی مطالعہ)
- ۱۰ - ہارے چپسی بھائی
- ۱۱ - اردو عہد اسلامی میں
- ۱۲ - پاکستان کا مشترکہ لسانی ورثہ
- ۱۳ - پنجابی ، دکنی اور اردو
- ۱۴ - اردو زبان عہد فرنگ میں
- ۱۵ - دور حاضر میں اردو زبان کی تعلیم و ترویج کے مسائل
معاون کتابیں :
- ۱۶ - وادی سندھ کی تہذیب نئے زاویوں سے
- ۱۷ - وادی سندھ کا تہذیبی ورثہ
- ۱۸ - Urdu Language Through The Ages
- ۱۹ - The Prehistory of The Punjabi Language

یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے کہ میں اس عظیم کام سے کس حد تک عہدہ برآہو سکوں گا اور آیا میں ان موضوعات سے پورا پورا انصاف بھی کر سکوں گا یا نہیں - یہاں میں صرف اپنے خلوص اور محنت کا عہد کر سکتا ہوں -

ہٹ پر سے پہلے

(ایک لسانیاتی مطالعہ)

سلام اس دھرتی کو

جہاں غلہ، چاول اور جو میسر ہیں

جہاں پانچ قومیں آباد ہیں

جو بارشوں کی وجہ سے سرسبز و شاداب ہے

(اتھروید)

اتھروید میں ہی ایک دوسری جگہ دشمن کے شر سے محفوظ رہنے کے

لیئے یہ دعا مرقوم ہے :

وہ (یعنی دشمن) تین منزلیں دور چلا جائے

وہ پانچ قوموں کی سرزمین سے بھی آگے چلا جائے

وہ تین فضاؤں (لوک) سے بھی آگے چلا جائے

جہاں سے کہ وہ اس وقت تک نہ لوٹ سکے

جب تک کہ آکاش کی بلندیوں میں سوریا دیوتا جلوہ فگن ہے

رگ وید میں سپت سندھو بمعنی سات دریاؤں کی سرزمین یعنی

موجودہ پنجاب کو پنچ جنیا کرشٹی (بمعنی پانچ قوموں کی سرزمین) کا

نام دیا گیا ہے۔ رگ وید ہی میں مترا دیوتا کی حمد میں یہ الفاظ استعمال

کیئے گئے ہیں :

پانچ قوموں نے ہمارے محافظ مترا دیوتا کے سامنے اپنے سرنگوں

کر دیے۔

وہی تمام دیوتاؤں کی سہائتا کرنے والا ہے۔

مفسروں نے ان پانچ قوموں کے بارے میں مختلف توضیحات کی ہیں۔

بہر حال اس سے یہ امر واضح ہے کہ آریاؤں کی آمد کے وقت وادی سندھ

میں کئی ایک قومیں یا نسلیں آباد تھیں - ہڑپہ ، موئن جو دڑو اور اس عہد سے تعلق رکھنے والے دیگر کھنڈرات کی کھدائیوں کے دوران جو ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں ان کے بارے میں ماہرین علم الکاسیات کی تحقیق اس نظریہ کی تائید کرتی ہے اور ماہرین نسلیات اور تاریخ دان حضرات بھی اس امر پر صاد کرتے ہیں -

آریاؤں کی آمد سے قبل برصغیر پاک و ہند میں کولاری اور دراوڑی اقوام کا دور دورہ تھا اور کوہ پھالیہ کے دامن میں منگولی نسل کے قبائل آباد تھے - یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ آریاؤں کی آمد کے وقت وادی سندھ میں دراوڑی قبائل کو بالا دستی حاصل تھی - درحقیقت آریاؤں کی طرح دراوڑی قبائل بھی یہاں کے حقیقی باشندے نہ تھے بلکہ آریاؤں کی آمد سے کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار سال قبل یہاں وارد ہوئے تھے - عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ منڈا قبائل برصغیر کے قدیم ترین باشندے ہیں اور دراوڑوں کی آمد سے قبل یہاں آباد تھے -

ماہرین منڈا قبائل کو قدیم آسٹریلوی نسل سے منسلک قرار دیتے ہیں جو کہ ایک وقت میں نیوزی لینڈ سے لے کر پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی - برصغیر کا منڈا گروہ کول ، بھیل ، سنتھال ، منڈا ، ساورا ، ہو ، کوروا ، جانگ اور کورکو وغیرہ قبائل پر مشتمل ہیں - ماہرین آثار قدیمہ نے وادی سندھ کی قدیم تہذیب کو چار مختلف

ادوار میں تقسیم کیا ہے - اول امری نال تہذیب ، دوم ہڑپائی یا دراوڑی تہذیب ، سوم جھنگر تہذیب اور چہارم جھکار تہذیب - ان میں امری نال تہذیب کو سب پر سبقت حاصل ہے - اس تہذیب کے بارے میں اپنے ایک مضمون 'امری نال تہذیب' (امروز ، لاہور ، جون ، جولائی ۱۹۶۴ء دو اقساط) میں تفصیلی بحث کر چکا ہوں - یہاں ہم اس کے نمایاں خدوخال کے ذکر پر ہی اکتفا کریں گے -

بیسویں صدی کے اوائل میں جب ماہرین آثار قدیمہ کی کاوشوں کے طفیل ہڑپہ ، موئن جو دڑو اور دیگر مقامات پر برصغیر کی آریاؤں سے قبل کی تہذیب کے آثار برآمد ہوئے تو محکمہ آثار قدیمہ نے اس تہذیب کی

گم گشتہ کڑیوں کی تلاش میں موجودہ مغربی پاکستان ، بھارتی پنجاب ، راجستھان ، گجرات اور کائھیاواڑ کے علاقہ میں اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ اس کے نتیجے میں کئی ایک مقامات پر ہڑپائی تہذیب سے بھی قدیم تہذیب کے آثار سامنے آئے جن میں موئن جو دڑو کے قریب واقع 'آمری' اور بلوچستان میں 'نال' کے مقامات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی بناء پر اسے 'آمری نال تہذیب' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں کوٹ دیچی کے آثار کی دریافت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس تہذیب کے آثار سندھ اور بلوچستان کے علاوہ بھارتی پنجاب میں روپڑ ، راجستھان میں کالی بنگن اور گجرات میں لوتھل کے مقامات سے برآمد ہوئے ہیں۔ ہر جگہ اس کے آثار ہڑپائی تہذیب کے آثار سے نچلی سطح پر پائے گئے ہیں جس سے لامحالہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ 'آمری نال تہذیب' کو ہڑپائی تہذیب پر سبقت حاصل ہے۔

گو 'آمری نال تہذیب' کی ابتداء ماضی کے دھندلکوں میں جا کر گم ہو جاتی ہے لیکن اس کی آخری منازل کے آثار تقریباً ۲۰۰۰ و ۲۰۰۰ ق م تک موجود ملتے ہیں جس کے بعد یہ ہڑپائی تہذیب میں مدغم ہو جاتی ہے۔ اس کا ابتدائی دور ہجری عہد سے تعلق رکھتا ہے لیکن آخری مراحل میں کانسی کے عہد کے آثار بھی سامنے آئے ہیں جنہیں ہم غالباً ہڑپائی تہذیب سے تعلقات کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس دور میں ابھی تک فن تحریر نے جنم نہیں لیا تھا اور فن تعمیر میں بھی پختگی نہیں آئی تھی۔ مکانوں کی بنیادوں کے لیے بعض جگہ پتھر استعمال ہوا ہے لیکن دیواریں عام طور پر مٹی یا خام اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہیں۔

ان آثار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ عام طور پر گلہ بانی ، شکار اور چھوٹے پیمانے پر کاشتکاری کے ذریعے گزر اوقات کرتے اور چھوٹی چھوٹی بستیاں بنا کر رہتے تھے۔ صنعت و حرفت کے پہلو میں کوزہ گری ، منکہ سازی اور کھلونے بنانا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس عہد کے ہتھیاروں اور اوزاروں میں کلہاڑی کے پھل ، نیزوں کی انیاں ، بسولی نما سلاخیں (پنجابی اور منڈاری : سبیل) اور آرے شامل ہیں۔ اس دور میں تجہیز و تکفین کی دو مختلف صورتیں سامنے آئی ہیں۔ ایک صورت میں مردے کو اس کی صحیح حالت میں دفنایا گیا ہے اور جسم

کے زیورات کے سوا ان مدفنوں سے اور کوئی شے برآمد نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس دوسری صورت میں مدفنوں سے بجائے مکمل ڈھانچوں کے صرف ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں۔ کسی میں ایک انسان کی کسی میں زیادہ کی لیکن ان مدفنوں میں ضروریات زندگی کی اشیاء بھی ساتھ دفن شدہ دستیاب ہوئی ہیں جو آج ہمیں اس تہذیب کا جائزہ لینے میں مدد و معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ مدفنوں کے اس اختلاف سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہڑپہ اور موئن جو دڑو کی دراوڑی تہذیب سے قبل بھی یہاں کم از کم دو مختلف نسلیں ایک دوسرے کے دوش بدوش آباد تھیں۔

کیا ماہرین تاریخ کے اس نظریہ کو کہ برصغیر میں دراوڑی قوم کی آمد سے قبل یہاں منڈا قبائل آباد تھے ماہرین آثار قدیمہ کے اس نظریہ سے تطبیق دی جا سکتی ہے کہ ہڑپائی تہذیب سے قبل یہاں 'آمری نال تہذیب' کا دور دورہ تھا۔ جہاں تک ہڑپائی تہذیب کا تعلق ہے اسے دراوڑی تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں۔ سرجاہن مارشل (John. Marshall)، ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ ہال، جناب ولیم ولسن ہنٹر (W. W. Hunter) اور دیگر کئی ایک صاحب الرائے حضرات اس نظریہ کے حامی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر منڈا قبائل کو دراوڑی گروہ کے پیشرو تسلیم کیا جاتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ 'آمری نال تہذیب' کو ان قبائل سے منسوب نہ کیا جائے۔ خاص کر جب کہ ماہرین کاسیاست ان کھنڈرات سے ملنے والے انسانی ڈھانچوں کو قدیم آسٹریلوی نسل سے مطابقت رکھنے والے قرار دیتے ہیں اور ماہرین نسلیات منڈا قبائل کو بھی اسی گروہ سے منسلک تسلیم کرتے ہیں۔ اس امر کی مزید وضاحت کے لیے ہم عمرانیات اور لسانیات کے مطالعے سے مدد لیں گے۔

فی زمانہ منڈا قبائل بھارت میں راجستھان سے لے کر بہار تک پھیلے ہوئے ہیں۔ خاص کر وسط ہند ان کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ قبائل اکثر تہذیب و تمدن کی دنیا سے دور گھنے جنگلات میں آباد ہیں۔ مشہور ماہر لسانیات سرجارج گریسن کا قول ہے کہ ایک وقت میں منڈا گروہ کا دائرہ عمل ان کی موجودہ آبادی کی نسبت بہت وسیع ہو گا۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے پیشتر ہی یہ قبائل دراوڑی گروہ سے مغلوب ہو چکے تھے اس لیے آریائی قبائل

کو وادی 'سندھ میں وارد ہونے پر زیادہ تر دراوڑوں ہی سے واسطہ پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دراوڑی زبانوں نے نو واردوں کی زبانوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں وہاں منڈا گروہ کی زبانیں اس پر کوئی قابل ذکر اثر نہیں ڈال سکیں۔ بقول سر جارج گریسن اس زمرہ کے صرف چند ایک الفاظ ہی قدیم سنسکرت میں ملتے ہیں جیسے کہ پانی، کپاس، کپاس کا کپڑا اور بانس کے تیر (سار) یا پھر بعض جغرافیائی نام ہیں جیسے کہ کوشل، تسلا، کالنگا وغیرہ۔ گنتی میں بیس کی اکائی 'کوڑی' کا استعمال بھی منڈا قبائل سے ہی مستعار ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا منڈا گروہ سے تعلق رکھنے والے قبائل کبھی وادی 'سندھ میں بھی آباد تھے گو 'آمری نال تہذیب' کے آثار سے برآمد شدہ آسٹریلوی نسل سے مطابقت رکھنے والے انسانی ڈھانچے زبان حال سے اس امر کی گواہی دے رہے ہیں لیکن ممکن ہے کہ موجودہ دور کا متجسس انسان اس بارے میں شک و شبہ کا اظہار کرے اس لیے ہم آج اس سوال کے حل کرنے میں وادی 'سندھ اور منڈا گروہ کی موجودہ زبانوں کے تقابلی جائزے اور ان کے مروجہ رسم و رواج کے موازنے سے مدد لیں گے کیونکہ اگر منڈا قبائل کسی دور میں بھی یہاں آباد رہے ہوں گے تو یہاں ان کے لسانی عنصر اور کسی حد تک شادی غمی کے رسم و رواج کے اثرات کا موجود ہونا لازمی امر ہے۔ تاریخ کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر یہاں منڈا قبائل دراوڑوں سے بھی پہلے آباد تھے تو اس زمانے کو کم از کم پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ بیت چکا ہے۔ اس طویل عرصے میں یہاں مختلف تہذیبوں اور زبانوں کی لہریں ہی نہیں بلکہ لامتناہی ریلے آتے رہے جن میں سے ہر ایک طوفان میں یہی نظر آتا تھا کہ وہ سابقہ روایات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا لیکن انسان کی فطری قدامت پسندی کے طفیل یہاں آج بھی ایسے رسم و رواج اور لسانی عناصر موجود ہیں جو کہ ان طوفانوں اور سیلابوں کی یورشوں سے محفوظ و مصئون رہے اور آج ہم ان سے گئے گزرے دور کے مدہم پڑتے ہوئے نقوش میں شواہد کا رنگ بھر کر انہیں اجاگر

کرنے میں مدد لے سکتے ہیں ۔

میں نے اپنے مطالعہ کے لیے رانچی اور چھوٹا ناگپور کے گھنے جنگلات میں بسنے والے ان منڈا قبائل کا انتخاب کیا ہے جو کہ نہ صرف عام تہذیب و تمدن کی دنیا سے الگ تھلگ آباد ہیں بلکہ مغربی پاکستان کی حدوں سے تو کالے کوسوں دور واقع ہیں ۔ اس صورت میں کسی طرح یہ دعویٰ کرنا ممکن نہیں کہ ان دور افتادہ خطوں میں رسم و رواج اور لسانی مطابقت باہمی میل جول کا نتیجہ ہے ۔ یہ وہ قبائل ہیں جو کہ بیرونی دنیا سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے اس لیے سنسکرت اور بعد میں آنے والی دوسری ہمسایہ زبانیں اس کے خالص پن کو زیادہ متاثر نہیں کر سکیں ۔

سب سے پہلے ہم بعض رسم و رواج اور تہواروں کو لیتے ہیں ۔ جب ہم شادی غمی کی مختلف رسموں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں کئی ایسے رسم و رواج ہیں جن کا مقصد اکثر بہاری سمجھ سے بالا تر ہوتا ہے لیکن ہم ان پر صرف اس لیے عمل پیرا ہوتے ہیں کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور انہوں نے یہ رسمیں اپنے بڑوں سے ورثے میں پائی تھیں ۔ اس طرح معلوم نہیں ان کا سلسلہ کہاں سے کہاں تک جا پہنچتا ہے ۔ آج ہم کچھ ایسی ہی رسموں کا ذکر کرتے ہیں جن کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ کم از کم پانچ ہزار سال سے تو ضرور مروج ہیں ۔ اس سے زیادہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ رسمیں وادی سندھ میں اس وقت بھی رائج تھیں جب کہ ہڑپہ اور موئن جو دڑو کی دراوڑی تہذیب نے ابھی جنم نہیں لیا تھا ۔

منڈا قبائل میں پائی جانے والی ذیل کی رسمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

دل دا : بمعنی پانی گرا نا (دا بمعنی پانی ، دل بمعنی گرا نا ، پنجابی ڈولہنا) ۔ جب دلہا دلہن کو بیاہ کر اپنے گھر لاتا ہے تو دلہا کی ماں ان دونوں کو پانی کے چھینٹے مارتی ہے اور ان کے سر پر وار کر اسے پیتی ہے ۔ پنجابی میں اس رسم کو 'پانی وارنا' ،

بمعنی پانی نچھاور کرنا کہتے ہیں -

داہرچی : اس رسم سے مراد ہے کہ جب دلہا دلہن کے گھر شادی کی غرض سے پہنچتا ہے تو اس کی ساس اس پر پانی نچھاور کر کے اس کا استقبال کرتی ہے - یہ رسم بھی پنجاب میں موجود ہے -

دا آؤ : بمعنی پانی لانا - شادی کے موقعے پر دلہن کے گاؤں کی چار کنواری لڑکیاں پڑوس کے ندی ، نالہ ، یا تالاب سے پانی بھر کر دلہن کے گھر لاتی ہیں - پنجاب کے دیہات میں یہ رسم 'گھڑولی' کے نام سے رائج ہے -

چاؤ پیپر : دلہن کے سسرال آنے پر اس کی ساس اس کے سر پر چاول نچھاور کرتی ہے - یہ رسم بھارتی پنجاب کے ہندوؤں میں ابھی تک موجود ہے -

سنڈا وا دارم ٹکا : جب بارات شادی کے پنڈال کی طرف رخ کرتی ہے تو دلہن کی رشتے دار عورتیں اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور جب تک بارات والے انہیں معاوضہ ادا نہیں کرتے یہ راستہ نہیں چھوڑتیں - پنجاب میں اس قسم کے معاوضہ مانگنے کو 'لاگ' کہتے ہیں -

لیجا : بمعنی کپڑا - شادی کے موقع پر مختلف رشتے داروں کو جو کپڑے کی چادریں دی جاتی ہیں انہیں 'لیجا' کہتے ہیں - مثلاً اینگا باگے لیجا (ساس کا کپڑا)، سالا لیجا (سالے کا کپڑا) - پنجاب میں اس قسم کے کپڑوں کو 'ریجا' کہتے ہیں -

بالا : بمعنی بارات - اس کا نشان ہمیں 'سربالا' کے لفظ میں ملتا ہے - بمعنی بارات کے آگے لگنے والا - ویسے سنڈا قبائل میں بھی یہ رسم موجود ہے وہاں 'سربالا' کو 'لوکنڈی' کہتے ہیں -

پوہل : منڈا قبائل میں جب دو آدمی ایک دوسرے کے ساتھ گہری دوستی یا بھائی چارہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ رسم ادا کرتے ہیں۔ سکھ مذہب میں یہ رسم انہی معنوں میں بطور ایک مذہبی فریضہ کے موجود ہے۔ جسے وہ 'پوہل چھکنا' کہتے ہیں۔

منڈا تہواروں میں کرم، ماگھی اور پھاگو خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

کرم : یہ تہوار بھادوں کے مہینے میں چاند کی گیارہویں تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ پنجاب میں اس تہوار کو 'تثیاں' کہتے ہیں جب کہ دیہات کی بہو بیٹیاں گاؤں سے باہر جا کر درختوں پر جھولے ڈالا کرتی تھیں۔ یہ رسم ہندوؤں کے ساتھ ہی یہاں سے ختم ہو گئی۔

ماگے پرہ : یہ تہوار پوس کے مہینے میں پورے چاند کے دن منایا جاتا ہے۔ اس دن ان کا نیا سال شروع ہوتا ہے اس تہوار پر وہ بزرگوں کی روحوں کی پوجا کرتے ہیں۔ پنجاب کے ہندوؤں میں یہ تہوار 'ماگھی' کے نام سے مشہور تھا اور اس دن وہ اپنے متبرک دریاؤں پر جا کر نہاتے اور پوجا پاٹھ کرتے تھے۔

پھاگو : یہ تہوار ماہ پھاگن کے پورے چاند کے دن منایا جاتا ہے ہندوؤں میں یہ تہوار 'ہولی' کے نام سے مشہور ہے جب کہ وہ ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے ہیں اور رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ ہارے ہاں سے یہ رسم ختم ہو چکی ہے اور اس کی نشانی کے طور پر صرف 'پھاگ کھیلنا' کا محاورہ باقی ہے۔

اب ہم لسانی پہلو کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں ہمارے لیے چند ایک حقائق کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے تاکہ زیر غور موضوع کے افہام و تفہیم میں آسانی رہے۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ جب دو قوموں کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو ان کے تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور بول چال ایک دوسرے سے متاثر

ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگرچہ مخصوص حالات کے تحت ان میں کمی بیشی کا احتمال ضرور ہے یعنی ایک قوم زیادہ گہرے طور پر متاثر ہوگی اور دوسری کم۔ مثال کے طور پر عربوں کی فتوحات کے نتیجے میں عربی زبان نے شمالی افریقہ کی قبطنی اور قدیم بربری زبانوں کو قریب قریب نیست و نابود کر کے ان کی جگہ خود لے لی لیکن اس کے برعکس ایران، افغانستان اور برصغیر پاک و ہند کے لسانی ڈھانچے کو بنیادی طور پر ذرا بھی متاثر نہ کر سکی سوائے اس کے کہ ان کے سرمایہ الفاظ پر معمولی حد تک اثر انداز ہوئی۔ اسی طرح جب آریائی قبائل برصغیر میں وارد ہوئے تو ان کی زبان مقامی عناصر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ مثال کے طور پر گو لاطینی، یونانی، فارسی اور سنسکرت چاروں کی چاروں آریائی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں لیکن مقامی عناصر کے اثرات کی بدولت ایک دوسری سے مختلف نظر آتی ہیں۔ اگر یہ اثرات موجود نہ ہوتے تو ان کے درمیان کوئی وجہ امتیاز باقی نہ رہتی اور ان میں آپس میں شہہ بھر بھی فرق نہ ہوتا۔

آج تک یہ نظریہ ایک فیشن کے طور پر موجود رہا کہ جہاں بھی مقامی زبانوں اور سنسکرت کے تقابلی مطالعے کا وقت آیا تو سنسکرت کو ہی تمام تر مشترکہ سرمایہ الفاظ کا منبع و سرچشمہ قرار دے دیا گیا اور سنسکرت پر مقامی اثرات کے تصور کو بھی قابل التفات نہ سمجھا۔ لیکن اب اہل نظر نے ان فرسودہ تعصبات سے بالاتر رہ کر حقائق کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنا شروع کر دیا ہے۔

اپنے مطمع نظر کی مزید وضاحت کے لیے میں اردو زبان کے دو عام فہم الفاظ آگ اور پانی کی مثال پیش کرتا ہوں۔ یہ دونوں الفاظ انہی معنوں میں آگن اور پانیئم کی صورت میں سنسکرت میں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ الفاظ برصغیر کی قدیم زبانوں یعنی دراوڑی اور منڈا میں بھی مستعمل ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ ایک نے دوسری سے مستعار لیے ہیں لیکن کس نے مستعار لیے اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم تقابلی جائزے سے مدد لیتے ہیں۔ آگ کا لفظ آریائی گروہ کی دوسری زبانوں میں بھی عمومیت کے ساتھ مستعمل ہے مثلاً روسی اوگن (Ogone)، لتھوانی اگنس (Ignis) اور لاطینی اگنس (Ugnis) وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ آریائی الاصل ہے مقامی زبانوں نے آریائی قبائل سے مستعار لیا ہے۔

اس کے برعکس پانی کا لفظ سنسکرت کے علاوہ آریائی گروہ کی اور کسی بڑی زبان میں نہیں ملتا لیکن منڈا گروہ کی زبانوں مثلاً باوری ، تریموکی ، گہوری اور بھٹوئی وغیرہ میں مروج ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ گو سنسکرت کے سرمایہ الفاظ کا حصہ ضرور ہے لیکن پھر بھی آریائی الاصل نہیں ہے بلکہ مقامی زبانوں سے مستعار لیا گیا ہے۔ یہی صورت مشترکہ سرمایہ الفاظ کے ایک بڑے حصے کی ہے۔

اب ہم منڈاری اور وادی، سندھ کی موجودہ زبانوں کے تقابلی جائزے کی طرف رجوع کرتے ہیں گو ان دونوں گروہوں کے تمام تر مشترکہ سرمایہ الفاظ کا احاطہ کرنا ممکن نہ ہوگا کیونکہ اس کے لیے ایک علاحدہ کتاب کی ضرورت ہے اس لیے یہاں ہم اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے اس کا ایک مختصر سا انتخاب پیش کرنے پر اکتفا کریں گے :

رشتہ جات : نانا نانی ، ماما مامی ، پھپھا پھپھو (پنجابی پھپھی بمعنی بڑا) ، سالا سالی ، موسی (پنجابی ماسی بمعنی خالہ) ، سانڈھو وغیرہ۔

بر : بمعنی دلہا (پنجابی ور)۔ غالباً بارات کا لفظ بھی اسی 'بر' سے مشتق ہے۔ نیز پنجابی وری بمعنی دلہا کی طرف سے دلہن کو دیا گیا لباس۔

کڑی : بمعنی دلہن ، بیوی ، چولستان کے علاقے میں بہو یا بیوی کو کڑی کہتے ہیں جبکہ باقی پنجاب میں یہ لفظ بیٹی یا عام لڑکی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

پیڑھی : بمعنی نسل۔ پنجابی زبان میں انہی معنوں میں مستعمل ہے۔

منڈاری زبان میں باپ کے لیے ابا اور آپو کے الفاظ مستعمل ہیں جو کہ اردو باپ، ابا اور ابو ، پنجابی باپو اور پیو سے لگاؤ کھاتے ہیں لیکن دراوڑی گروہ کی زبانوں میں بھی اس سے مطابقت رکھنے والے الفاظ مستعمل ہیں مثلاً تامل ، ملیالم 'اپن' کناری ، تلگو 'اپا' نیز برصغیر کی چند دوسری زبانوں میں بھی یہ لفظ موجود ہے جیسے کہ میگھ

(بھوٹان کی ایک بولی) 'اپا' بھوٹیا 'ابا' اور سنگھالی 'اپا' - اگر یہیں پر بس ہوتی تو فیصلہ کرنا چنداں مشکل نہ تھا کیونکہ اول تو اردو اور پنجابی زبان کے الفاظ صوتی لحاظ سے منڈاری سے زیادہ قریب ہیں ، دوم منڈاری کو تاریخی لحاظ سے بھی دراوڑی اور دیگر زبانوں پر سبقت حاصل ہے لیکن شرق اوسط کی دیگر قدیم زبانوں میں اس لفظ کی موجودگی مسئلہ کو کچھ اور پیچیدہ بنا دیتی ہے مثلاً کالدی (بابل کی قدیم سامی زبان) 'ابا' سریانی (شام کی قدیم زبان) 'ابو' عبرانی 'اب' اور عربی 'ابت'۔ بہر حال اس لفظ کے لسانی رشتوں کی کھوج ہمیں اپنے موضوع سے بہت دور لے جائے گی کیونکہ قدیم سامی زبانوں کے علاوہ یہ یورال التائی گروہ (منگولی ، ترکی ، تاتاری وغیرہ) میں بھی مروج ہے مثلاً ہنگروی 'اپا' اور اپوس ، فن لینڈی 'اپی' اور اوشٹیاکی 'اپ' بمعنی خسر نیز چینی 'پو' بمعنی باپ - اگر صرف اس ایک لفظ کے اشتراک پر بھروسہ کیا جا سکے تو یہ کسی گئے گزرے دور میں ان کے مشترک ماخذ اور نئی راہوں کی نشاندہی کرتا ہے لیکن جیسا کہ ذکر آچکا ہے اردو اور پنجابی الفاظ منڈاری سے ہی مشتق ہیں -

جسمانی اعضاء

اردو	پنجابی	معنی	منڈاری
—	دیہہ	جسم	دیہہ
—	منڈی	سر	منڈی
—	ڈھوئی	کمر ، پیٹھ	ڈویا
—	کنڈ	کمر ، پیٹھ	کنڈ
—	کھر	پاؤں	کھری
—	جنگھ نیز جانگیہ بمعنی لنگوٹ	ران	جانگ
—	بکڑا	دل	بکا
چھلا (دم)	—	دم	چالم
چھلا جھانٹ	جھنڈ جھاٹا (بال)	اعضائے مخصوصہ کے بال	جھانٹ

اردو	پنجابی	معنی	منڈاری
—	مہاندرا	چہرہ ، خد و خال	موآنرا

زیورات

—	مندرے ، مندراں ، مندری	کانوں کا زیور	مندرا
نتھ	نتھ	ناک کا زیور	نتھ
—	ٹوکاں	کانوں کا زیور	تکوئی
کاجل	کجیل	کاجل	کاجر
گہنا	گہنا	زیور	گہنا
آنچل	—	پلا ، دامن	آنچل
انگر کھا	انگی بمعنی بنیان	لباس ، کوٹ	انگا
—	گنجی بمعنی بنیان	صدری	گانجی
لمہنگا ، لنگوٹ	لنگ بمعنی لنگوٹ ، لمہنگا بمعنی گھگرا ، لنگی بمعنی کمر میں باندھنے کی چادر	لنگوٹ	لاہنگا
—	دہسا	اونی چادر	دہسا
—	لیڑا (نیز ریمبا بمعنی بیاہ شادی پر دیا جانے والا کپڑا)	کپڑا	لیجا
لتا	لیترا (نیز لیراں)	پھٹا پرانا کپڑا	لیدرا لیجا
—	چیڑا (نیز چیرا بمعنی پگڑی)	کپڑا ، دوپٹہ	چیرا
—	کھیڑی ، کھڑاواں ، کھڑاؤں	جوئے	کھاؤڈے
—	بگلی	تھیلی ، بٹوا	باگلی

اردو	پنجابی	معنی	منڈاری
—	توڑا	بٹوا ، روپیہ پیسہ	توڑا
		رکھنے کی تھیلی	

پیمانے

زمانہ قدیم میں غلے کو تولنے کے علاوہ اسے ماپ کر بھی تقسیم کیا یا بیچا جاتا تھا۔ یہ ماپ ایک مخصوص مقدار کے لیے لکڑی یا دھات سے بنائے جاتے تھے۔ پنجاب کے دیہات میں آج بھی یہ پیمانے 'ٹوپا' اور 'وٹی' کے نام سے مستعمل ہیں۔ ذیل میں قریباً برابر مقدار کے منڈاری، دراوڑی، پنجابی اور کشمیری پیمانے درج ہیں :

کشمیری	پنجابی	دراوڑی	منڈاری
لپ	لپ	سیرا	لپ
			(بتھیلی بھر)
چھووا، سیر	وٹی، پونے دو سیر	پاٹی، سواسیر،	پاٹی، غلے کا
		ڈیڑھ سیر	پیمانہ
اوڈی، پانچ سیر	دھڑی، پانچ سیر	—	—

ان میں پاٹی یا وٹی کا پیمانہ قدامت کے لحاظ سے سب سے پرانا معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہڑپائی دور کی غلے کی دکانوں پر یہ پیمانہ عام مستعمل ہو گا۔ علاوہ ازیں منڈاری میں ایک پیمانہ پائلا بھی ہے جو کہ غالباً پنجابی پہیلی کے مترادف ہے۔

منڈاری کاٹ، قریباً چالیس سیر کے برابر غلے کا پیمانہ، پنجابی کٹا : ایک من کی بوری کو کہتے ہیں۔

گنتی کے لحاظ سے منڈاری اور مندھی دونوں میں دو کے ہندسے کے لیے 'با' کا لفظ مشترک طور پر مستعمل ہے۔ پنجابی اور اردو میں بارہ، بیس اور بائیس وغیرہ ہندسوں میں 'ب' کا حرف اسی 'با'

بمعنی دو کی ترجمانی کرتا ہے جیسے کہ بانوے - با - نوے یعنی دو اور نوے -

اسی طرح منڈاری زبانوں میں کوڑی بمعنی بیس گنتی کی اکائی کے طور پر مروج ہے - منڈاری لفظ 'کر' بمعنی ہاتھ اس کی اصل ہے - کوڑی لفظ 'کر' کی جمع ہے جس کے معنی دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کا مجموعہ یعنی بیس انگلیاں - غالباً قدیم سے ہی منڈا قبائل ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کی تعداد کو گنتی کی اکائی کے طور پر استعمال کرتے ہوں گے - آج بھی پنجاب کے دیہات میں یہی اکائی عام مروج ہے جیسے کہ سو کو وہ پنج ویہیاں (پانچ بیسے) اور ایک سو تیس کو چھ ویہیاں تے دس یعنی چھ بیسے اور دس کہتے ہیں -

منڈاری گنڈا چار کی اکائی انہی معنوں میں پنجابی میں بھی مستعمل ہے - اسی قسم کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں جیسے کہ منڈاری کوس (تقریباً تین میل کا فاصلہ) ، اردو کوس ، پنجابی کوہ - منڈاری میں وقت کے اندازے کے لیے ڈانگ بمعنی لٹھی استعمال ہوتی ہے یعنی سورج ایک ڈانگ یا دو ڈانگ نکل آیا ہے جیسے اردو میں نیزہ کا پیمانہ مشہور ہے جیسے سورج کا سوا نیزے پر آ جانا - پنجابی میں بھی یہی ڈانگ کا پیمانہ انہی معنوں میں مستعمل ہے جیسے 'سورج اجے ڈانگ بھر نکلیا سی -'

خورد و نوش

منڈاری اور پنجابی میں اناج ، ان پانی ، دانہ پانی ، دال اور گڑ وغیرہ ایک ہی معنوں میں مستعمل ہیں - منڈاری میں ابلے ہوئے چاولوں کو مانڈا کہتے ہیں - غالباً اردو روز مرہ کے حلوا مانڈا میں یہی لفظ مستعمل ہے کیونکہ پنجابی منڈا بمعنی روٹی میں کوئی خاص کشش نہیں - ممکن ہے پنجابی 'منڈے' کا بھی براہ راست منڈاری 'منڈے' سے کوئی لسانی رشتہ موجود ہو -

نباتات

منڈاری ، پنجابی اور اردو میں بیول ، بکائن ، بڑ (پنجابی بوہڑ) ، ریٹھہ ، دھتورہ ، ککڑی ، کریلا ، نیم اور پیپتا وغیرہ نام مشترک ہیں - منڈاری بیڑ بمعنی گھنا جنگل اور ناڑ بمعنی چاول یا گندم کی بالی کا بچلا حصہ پنجابی میں بھی انہی معنوں میں مستعمل ہے - منڈاری ڈھنڈی ، پنجابی

ٹینڈا ، اردو ٹینٹ بمعنی کپاس کا ڈوڈا غالباً یہ ڈوڈا کا لفظ بھی انہی مترادفات سے تعلق رکھتا ہے نیز منڈاری ڈھیلہ بمعنی ایک خاردار جھاڑی، پنجابی ڈیلہ -

حیوانات

منڈاری	معنی	پنجابی	اردو
ارنا	پوری عمر کا بھینسا	—	ارنا بمعنی جنگلی بھینسا
بچھا ، بچھی	بچھڑا ، بچھڑی	وچھا ، وچھی	بچھڑا
باڑا	بیل	ویہڑا	—
مینڈھی	بھڑ	میڈھا (نر بھڑ)	مینڈھا
لڈ ، لیڈ	جانوروں کا فضلہ	لد بمعنی گھوڑوں لید اور گدھوں کا فضلہ ، لیڈا : اونٹ کا فضلہ	

ضروریات زندگی

آوا	کمہاروں کی برتن پکانے	آوا: اینٹیں پکانے	آوہ
باٹھا	کی بھٹی	پہٹھا	بھٹہ
بھٹی	بھٹہ	پہٹھی	بھٹی
چولاہا	شراب نکالنے کی بھٹی	چلہا	چولہا
بانڈا	چولہا	—	—
تسلا	سالن وغیرہ پکانے کا برتن	بانڈی ، سالن پکانے کا برتن	—
بنڈا	تڑکنی ، تھالی نما برتن	تسلا	—
چائو	برتنوں کے نیچے رکھنے کا حلقہ	بنڈا	—
	مٹی کا برتن ، گھڑا	چٹورا : دودھ وغیرہ گرم کرنے کا برتن ، چائی : گھڑا	—

اردو	پنجابی	معنی	منڈاری
—	چینی : گھڑے کا تھالی نما ڈھکنا	تھالی	چینی
ڈھانپنی	—	تھالی نما ڈھکنا	ڈابنی
—	پیندا	برتنوں کا نچلا حصہ	پیندا
چمٹا	چمٹا	دست پناہ	چمٹا
—	چنگیر : بانس کے پتوں یا ناڑ کی بنی ہوئی روٹی رکھنے کی ٹوکری	تھالی نما ٹوکری	چانگیرا
گاگر	گگر	پانی کا برتن	گاگرا
—	دورا ، دوری : مٹی کے ٹوکری نما برتن	بڑا اور چھوٹا ٹوکرا	دورا ، دوری
—	ڈل : سبزی یا پھل وغیرہ رکھنے کا بڑا ٹوکرا	ٹوکرا	ڈالا
—	ڈالی : چھوٹی ٹوکری جس میں عام طور پر پھلوں یا پھولوں کا تحفہ دیا جاتا ہے جیسے پھولوں کی ڈالی	ڈھکنے کے بغیر ٹوکرا	ڈالی
خوانچہ	کھونچا : بڑا ٹوکرا	بڑے منہ کا بانس کا ٹوکرا	کھانچی
—	پیٹی ، صندوق	بانس کا ڈھکنے والا ٹوکرا	پیٹی

اردو	پنجابی	معنی	سنڈاری
—	بیڑ : رہٹ میں پانی نکالنے کے کوزوں کو باندھنے والا رسا نیز چرخہ میں استعمال ہونے والی	گھاس کا بنا ہوا موٹا رسا	بوڑ
—	رسی رہٹ میں استعمال ہونے والے مٹی کے کوزے نیز حجاموں کا مٹی کا برتن جو کہ بیابان شادی پر کھانا وغیرہ پکاتے وقت استعمال ہوتا ہے -	رہٹ میں استعمال ہونے والے مٹی کے کوزے	ٹنڈ
—	کراہا	زمین ہموار کرنے کا آلہ : سہاگہ	کراہا
—	رچھ	تانی میں استعمال ہونے والا کنگھا جس سے دھاگے گزارے جاتے ہیں -	راچھ
—	پچر	لکڑی کا وہ ٹکڑا جو کہ کسلہاڑے یا کسدال وغیرہ کے دستے میں مضبوطی کے لیے گاڑا جاتا ہے -	پچر
—	کھڑتال	چھینے ، تھالی نما ساز کا نام	کرتال
موگری نہائی	مونگلی نہائی	لکڑی کا ہتھوڑا آہرن	مونگرا نہائی

اردو	پنجابی	سغنی	منڈاری
—	سبل	لوہے کی تیز نوک والی سلاخ	ساپرا
—	سڑھی : لکڑی کے دو جڑواں ڈنڈے جس پر بندو اپنے مردوں کو جلانے لے جاتے ہیں -	سیڑھی	سڑھی
آرہ (یہ لفظ دراوڑی گروہ کی زبانوں میں بھی مستعمل ہے)	آرا	لکڑی چیرنے کا اوزار	آرا
بہنگی	ویہنگی	وہ بانس جس کے دونوں سروں پر سامان لٹکا کر کندھوں پر لے جایا جاتا ہے -	باہنگا
—	ڈانگ	لاٹھی	ڈانگ
—	ڈھانگا : ایک لمبا بانس جو کہ گڈریے درختوں سے پتے توڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں	ایک لمبا بانس	ڈاہاگ
—	سم	موگری یا لاٹھی کے سرے پر چڑھائی ہوئی لوہے کی ٹوپی	سمبا
—	سوٹا	چھڑی	سوٹا
ڈنڈا	ڈنڈا	چھڑی	ڈنڈا
بلم	بلم	نیزہ	بلم

اردو	پنجابی	معنی	منڈاری
—	برچھا	بھالا	برچھا
ڈھال	ڈھال	بھپر	ڈھال
بھی	وہی : حساب رکھنے کی کتاب	کتاب	بھی
بھنڈار	بھنڈار	خزانہ ، مال گودام	بھنڈار
—	دھڑا	پاسنگ	دھاڑا
—	بوہنی	دن کی پہلی فروخت	بوہنی
—	کھرجی : خزانہ ، روپیہ پیسہ رکھنے کی جگہ۔	مال اسباب ، دولت	کھرجی
—	کھانی (جیسے کچی کھانی کا تیل)	کولہو	گھانی
کولہو	کولہو	کولہو	کالو، کولہو
کھلی	کھل	کھلی	کاڑے
چھپر	چھپری	چھوٹا چھپر	چپری
جھونپڑی	چھونپڑی	جھونپڑی	جھونپڑی
مچان	—	چبوترا نما چھتاؤ	ماچا
منڈوا	منڈوا	عارضی طور پر بنایا گیا پنڈال	منڈوا
دالان	دلان	اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت ، دیوار سے گھرا ہوا آنگن	دالان
—	پھاٹک	دروازہ	پھاٹک

متفرقات

—	پہلے (وقت سے پہلے) اگیترا	اگوتر
—	رہنا، شادی کے موقع آگو پر بارات کے آگے لگنے	آگودار

اردو

پنجابی

معنی

منڈاری

والا ، عام طور پر وہ
آدمی جس نے شادی کی
بات چیت کرائی ہو

—

ایر کھا

کسی کے پاس کوئی اچھی
چیز دیکھ کر خود
بھی اس کے حاصل
کرنے کی خواہش کرنا
نیز حسد ، دشمنی

ایر کھا

سامی

سامی

کرایہ دار ، مقروض

اسامی

آڑ (دراوڑی
گروہ میں بھی
مروج ہے)

آڑ

ہوا سے بچاؤ کے لیے
کپڑے یا پتوں کا پردہ

آڑا

—

بڑ

سیلاب

اڑ گودا

—

بونا

کوٹاہ قد

بابنا

باڑھ

—

سیلاب

باڑی ، بانڈ

بخرہ

وکھرا

حصہ

بکھرا

بھاڑہ

پھاڑہ

کرایہ

بھاڑہ

—

بیڑا

گٹھا

بیڑا

بھوسہ

پھوس

بھوسہ

بوسہ

—

پھانبر

جلتی ہوئی آگ

بامبارو

باسی

بہیا

پچھلے دن کا
بچا ہوا کھانا

باؤ ، باسی

—

چت کبرا

دھبے دار

چتر کابر

—

چھیلا

عیش و عشرت کا رمیا

چھیلا

—

چترائی

مکر ، چالاکی

چتر

چیلا

چیلا

پیروکار

چیلا

—

چھیڑو

گڈریا

چیڑیا

—

چوب

آنکھ میں کسی چیز
کا پڑ جانا

چومبا

دھندہ

دھندہ

کاروبار

دھندہ

اردو	پنجابی	معنی	سنڈاری
—	دینگڑا	نوکر ، کنوارا لڑکا	ڈانگڑا
—	تڑی بمعنی طاقت،	طاقت	ڈاڑی
—	رعب		
—	ڈھیم	ٹھیکری	ڈھیا
ڈھیلہ ، ڈلی	ڈلا	مٹی کا ڈلا	ڈھیلہ
ڈھارس	دھرواس	صبر	ڈھارس
ڈھیٹ	ٹھیٹھ	بے شرم ، ڈھیٹ	ڈھیٹ
دھول	دھوڑ	غبار	دھوڑ
—	ٹبہ	ٹیلہ	دپا
(دراوڑی اور تاتاری گروہ کی زبانوں میں بھی موجود ہے)			
گدرا	گدرا	نیم پختہ پھل	گادرا
گنج	گنج ، گنجیر	ڈھیر	گنجاؤ
گرد	گردا	غبار	گردا
گیرو	گیرو	سرخ مٹی	گیرو
ہریالی	ہرے وائی	سرسبزی	ہاریار
جھرنا	جھرنا	آبشار	جھورا
جھڑی	جھڑی	بارش کا برسنا	جھاڑیا
—	آہن (اولے)	اولے	آناڑل
—	جیٹھ ، جیٹھا	پھلوٹھا ، بڑا	جیٹ
خسرہ	کھسرہ	خارش کے دانے	کسرہ
کٹنا	کٹنی (مؤنٹ)	دلال ، بھڑوا ، لگانے بجھانے والا	کٹنا
	لاوا : فصل کاٹنے والا	گھاس وغیرہ کاٹنا	لا
	لائیاں : فصل کاٹنے کا		
	عوض جو کہ کٹی ہوئی		
	فصل سے ایک حصہ		
	دیا جاتا ہے (پشتو : لو		
	بمعنی فصل کی کٹائی) —		

اردو	پنجابی	معنی	منڈاری
لاگ ڈانٹ	لاگت بازی	دشمنی	لاگ
رال	لار ، قطار ، لال ، رال	قطار ، رال ، منکوں کی لڑی	لار
لو	لوہنا ، جلانا ، لو : گرم ہوا	جلانا ، بھون ڈالنا	لو
—	مت دینا	صلاح مشورہ	مت
مور کھ	مور کھ	جاہل ، بیوقوف	مور کھ
منڈلی	منڈلی	گروہ ، اکٹھ	منڈلی
—	نیں	بڑا دریا	نائی
—	ناٹا	کوتاہ قد	ناٹا
نیو	نیوں ، نینہ	بنیاد	نیو
نج ، نجی	نجی	ذاتی	نج
—	پرہیا ، پرھے	پنچایت	پڑاہ
—	پانڈو (مٹی) :	سفید	پانڈو
—	کھڑیا مٹی		
—	روال	ہلکے وزن کا	ربال
—	روڑا	کنکر	روڑا
سگھڑ	سگھڑ	نیک	سگڑ
—	ٹھڈا ، ٹھڈ	ٹھوکر مارنا	ٹوڈ
اگر	—	اگر	اگر
—	چیچی ، چیچا	کیونکہ	چیاچی
—	جے	شاید	جا
جو	—	کوئی ، کچھ	جا ، جاء
—	جیہڑا	کوئی آدمی (ہوڑا بمعنی آدمی)	جاہوڑا
اور	ہور	اور ، دوسرا	آڑ ، اوڑ ، ہوڑ
—	توں ، تھیں	سے	ایتے
—	ہن (پشتو: نن بمعنی آج)	ابھی ، اسی وقت	نا

اردو	پنجابی	معنی	منڈاری
ہکا ہکا	آکا باکا	حیران ، ششدر	آکا باکا
اچانک	اچن چیت، اچان چک	فوراً ہی ، خلاف امید	اچا کا
گھپ اندھیرا	انہیرا گھپ	نہایت ہی اندھیرا	اندھ کپ
پڑوس	اڑوس پڑوس	بمسائیگی	اڑوس پڑوس
—	آسے پاسے	نزدیک ہی	آسے پاسے
—	اگڑم بگڑم	ملا جلا	آگڑا باگڑا
پھسپھسا	پھسپھسا : نرم پھوس : گوہر	نرم ، پھسپھسا ، نہایت ہی سست	پھوسو، بھوسو
	پھوسل: حد سے زیادہ ، سست الوجود ، بزدل		
—	پلپلا ، نرم پلا ہوا: خراب پھل	نرم ، کیچڑ جیسا	بلبلاؤ
جگ مگ	جگ مگ	چمکنا	جھک مکاؤ
تتر بتر	تتر بتر	بکھر جانا	چتر بتر
ڈبڈبا آنا	ٹپ ٹپ (آنسو گرنا)	آنکھیں بھر آنا	ڈبڈباؤ
دھکم پیل	دھکا دھکی	ایک دوسرے کو دھکیلنا	دکا دکی
دندنانا	—	غرور سے چلنا	دندناؤ
ڈاک	ڈاک لگ گئی	کسی چیز کا منزل بمنزل پہنچانا	ڈاکے ڈاک
دوڑ دھوپ	—	ادھر ادھر دوڑنا ، سخت محنت کرنا	داڑ دھوپ
دھوم، دھام	دہاں پا دینیاں کھٹ ، پٹ	شان و شوکت جھگڑا ، تکلیف	دھوم دھام کھٹ پٹ
—	دھاوا بولنا	اکٹھے ہو کر جانا	دھاوا دھاوی

افعال

اینٹھنا	—	ہلکا سا مروڑنا ، نچوڑنا	اینٹھاؤ
اٹکانا	ہٹکنا : روکنا اٹکنا : رک جانا	روکنا ، منع کرنا	اٹکاؤ

اردو	پنجابی	سغنی	سندھاری
—	اٹکل : جاننا ، سمجھنا	سوچنا ، سمجھنا	اٹکار
—	اڑی : ضد	ضد کرنا ، پرواہ نہ کرنا	اڑاؤ
بہلانا	پہلانا	دل خوش کرنا	باہلاؤ
—	بہنگ پاؤنا	تفرقہ پیدا کرنا	بہنگراؤ
—	بے انتی ، منت ، منت سہاجت	درخواست کرنا ، استدعا کرنا	بنتی
—	ونجانا (سندھی : ونجانا) ، چوک جانا	کھو دینا ، گم کرنا	بنڈاؤ
چکھنا	چک جانا	غلطی کرنا ، بھول جانا	چک
دبکنا	چکھنا	ذائقہ چکھنا	چاکا
—	—	گھات میں بیٹھنا ، ڈرکے مارے جھک کر بیٹھنا	دبکاؤ
دھکنا	دھکنا	گرمی ، شعلہ	دھاک
—	در در بمعنی دفع ہو	نفرت سے بھگا دینا ، نفرت کرنا	دھردھراؤ
ٹانگنا	ٹنگنا	لٹکنا ، لٹکانا	ڈونگا
—	کھسک جانا بمعنی آنکھ پچا کر نکل جانا	بچ نکلنا ، پرے ہونا	گھسکاؤ
—	کھسکنا : آپستہ آپستہ ہٹ جانا	—	—
ہڑپ کرنا ، نگل جانا	ہپ : کھانا ، نگلنا	کاٹ کھانا	ہپ
جھلکنا	جھلک : نظارہ (محبوب کا)	چمکنا	جھلکاؤ
جھپٹنا	جھپٹنا ، جھپٹ مارنا بمعنی ایک دم چھین لینا	پکڑنا ، آدبوچنا	جھپٹاؤ

منڈاری	معنی	پنجابی	اردو
ہاکاؤ	بلانا ، چٹلا کر بولنا	ہاک مارنا : زور سے آواز ہانکنا دینا	ہانکنا
لاہ	اتارنا	لاہنا : اتارنا	—
لپکاؤ	کود کر کسی چیز کو پکڑنا	لپکنا	لپکنا
لوڑنا	دیکھنا ، تلاش کرنا	لوڑنا : تلاش کرنا	—
مانجاؤ	برتنوں کا رگڑ کر صاف کرنا	مانجنا	مانجنا
نبراؤ	ختم کرنا	نبریڑنا	—
پسراؤ	پھیلنا ، پھیلانا	پسرنا : پھیلنا	—
—	—	پسارنا : پھیلانا	—
—	—	پسارا : پھیلاؤ	—
پوس	پرورش کرنا	پال پوس : پرورش ، پالنا پوسنا	—
تانگی	انتظار	تاہنگ	—
الار	بیل گاڑی یا کسی گاڑی کا بوجھ کی زیادتی کی وجہ سے ایک طرف جھک جانا	الر جانا	—

اسمائے ضمیر

حیرت ہے کہ بعض اسمائے ضمیر کم از کم چھ ہزار سال سے وادی سندھ میں بغیر کسی نمایاں تبدیلی کے مروج چلے آ رہے ہیں مثلاً منڈاری ، کولی : آبو ، سنتھالی : آبن بمعنی ہم (جس میں مخاطب اور متکلم دونوں شامل ہیں) ، پنجابی : آپاں (مثلاً آپاں دوویں میلے چلیئے : ہم دونوں میلے جائیں) ، اردو اپن بھی اسی کے مترادف ہے ۔ منڈاری ، کولی : ابوا بمعنی ہارا، پنجابی : اپنا (مثلاً ایہ ساڈا اپنا پنڈا اے : یہ ہارا اپنا گاؤں ہے) ، اردو : اپنا ۔

منڈاری، کولی ، سنتھالی اور بھومجی وغیرہ : آپے بمعنی صیغہ جمع حاضر یعنی آپ ، پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں ایک ہی معنی میں مستعمل

ہے یعنی کسی کو عزت کے طور پر مخاطب کرتے ہوئے کہا جاتا ہے -
بعینہ یہی صورت منڈا گروہ کی زبانوں میں بھی مستعمل ہے -

منڈاری : اپناؤ بمعنی کسی چیز کو اپنا بنا لینا
پنجابی و اردو : اپنانا

منڈاری میں کسی نزدیک ترین عزیز یا رشتے دار مثلاً ماں یا بیٹی وغیرہ کو پکارتے وقت پہلے 'نا' کا لفظ استعمال کرتے ہیں - پنجابی میں 'نی' کا لفظ اس کے مترادف ہے جیسے نی ماں : اری ماں ، نی دھیئے : اری بیٹی وغیرہ - نیز جب دو عورتیں ایک دوسری سے مخاطب ہوتی ہیں تو بھی یہ 'نی' کا لفظ استعمال کرتی ہیں مثلاً سن نی فاطماں : اری فاطمہ سن وغیرہ -

منڈاری نج بمعنی ذاتی کسی کا اپنا بھی غالباً اسی 'نا' یا 'نی' کی اصل سے مشتق ہے - پنجابی اور اردو نجی : ذاتی ، گھریلو -

قبیلوں اور ذاتوں کے نام

منڈاری گروہ میں بعض ذاتوں اور گوتوں (کل) کے نام وادی سندھ کی گوتوں سے لگاؤ کھاتے ہیں جیسے کہ :

منڈاری پنجابی

بھنگ

بھنگو : مسلمان جاٹوں کی ایک قومیت

بھنگی : سکھوں کی ایک مثل (گوت) جن کے نام سے

لاہور کے عجائب گھر کے سامنے پڑی ہوئی

توپ کو بھنگیاں والی توپ کہتے ہیں -

خاکروہوں کو عزت کے طور پر بھنگی کہتے ہیں -

بودرا : مسلمانوں کی ایک ذات

بودرا

ناگ ، ناگی : مسلمانوں اور ہندوؤں میں

ناگ

ایک گوت کا نام

براہڑ : ایک منڈاری قبیلہ کا نام (لفظی معنی بیڑ : جنگل)

ہاڑ : آدمی بمعنی جنگل باسی - بھارتی پنجاب میں سکھوں کی ایک

مشہور گوت براہڑ بنس کہلاتی ہے اور لفظی معنی کے لحاظ سے

یہ پشتو کے جنگل خیل سے لگاؤ کھاتا ہے -

پنجابی

منڈاری

جھپور : پنجاب کے ہندوؤں کی ایک ذات جو کہ اکثر پانی وغیرہ بھرنے کا کام کرتی تھی۔ پنجاب کے دیہاتوں میں سقہ کو بھی اکثر جھپور کہتے ہیں	جھور : (پیشہ ور نام) ملاح ، کشتی بان
کھار : بیاہ شادی کے موقع پر ڈولی اٹھانے والے	کھار : ایک ذات کا نام
پنجابی دلہ بمعنی بھڑوا پنجابی و اردو دلال بمعنی سودا طے کرانے والا	دلال : سودا طے کرنے والا ، بھڑوا
پنجابی : موجی بمعنی چار پنجابی ، اردو : ٹھٹھیارا ، پیتل کے برتن بنانے اور بیچنے والا	موجی : چمڑے کا کام کرنیوالا ٹھٹھیارا : پیتل کے برتن بیچنے والا
سندھی : ٹاٹا رو	

منڈاری اور پشتو

پشتو اور پنجابی ایک دوسری کے دوش بدوش پروان چڑھی ہیں اور اکثر ایک ہی قسم کے عوامل اور عناصر سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سرمایہ الفاظ میں بڑی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے اگرچہ لب و لہجہ کے اختلاف کی بناء پر اسے آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا ، مثلاً لباس کے کچھ ناموں کی مثال لیجیے :

پشتو : شادر ، پٹکے (پگڑی) ، لوپٹہ ، لمن بمعنی دامن ، شیلی

پنجابی : چادر ، پٹکا ، دوپٹہ ، لاون ، چیلی

بہر حال یہ ایک علاحدہ موضوع ہے۔ میں یہاں صرف ایک دو منڈاری اور پشتو الفاظ کے اشتراک کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ اس

سے میرا یہ مقصد نہیں کہ میں اس بناء پر پشتو کو منڈا گروہ کی شاخ قرار دے دوں بلکہ اس سے صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ پشتو کی جڑیں بھی اسی پاک سر زمین میں پیوست ہیں یا کم از کم اس میں قدیم عنصر ضرور موجود ہے۔ اس پہلو کی تفصیلی وضاحت کے لیے فی الحال مزید مطالعے کی ضرورت ہے۔

جس بات نے مجھے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا وہ پشتو اور منڈاری میں مرد یا خاوند کے لیے الفاظ کا اشتراک تھا۔ منڈاری میں مرد، خاوند یا آدمی کے لیے ہوڑو کا لفظ مستعمل ہے جو کہ پشتو : سڑے بمعنی مرد یا خاوند سے لگاؤ کھاتا ہے۔ پشتو زبان کے اس لفظ کا رشتہ کسی آریائی یا سامی زبان سے نہیں ملایا جا سکتا۔ ہاں پاکستان کی دراوڑی الاصل زبان بروہی میں اس کا مترادف ضرور موجود ہے۔ بروہی ارے بمعنی مرد، خاوند یا آدمی وغیرہ (ماہرین صوتیات کے نزدیک س، ہ اور الف ایک دوسرے سے تبدیل ہو جاتے ہیں جیسے کہ اردو 'سسر' اور 'دس' پنجابی 'سوہرا' اور 'دہ' نیز اردو اور پنجابی 'ہور' وغیرہ)۔ دراوڑی گروہ کی دوسری زبانوں مثلاً تامل، ملیالم وغیرہ میں 'ایرو' کے معنی مذکر کے ہیں لیکن یہاں یہ لفظ زیادہ تر آدمیوں کی بجائے مال مویشی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے کہ آیا پنجابی لفظ 'اڑے' اسی سلسلہ کی کڑی ہے یا نہیں۔ پنجاب میں عام بول چال کے دوران عورتیں اپنے خاوند یا قریبی مرد کو اکثر 'اڑیا' کہہ کر پکارتی ہیں جس کی مؤنث اڑی (اڑیے) ہے، اردو 'ارے' اور 'اری' بھی اسی سے منسلک ہیں۔

اسی طرح منڈاری لفظ کلی بمعنی قبیلہ، قومیت یا خاندان جیسے کہ بودرا کلی، ناگ کلی وغیرہ۔ پشتو لفظ خیل بمعنی خاندان یا قومیت جیسے کہ عیسیٰ خیل، منصور خیل وغیرہ کے مترادف ہے۔ اگر پنجابی لفظ 'کل' بمعنی نسل یا قومیت کو اسی سلسلہ سے منسلک تسلیم کریں تو اس کا رشتہ سنسکرت سے جا ملتا ہے جیسے کہ دیوکل، اسر کل وغیرہ۔ لیکن سنسکرت میں اس لفظ کا وجود اسے آریائی الاصل نہیں بنا دیتا کیونکہ آریائی گروہ کی مغربی شاخوں میں اس لفظ کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ آنے والے آریاؤں نے دوسرے بے شمار سرمایہ الفاظ کی طرح اسے بھی مقامی زبانوں سے مستعار لیا۔

ہاری بستیاں اور ان کے منڈاری نام

ہارے شہروں اور قریوں کے نام حقیقی معنوں میں ہاری قاریج کے آئینہ دار ہیں۔ ان ناموں کے پس منظر میں کتنی ہی قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ آج ہم بستوں کے چند ایسے ہی ناموں کا جائزہ لیں گے جو کہ گو بذات خود نئی نئی ہی آباد ہوئی ہوں گی لیکن ان ناموں کی وجہ تسمیہ ہمیں اس دور کی طرف لے جاتی ہے جب کہ یہاں ابھی ہڑپہ اور موئن جو دڑو کی تہذیب کے بانی بھی وارد نہیں ہوئے تھے اور برصغیر میں بھیل، کول، سنتھال اور منڈا وغیرہ قبائل آباد تھے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ زمانہ قدیم میں انسانی بستیاں اکثر پانی کے ذخیروں مثلاً دریا، جھیل، تالاب، ندی، نالوں یا چشموں وغیرہ کے نزدیک آباد ہوتی تھیں اور ان بستوں کے نام بھی اکثر انہی پانی کے ذخیروں سے منسوب ہوتے تھے جیسے کہ آج بھی چاہ نور محمد، چاہ سید والا، چوہا کڑیالہ، چوہا سیدن شاہ، ڈھوک دتہ، ڈھاہاں والا اور ٹوبہ ٹیک سنگھ قسم کے ناموں سے ظاہر ہے۔ بالکل اسی قسم کے نام سنتھالی اور منڈا قبائل کے علاقوں میں بھی ملتے ہیں۔

منڈاری میں پانی کے لیے دا، داہ اور داگ۔ سنتھالی میں 'داہا' اور 'داک' کے الفاظ مستعمل ہیں۔ یہی الفاظ چشمہ، نہر اور تالاب وغیرہ کے معنی بھی دیتے ہیں۔ اردو لفظ داہ بمعنی نہایت ہی گہرا پانی اور بھنور نیز داہک بمعنی پانی کا گڑبا بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یہ الفاظ منڈا اور سنتھالی قبائل کے علاقوں میں بستوں کے ناموں میں لاحقوں اور سابقوں کے طور پر عام مستعمل ہیں جیسے کہ ہوتو داگ، جامو داگ اور لاہار داگ وغیرہ۔

پنجاب میں یہی نام ڈھوک اور جھوک کی صورت میں مستعمل ہے جیسے کہ ڈھوک لوہاراں، ڈھوک مستا، ڈھوک وزیر اور جھوک بلوچاں اور جھوک دتہ وغیرہ۔ سندھ کے علاقے میں بھی جھوک کا لفظ اسی طرح گاؤں کے ناموں میں مستعمل ہے جیسے کہ جھوک سیداں وغیرہ۔

صوبہ سرحد میں جہاں پشتو کا چلن ہے یہ نام بعینہ منڈاری کی طرح مستعمل ہے جیسے کہ لنڈی ڈاگ (لنڈی : چھوٹی ، ڈاگ : نہر ، چشمہ وغیرہ) ، (ڈاگ بیسود ، ڈاگ اسمعیل خیل اور ڈاگی جدید وغیرہ۔ علاوہ ازیں پنجاب ، دہلی اور یوپی میں ڈگی (ڈ مکسور) پختہ تالاب کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں بھی ڈگی کے لفظ کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں جیسے کہ ڈھا کہ کا 'لال ڈگی میدان'۔

پنجابی ٹوبہ اور ڈھاب بمعنی تالاب اور جوہڑ وغیرہ منڈاری 'داہ' اور سنتھالی 'داہا' سے منسلک ہے اور اسی طرح گاؤں کے ناموں میں مستعمل ہیں جیسے کہ ڈھا باں والا ، ڈھا باں سنگھ ، ڈھا باں سنتے کا اور ٹوبہ ٹیک سنگھ وغیرہ۔

منڈاری میں لفظ کیل (بوزن اردو کھیل) بمعنی چھوٹی یا اضافی بستی بھی منڈا قبائل کے علاقے میں بستیوں کے ناموں میں بطور لاحقہ کے استعمال ہوتا ہے جیسے کہ اوری کیل ، سمبو کیل اور ٹوڑنگ کیل وغیرہ۔ اسی لفظ کی ایک دوسری صورت کیلا بھی ہے اور اسی طرح قصبوں اور دیہاتوں کے ناموں میں لاحقے کے طور پر مستعمل ہے جیسے کہ دیہ کیلا اور کسری کیلا وغیرہ۔

پنجاب میں مستعمل لفظ کالا بمعنی گاؤں ، گلی بمعنی کوچہ یا محلہ اور کھیڑا بمعنی گاؤں یا قصبہ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور اکثر گاؤں کے ناموں میں بطور سابقوں یا لاحقوں کے مستعمل ہیں جیسے کہ کالا گوجراں ، کالا افغاناں اور کالا شاہ کا کو وغیرہ۔ اسی طرح کرشن گلی ، نیاریاں والی گلی اور کھیڑا سیداں وغیرہ۔

کوہ مری کے گرد و نواح میں گاؤں کے ناموں کے ساتھ گلی کا لاحقہ عمومیت کے ساتھ مستعمل ہے جیسے کہ گھوڑا گلی ، بانسرہ گلی ، جھیکا گلی اور لوہار گلی وغیرہ۔ بلکہ اس قسم کے ناموں کی کثرت کی بناء پر اس علاقے ہی کو گایات کے علاقہ کا نام دے دیا گیا ہے۔

صوبہ سرحد میں کلے بمعنی گاؤں یا بستی وغیرہ اسی سلسلے کی کڑی ہے اور بستیوں کے ناموں میں سابقے کے طور پر عمومیت کے ساتھ

مستعمل ہے جیسے کہ کلے علی زئی ، کلے خادی زئی اور کلے چکر کوٹ وغیرہ ۔

مشرق پاکستان میں بھی بستیوں کے ناموں کے ساتھ اسی کے مترادف لفظ کھالی بمعنی گاؤں یا قصبہ کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں جیسے کہ نواکھالی (نئی بستی) ، پتواکھالی ، پستواکھالی اور موہا کھالی وغیرہ ۔

اگر بستیوں کے ناموں میں صرف اسی باہمی مطابقت کو ہی مدنظر رکھا جائے تو بھی یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ناموں کا یہ اشتراک اس زمانہ قبل از تاریخ کی باقیات میں سے ہے جب کہ برصغیر کے طول و عرض میں منڈا گروہ سے تعلق رکھنے والے قبائل کا طوطی بولتا تھا ۔

ان حقائق کی روشنی میں ہڑپہ و ثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وادی سندھ کی ہڑپائی تہذیب کی پیشرو 'آمری نال تہذیب' منڈا قبائل کی مرہون منت تھی اور آج سے کوئی چھ ہزار سال قبل یا اس سے بھی پہلے یہاں منڈا گروہ کی زبانوں کا چلن تھا ۔ وادی سندھ کی موجودہ زبانوں میں منڈاری کی باقیات الصالحتات کا وجود اس امر کا ایک ناقابل تردید اور زندہ ثبوت ہیں ۔

وادی سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات

(مجلس ترقی ادب، لاہور کی طرف سے انعام یافتہ)

وادی سندھ ایک ایسا جیتا جاگتا عجائب گھر ہے کہ جس میں دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں کے افراد اب بھی اپنے اپنے رسم و رواج، رہن سہن اور لباس و زبان کو برقرار رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ آج بھی انہیں ان کے خد و خال اور رنگ کی بناء پر ایک دوسرے سے ممیز کر سکتے ہیں۔ بلوچستان کے براہوئی، سرحد کے کافر، سندھ کے کٹودی اور پنجاب کے باورے اس کی زندہ مثالیں ہیں لیکن سب سے زیادہ دلچسپ یہاں کی عام آبادی کے رسم و رواج، بود و باش اور لباس و زبان کا مطالعہ ہے۔ یہاں ہمیں آریاؤں کی آمد سے لے کر یورپی قوموں کے ورود تک کے اثرات ایک دوسرے میں اس طرح سموئے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ان میں باہمی امتیاز کرنا مشکل ہے۔ آریا، ہن، سیتھیٹن، یونانی، تورانی، ایرانی، عرب اور مغربی قومیں یکے بعد دیگرے یہاں آتی رہیں اور اپنی اپنی انفرادی خصوصیات یہاں کی آبادی کو ودیعت کرتی رہیں لیکن آج ہم ایک ایسی قوم کے نقش کف پا کا تذکرہ کر رہے ہیں جسے زمانے کی گرد نے بہاری آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ اس قوم کے ساتھ ہمارے تعلقات کے بارے میں تاریخ کے صفحات بالکل خاموش ہیں۔ شاید کسی دن اگر کسی صاحب بصیرت انسان نے ہڑپہ اور موئن جو دڑو سے دستیاب ہونے والی گونگی منقش مہروں کو زبان عطا کر دی تو وہ ان گم گشتہ کڑیوں کی روداد سنا سکیں۔ اس سے ہمارا اشارہ دراوڑی قوم کی طرف ہے جو آج ہم سے کالے کوسوں دور دکن میں آباد ہے لیکن

۱۔ یہ مضمون سہ ماہی 'اردو نامہ' کراچی کے شمارہ ششم (اکتوبر، دسمبر ۱۹۶۱ء) میں شائع ہوا۔ مجلس ترقی ادب، لاہور کی طرف سے ادبی مقابلہ میں اسے ۱۹۶۱-۶۲ء کے دوران کا پاکستان بھر میں اردو زبان کا بہترین تحقیقی مضمون قرار دیتے ہوئے اس پر ایک ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔

پہاری زبان میں دراوڑی عنصر کی موجودگی کسی بیٹے ہوئے زمانے میں ایک دوسرے کے ساتھ گہرے رشتے کی غمازی کرتی ہے -

سنسکرت اور مقامی زبانیں

عام طور پر برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں کے سنسکرت الاصل ہونے کا نظریہ ایک حرف آخر کی حیثیت سے تسامیم کیا جاتا ہے - کسی متبادل نظریہ کے موجود نہ ہونے کی بناء پر آج تک کسی نے بھی اس کے خلاف قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کی - اگر کسی نے اس کے خلاف کچھ کہا بھی تو اتنی دبی زبان سے کہ اسے کچھ وقعت حاصل نہ ہو سکی لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ اس نظریہ کے حامی سوائے لغوی اشتراک کے کوئی اور اہم ثبوت بہم نہیں پہنچا سکے - جب بھی مقامی زبانوں کی صرف و نحو کا پہلو سامنے آیا تو وہ ہمیشہ متذبذب نظر آئے - پہلو تہی کے طور پر انہوں نے ان زبانوں کی اصل بجائے سنسکرت کے اس سے ملتی جلتی کسی نامعلوم زبان کو قرار دے دیا جو کہ ان کے خیال میں لغوی طور پر تو سنسکرت سے مطابقت رکھتی تھی لیکن صرف و نحو کے لحاظ سے مختلف تھی - اس نامعلوم زبان کا جس پر کہ انہوں نے قدیم ہند آریائی کا لیبل چسپاں کر دیا کوئی نمونہ پیش کرنے سے قاصر رہے -

آئرہیل ماؤنٹ سٹیورٹ الفسٹن (Mount Stuart Elphinston) نے 'تاریخ ہند' (History of India) (مطبوعہ ۱۸۵۷ء) میں مسٹر کولبروک (Cole Brooke) کی تحقیقات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ :

”دہلی میں اسلامی حکومت کے قیام کے دوران مختلف قوموں کے باہمی تعلقات اور روز مرہ گفت و شنید کے نتیجے میں ایک ایسی زبان وجود میں آئی کہ جس کی لغوی بنیادیں سنسکرت سے لگاؤ کھاتی تھیں لیکن صرف و نحو کے لحاظ سے موجودہ ہندوستانی زبان سے مشابہ تھی -“

مقصد یہ کہ صرف و نحو کے لحاظ سے یہ زبان سنسکرت سے مختلف تھی - ماہر علم النسلیات ڈاکٹر آر - جی - لیتھم (R. G. Latham) اپنی کتاب 'ہندوستانی نسلیات' (Ethnology of India) (مطبوعہ ۱۸۵۹ء) میں شمالی ہند کی زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

”سنسکرت کے مقابلہ میں یہ صرف و نحو کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں اور اگر ان کا موازنہ دراوڑی زبانوں سے کیا جائے تو یہ لغوی طور پر سنسکرت الاصل الفاظ سے بھری پڑی ہیں۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس قسم کے تضاد کی بناء پر کتنے مختلف قسم کے نظریات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو ان زبانوں کو سنسکرت الاصل قرار دیتا ہے، دوسرا گروہ دراوڑی کو ان زبانوں کا سرچشمہ بیان کرتا ہے۔ ہر ایک فریق اپنے اپنے دعوے کے حق میں ثبوت پیش کرتا ہے۔ کثرت رائے سنسکرت الاصل والے نظریہ کے حق میں ہے لیکن دوسرے فریق کے پاس بھی ٹھوس دلائل موجود ہیں۔“

سرولیم ولسن ہنٹر ’تاریخ سلطنت ہند‘ (The Indian Empire) (مطبوعہ ۱۸۹۲ء) میں شمالی ہند کی زبانوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کئی ایک ماہرین شرقیات کی رائے بیان کرنے کے بعد بیان کرتا ہے کہ :

”ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ شمالی ہند کی زبانیں براہ راست سنسکرت سے مشتق نہیں ہیں بلکہ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ سنسکرت سے بھی قدیم غالباً ویدوں کے زمانے سے پیشتر یہاں ایک ایسی آریائی زبان مروج تھی کہ جس سے سنسکرت اور قدیم پراکرتیں یعنی مقامی بولیاں وجود میں آئیں۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان دونوں زبانوں کے درمیان اختلاف کی حدیں بڑھتی گئیں۔ آخر سنسکرت نے ایک مصنوعی زبان کی حیثیت سے وہ صورت اختیار کر لی جو کہ پانینی کی گرامر (قریباً ۲۵۰ ق م) میں نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس پراکرتوں کی قدیم صورت ورہ روچی کی گرامر (قریباً ایک صدی ق م) میں ملتی ہے۔“

مشہور ماہر لسانیات سر جارج گریسن نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ’ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ‘ میں گو ہندوستانی (یعنی اردو) اور شمالی ہند کی

بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جن قبائل سے نو وارد آریاؤں کو دو چار ہونا پڑا وہ بڑے اور موئن جو دڑو کے باشندے تھے اور ان دونوں کی زبانوں کی باہمی آمیزش کے نتیجے میں نئی بولیوں نے جنم لیا جو کہ موجودہ زبانوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ یہاں اس امر کا واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ نو واردوں کی زبان نے یہاں کی مقامی زبانوں کو محض متاثر کیا ہے اور انہیں نیست و نابود کر کے کسی نئی بولی کی طرح نہیں ڈالی۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ مقامی زبانوں کی مقبولیت کے زیر اثر خود ختم ہو گئی۔ مقصد یہ کہ کسی زبان کا دوسری زبان سے متاثر ہونا اور بات ہے چاہے وہ اثرات کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں اور اس کا کسی دوسری زبان سے مشتق ہونا اور بات ہے۔ یوں تو فارسی اور ہسپانوی بھی عربی سے شدید طور پر متاثر ہوئی ہیں لیکن اس بناء پر انہیں عربی الاصل اور سامی گروہ کی شاخیں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ برصغیر پاک و ہند کے شمالی حصے کی زبانوں کی جڑیں بھی آریاؤں سے قبل کی سر زمین میں پیوست ہیں۔ ہاں! سنسکرت نے انہیں متاثر ضرور کیا ہے۔

ہڑپائی تہذیب کے لسانی پہاؤ

ایک حل طلب مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہڑپائی تہذیب کی زبان کس زمرہ سے تعلق رکھتی تھی۔ بعض حضرات محض اپنے مذہبی احساسات کی تسکین کی خاطر بغیر کوئی ثبوت بہم پہنچائے اسے عربی زبان یا اس کی شاخ قرار دیتے ہیں۔ ان میں جناب جلال ندوی صاحب اور ہارے شاعر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم پیش نظر آتے ہیں۔ اگر کسی طرح اس نظریہ کو ثابت کیا جا سکتا تو واقعی یہ کسی حد تک ہارے لیے باعث فخر ثابت ہوتا لیکن یہ نظریہ حقائق کی روشنی میں پختہ نظر نہیں آتا (اس سلسلے میں میرا مراسلہ مطبوعہ 'ماہ نو' ستمبر ۱۹۵۷ء ملاحظہ ہو)۔ بہر حال میں یہی عرض کروں گا کہ یہ حضرات اپنی جستجو جاری رکھیں کہ یہ کچھ نہ کچھ پھل تو ضرور لائے گی۔ جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہڑپائی تہذیب کے دور میں یہاں کے باشندے دراوڑی اور منڈا گروہ کے لسانی حلقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا بین ثبوت نہ صرف بلوچستان میں دراوڑی زبان بولنے والے

براہوئی قبائل کا وجود ہی ہے بلکہ مقامی زبانوں میں دراوڑی اور منڈا عنصر کی موجودگی بھی اس امر کی زندہ شہادت ہے۔ حالانکہ آریاؤں کی آمد کے بعد کسی دور میں بھی جنوبی ہند کے دراوڑی قبائل کا وادی، سندھ کے باشندوں کے ساتھ براہ راست کسی قسم کے رابطے کا ثبوت نہیں ملتا۔ معلومہ تاریخ میں دراوڑی قبائل ہمیشہ کوہ ہندھیا چل کے جنوب میں ہی آباد نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پھر یہ دراوڑی اور منڈا عنصر آریاؤں سے قبل کے عہد کی باقیات میں سے ہی ہو سکتا ہے۔ مجھے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ یہ مضمون حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ تحقیق و تدقیق کی راہیں کبھی مسدود نہیں ہوئیں۔ ہاں غالباً اس پہلو میں یہ حرف اول کی حیثیت ضرور رکھتا ہے۔

آریائی یا دراوڑی

ایک وقت تھا کہ ماہرین سنسکرت دنیا کی تمام تر تہذیب و تمدن کا سرچشمہ، صرف آریائی قوم کو ہی تسلیم کرتے تھے اور ان کی زبان کو ام اللسان کا درجہ دیتے تھے۔ گو ان کی تحقیقات کی بدولت انسانی معلومات میں ایک بیش بہا اضافہ ہوا ہے لیکن اپنے مخصوص مطالعے اور ایک طرف رجحانات کی وجہ سے انہوں نے غیر ارادی طور پر تاریخ اور زبان سے تعلق رکھنے والے کئی ایک مسائل کے بارے میں اکثر غیر متوازن نظریات قائم کر لیے تھے جو کہ ان کے دیگر تحقیقی کارناموں کے ساتھ ساتھ ایک امر مسلمہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ ان نظریات کی مقبولیت کی بناء پر کسی کو ان کی تردید کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ برصغیر پاک و ہند کے شمالی حصے کی زبانوں کے سنسکرت الاصل ہونے کا نظریہ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ ان زبانوں اور سنسکرت کی صرف و نحو کے درمیان بنیادی اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل ہونے کے باوجود صرف کچھ لغوی مطابقت کی بناء پر اس نظریہ کی بنیادیں قائم کر دی گئیں اور آج تک یہ ایک ناقابل تردید حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اس قسم کے واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے 'آریاؤں کی اصل' (The Origin of The Aryans) کے فاضل مصنف جناب آئزک ٹائلر (Issac Taylor) نے لکھا ہے کہ :

”خوش قسمتی سے ماہرین سنسکرت کے غاصبانہ اور وقتی نظریات کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ جلد بازی میں اخذ شدہ لسانیاتی نظریات کا آثار قدیمہ، علم الکاسیات، علم الانسانیات، علم الطبقات الارض اور عقل سلیم کی روشنی میں نئے سرے سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔“

مسٹر آئزک ٹائلر نے سنسکرت اور دراوڑی زبانوں کے باہمی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”سنسکرت کے علاوہ آریائی زمرہ کی تمام دیگر زبانیں لٹوی اصوات سے یکسر مبرا ہیں جو کہ خالصتاً دراوڑی صوتیات کی خصوصیات میں سے ہے۔ سنسکرت کی صوتیات میں اس خصوصیت کا پایا جانا اس پر دراوڑی اثرات کا واضح ثبوت ہے۔“

سنسکرت کا دراوڑی سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ بقول پروفیسر جسٹی (Justi) :

”وادی سندھ میں وارد ہونے والے آریائی قبائل تعداد میں مقامی آبادی کی نسبت نہایت کم تھے اور ان کے ساتھ بہت کم عورتیں تھیں۔ یہاں آنے پر انہوں نے مقامی آبادی سے بیویاں حاصل کیں اور یہیں آباد ہو گئے۔“

اس کے نتیجے میں باہمی میل جول اور بات چیت کی بدولت نوواردوں کی طرز معاشرت، رسم و رواج، مذہب اور زبان کا مقامی عناصر سے متاثر ہونا لازمی امر تھا۔

دراوڑی زبانوں کے عالم بشپ رابرٹ کاڈویل (Rev. Robert Caldwell) نے آریاؤں کے وادی سندھ میں ورود کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ :

”آریاؤں کی آمد سے قبل یہاں بسنے والے قبائل تعداد کے لحاظ سے غالباً ان کی نسبت بہت زیادہ تھے جن پر اگرچہ آریاؤں نے فتح ضرور حاصل کر لی لیکن مقامی آبادی نیست و نابود نہیں ہوئی بلکہ آہستہ آہستہ وہ آریائی معاشرہ میں جذب ہو کر اس

قوم کا ایک حصہ بن گئی اور فاتح قوم کے بہت سے رسم و رواج اور لغوی سرمایہ کا کچھ حصہ اپنا لیا لیکن اکثریت میں ہونے کی بناء پر انہوں نے بھی آریائی تمدن، مذہب اور زبان پر گہرا اثر ڈالا ہوگا۔“

عام طور پر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ شمالی ہند کی زبانوں میں ملنے والے تمام تر الفاظ کی اصل کو سنسکرت سے ملایا جائے۔ لیکن کسی لفظ کا مقامی زبانوں اور سنسکرت دونوں میں پایا جانا اس کے آریائی الاصل ہونے کی دلیل نہیں، تاوقتیکہ ایسے الفاظ کا سراغ خود آریائی کتبے کی دوسری زبانوں میں بھی نہ مل جائے۔ خود ویدوں کی زبان بھی مقامی اثرات سے مبرا نہیں۔ سنسکرت صرف و نحو پر بھی وادی سندھ کی مقامی زبان کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ مشہور ماہر سنسکرت ڈاکٹر میکڈانل (A. A. Macdonell) کا قول ہے کہ:

”کلاسیکی سنسکرت صوتی لحاظ سے ویدوں کی زبان سے بعینہ مشابہت رکھتی ہے لیکن صرف و نحو کے لحاظ سے یہ اس سے مختلف ہے۔ خاص طور پر اس میں صرف و نحو کی کئی ایسی شکلیں یکسر شائب ہیں جو کہ ویدوں کی زبان میں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ لغوی پہلو میں بھی نمایاں تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔“

صاف ظاہر ہے کہ وہ سنسکرت جو کہ پانینی نے پیش کی ہے مقامی اثرات کے تحت آریاؤں کی قدیم زبان سے مختلف شکل اختیار کر چکی تھی۔ بلکہ میکڈانل کے نظریہ کی رو سے خود ویدوں کی زبان بھی مقامی اثرات سے محفوظ نہیں۔ ڈاکٹر سینٹی کمار چیٹر جی نے بھی اس امر پر صاف کیا ہے کہ ویدوں کی زبان میں کئی ایک دراوڑی الفاظ موجود ہیں جیسے کہ پھل، نیلا، ول (خوبصورت)، شام اور پوجنا وغیرہ۔

مقامی زبانوں کا سرمایہ الفاظ

برصغیر پاک و ہند کے شمالی حصے کی زبانوں کے سرمایہ الفاظ کو متقدمین نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایسے الفاظ جو کہ بغیر کسی تبدیلی کے سنسکرت سے مستعار لے گئے ہیں، انہیں ’تت سم‘ کہا گیا ہے۔ سنسکرت الاصل الفاظ جو کہ مقامی زبانوں میں آنے کے بعد تبدیل

ہو گئے ہیں 'ترہو' کہلاتے ہیں۔ تیسری قسم کے الفاظ کو 'دیساجا' یعنی دیسی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ حصہ غیر سنسکرتی عناصر پر مشتمل ہے اور لا محالہ یہاں کی قدیم غیر آریائی یعنی دراوڑی اور منڈا زبانوں سے ورثہ میں ملا ہے۔ مقامی زبانوں میں پہلی قسم کے الفاظ کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ سنسکرت اصل کے الفاظ زیادہ تر دوسری صورت میں موجود ملتے ہیں لیکن ان کے سرمایہ الفاظ کا ایک بڑا حصہ تیسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

ایک وقت تھا کہ شمالی ہند کی زبانوں کو براہ راست آریائی نوواردوں کی زبان سنسکرت سے مشتق قرار دیا جاتا تھا لیکن جب موجودہ لسانیاتی تحقیق نے اس نظریہ کی بے بضاعتی کا ثبوت مہیا کر دیا تو اس نظریہ کے حامیوں نے جھٹ اس میں ترمیم کر لی کہ یہ زبانیں سنسکرت سے نہیں بلکہ اس سے ملتی جلتی ایک قدیم آریائی زبان سے مشتق ہیں۔ لیکن وہ اس 'ملتی جاتی' زبان کے وجود کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کا یہ ترمیم شدہ نظریہ بھی حقائق کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ زبانیں سنسکرت پر مقامی اثرات کی بناء پر وجود میں نہیں آئیں بلکہ اس کے برعکس یہاں کی قدیم زبانوں پر آریائی زبان کے لغوی اثرات کا نتیجہ ہیں۔ یعنی ان کی بنیادی ہیئت پر آریائی زبان کوئی قابل ذکر اثر نہیں ڈال سکی۔

مقامی زبانوں کی صرف و نحو کے غیر آریائی ہونے کا نظریہ تو اب ایک امر مسلمہ کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ لیکن ماہرین ابھی تک اس بارے میں متفق نہیں ہو سکے کہ ان زبانوں کے سرمایہ الفاظ میں غیر آریائی عناصر کا تناسب کیا ہے۔ علماء کے ایک طبقے کا جس میں برائن ہاجسن (Brian Hodgson)، رابرٹ کاڈویل (Robert Caldwell)، ڈاکٹر گنڈرٹ (H. Gundert)، پادری کٹل (F. Kittel) اور ارنسٹ ٹرمپ (Ernest Trumpp) وغیرہ شامل ہیں۔ خیال ہے کہ مقامی زبانوں میں غیر آریائی عنصر کا تناسب کافی زیادہ ہے۔ ڈاکٹر ٹرمپ نے اپنی تصنیف 'سندھی زبان کی گرامر' (Grammar of The Sindhi language) میں بیان کیا ہے کہ سندھی زبان کے الفاظ کا جو کہ لٹوی اصوات کے حامل ہیں قریباً تین چوتھائی حصہ سیتھنی یا تاتاری (دراوڑی اور منڈا) حلتہ کی

زبانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاید ایک دن ایسا آئے کہ جب اس غیر آریائی عنصر کا کھوج لگانا ممکن ہو سکے کہ وہ کہاں سے ایک آریائی (یعنی سندھی) زبان میں داخل ہوا۔ بشپ کاڈویل کا خیال ہے کہ شمالی ہند کی زبانوں کے سرمایہ الفاظ کا تقریباً دسواں حصہ غیر آریائی عنصر پر مشتمل ہے اور مرہٹی میں اس عنصر کا تناسب بیس فی صد ہے۔ اگر پنجابی زبان کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی دراوڑی اور منڈا زبانوں کا اتنا عنصر موجود ہے کہ اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس عنصر کا صحیح تناسب کیا ہے؟ فی الحال اس بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس کے لیے ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

برصغیر کی قدیم زبانیں

برصغیر پاک و ہند کی زبانوں کے تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے قبل یہاں تین مختلف لسانی حلقوں کا دور دورہ تھا: اول پہاڑی زبانیں جسے عام طور پر تبتی و برمی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا سلسلہ لداخ سے شروع ہو کر برصغیر کے شمالی سلسلہ ہائے کوہ کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا برما، سیام، انام اور ہند چینی تک جا پہنچا ہے۔ اس میں لداخ، کہاؤں، نیپال، بھوٹان، سکیم اور ناگا قبائل کے علاقے شامل ہیں۔ اس لسانی گروہ نے شمالی ہند کی زیرغور زبانوں پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا۔ گو ہارے سرمایہ الفاظ میں کوئی کوئی لفظ اس زمرہ کا بھی نظر آ جاتا ہے لیکن مجموعی طور پر ہاری زبانوں کے لسانیاتی مطالعے میں اس زمرہ کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں۔

دوسری بھیل، کول اور سنتھال وغیرہ قبائل کی زبانیں ہیں جنہیں کہ منڈا حلقے کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ زبانوں کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس گروہ کو زمانے کے لحاظ سے دراوڑی حلقہ پر سبقت حاصل ہے۔ برصغیر میں منڈا قبائل دراوڑوں سے بھی پہلے موجود تھے۔ دراوڑوں کے ورود کے بعد یہ قبائل کہیں ان کے ساتھ مل جل کر آباد رہے اور کہیں الگ تھلگ۔ شمالی ہند کی زبانوں پر اس گروہ کے اثرات کافی گہرے ہیں اور ان زبانوں کا جائزہ لیتے وقت اس گروہ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا سکتا۔

تیسرا لسانی گروہ دراوڑی زمرہ سے تعلق رکھنے والی زبانوں پر مشتمل ہے۔ موجودہ دور میں یہ زبانیں زیادہ تر جنوبی ہند کے خطہ میں مروج ہیں۔ بلوچستان میں براہوئی قبائل کی زبان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ تامل، تلگو، ملیالم، کناری اور گونڈی وغیرہ اس کی اہم شاخیں ہیں۔ ابھی تک برصغیر کے شمالی حصے کے لسانی مطالعے کے لیے دراوڑی زبانوں کو قابل التفات نہیں سمجھا گیا گو ان زبانوں پر دراوڑی اثرات اتنے گہرے اور وسیع ہیں کہ اس پہلو میں سنسکرت کو محض ایک ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

پنجابی اور دراوڑی

پنجابی زبان کی ہی مثال لیجیے۔ یہ نہ صرف ایک وسیع علاقے میں مروج ہے بلکہ اس کا دامن بے شمار زبانوں کے سرمایہ الفاظ سے بھرپور ہے۔ بیرونی زبانیں مثلاً عربی، فارسی، ترکی، یونانی، پرتگیزی اور انگریزی تو ایک طرف، خود اس برصغیر کی مختلف زبانوں کے اثرات بھی مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ اس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ اسے باقی ہم عصر علاقائی زبانوں پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ اس سے مقصد صرف اتنا ہے کہ چونکہ پانچ دریاؤں کی سر زمین نے برصغیر کی تاریخ کی تشکیل میں ہمیشہ ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور پھر یہ علاقہ مختلف تہذیبی لمہروں کی آماجگاہ بنا رہا ہے اس لیے یہاں کی زبان کو صرف لسانی مطالعے کے لیے ایک نمائندہ زبان کے طور پر شمار کیا جا سکتا ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان کی مثالیں پیش کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مادری زبان ہونے کی حیثیت سے میں اس بارے میں پورے وثوق سے بات کر سکتا ہوں۔

تقابلی جائزے کی خاطر ہم مصدر 'مارنا' بمعنی 'زد و کوب کرنا' کی مثال لیتے ہیں۔ مارنا خود سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ انہی معنوں میں 'پیٹنا' کا لفظ غالباً آریائی الاصل ہے لیکن سنسکرت میں نہیں ملتا۔ شاید یہ انگریزی لفظ بیٹ (beat) کا ہم اصل ہو یا پھر اس سے مشتق ہو۔ انہی معنوں میں مندرجہ ذیل دراوڑی الفاظ معمولی تبدیلی کے ساتھ یہاں کی عام بول چال میں مروج ہیں:

تلگو، کناری، تامل، کٹو: مارنا، پیٹنا۔ پنجابی شینا: کٹنا بمعنی مارنا۔

ملیالم : کٹوکا : ضرب لگانا - کوہستانی : پیسنا ، کوٹنا وغیرہ
 براہوئی : کشنگ : پیٹنا - اردو : کوٹنا
 براہوئی : کھالد بمعنی مارنا - پنجابی : کھلنا
 گونڈی : جم ، ، ، - پنجابی : جھمبنا
 سنتھالی : منڈاری (منڈاگروہ) : دل بمعنی مارنا ، کوٹنا ، پیسنا وغیرہ
 پنجابی : دلنا بمعنی مارنا ، پیسنا

روزمرہ بول چال کی پنجابی زبان میں دراوڑی اور منڈا گروہوں کے کتنے ہی ایسے الفاظ ملیں گے کہ یا تو ان کی ہیئت میں فرق آچکا ہے یا معنی میں کسی حد تک تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر پنجاب کے دیہاتوں میں جب ماں ذرا ناراضگی سے بچوں کو کھانا کھانے کے لیے کہتی ہے تو اکثر 'کھانن لا' یا صرف 'نن لا' کے الفاظ استعمال کرتی ہے یعنی نن نا بمعنی کھانا۔ تامل ، کناری اور تلگو میں کھانے کو 'تنو' اور ملیالم میں 'تنوکا' کہتے ہیں اور اس کے معنی عام طور پر 'نگلنا' یا بھوکوں کی طرح کھانا وغیرہ کے ہیں۔ تائے کانوں سے تبادل عام ہے۔ سندھی میں کھانے کو 'جم' اور پنجابی میں جھمبنا کہتے ہیں (پنجابی : اوہ بیٹھا بیٹھا دس روٹیاں جھمب گیا یعنی وہ بیٹھا بیٹھا دس روٹیاں کھا گیا)۔ یہ الفاظ منڈا حلتے کی زبانوں ساورا ، سنتھالی اور منڈاری وغیرہ میں انہی معنوں میں استعمال ہونے والے لفظ 'جام' یا 'جومے' کی ہی ایک شکل ہے۔ اسی طرح پنجابی میں کھانے کے لیے گھتنا بمعنی ٹھونستا کا لفظ بھی مستعمل ہے جیسے کہ 'چھیتی چھیتی کھا گھت لا' یا صرف 'چھیتی چھیتی گھت لا' بمعنی 'جلدی جلدی کھالے' یہ لفظ انہی معنوں میں دراوڑی زبانوں میں مستعمل ہے جیسے کہ تامل : کتو کو بمعنی نگلنا ، ٹھونسنا اور تلگو : گتو کو بمعنی چٹ کر جانا ، دوسروں کا جھوٹا کھانا وغیرہ۔ ایسے ہی اگر بچے ماں کو کھانے کے لیے زیادہ تنگ کر رہے ہوں تو وہ غصے سے کہتی ہے 'جرا سا، لٹو ہنے توسا پکا دنی آن' یعنی ذرا سانس لو ابھی توسا پکا دیتی ہوں۔ اب یہ 'توسا' روٹی کے لیے تامل : توشائی ، ملیالم ، کناری اور تلگو : دوسا کی ہی ایک صورت ہے۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ یہ فارسی توشہ بمعنی زاد راہ سے مشتق ہے لیکن غصے اور زاد راہ میں کوئی نسبت معلوم نہیں ہوتی۔

پنجابی اور دراوڑی زبانوں میں گھر کے لیے بھی مشترک الفاظ ملتے ہیں جیسے کہ :

تامل ، ملیالم : کٹی - کناری : گڈی بمعنی گھر - پنجابی : کھڈی
 کھڈا بمعنی چھوٹی کوٹھڑی ، کھڈا بمعنی دڑبہ یا گھونسلہ وغیرہ بھی
 مستعمل ہے - اسی طرح تامل ، ملیالم : ال - کناری : الو بمعنی گھر -
 پنجابی : آلا بمعنی گھروندا ، آلا بمعنی گھونسلہ -

اسی طرح 'چندہ' کا لفظ لے لیجیے - اخباروں ، رسالوں کا سالانہ
 چندہ ، مسجدوں ، یتیم خانوں وغیرہ کے روز روز کے چندے اور اس کے
 ساتھ چندہ خیروں کی ایک جماعت - یہ لفظ بھی دراوڑی باقیات میں سے
 ہے اور تامل : تنتو ، ملیالم : تنتو کا ، تلگو : تندو اور کناری : ڈنڈ
 بمعنی محصول کے مترادف ہے - علاوہ ازیں پنجابی ڈنڈ بمعنی جرمانہ بھی
 اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے - اسی طرح چنگی (محصول) بھی انہی معنوں
 میں استعمال ہونے والے تلگو لفظ 'سنکم' اور ملیالم : 'چنگم' سے مشتق
 ہے -

مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پنجابی زبان میں زندگی کے قریب قریب
 ہر شعبے سے متعلق سرمایہ الفاظ میں دراوڑی عنصر موجود ہے - اس
 دراوڑی عنصر کی موجودگی کو محض ایک اتفاقی امر کہہ کر نظر انداز
 نہیں کیا جا سکتا - یاد رہے کہ کئی ایک دراوڑی الاصل الفاظ بظاہر
 سنسکرت سے مشتق نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر ایسے
 الفاظ خود سنسکرت نے مقامی زبانوں سے مستعار لیے ہیں کیونکہ یہ
 الفاظ یا ان کے ہم الاصل الفاظ آریائی کنبے کی دیگر زبانوں میں نہیں
 ملتے -

دراوڑی ، اردو اور پنجابی کا مشترکہ سرمایہ الفاظ

ذیل میں ہم زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق سرمایہ الفاظ کا
 مختصر سا جائزہ پیش کرتے ہیں تاکہ دراوڑی اور وادی سندھ کی زبانوں
 کے باہمی تعلقات کا کچھ اندازہ لگایا جا سکے :

تقابلی خاکے

مشرقی پاکستان کی زبانیں

دراوڑی گروہ کی زبانیں

نمبر شمار	تامل	ملیالم	کناری	تلگو	دیگر	معنی	پنجابی	اردو	معنی
۱	مکم مورائی	مکم	مورا	مکامو مورا	کولامی : مکم } کورخ : مک	ممنہ ، چہرہ ، سامنا	مکھیا	مکھیا	ممنہ ، چہرہ ، سامنا
۲	مومشی	موفی	موفی	مومو	ٹوٹا : موم ٹوٹا : مومار	سامنا ، شروع ، بڑائی	مکھٹرا	مکھٹرا	ممنہ ، چہرہ ، سامنا
۳	وے	وے	بھئی	—	براہوئی : بھئی	ممنہ	وات (ملاقات)	—	ممنہ (سندھی : وات)
۴	مسونٹ	مسونٹ	مسونٹ	—	پارجی : مسونٹ	چوچ ، ہونٹ ، تھو تھنی	سن	مسونٹ	تھو تھنی ، ہاتھی کا مسونٹ سندھی : مسونٹ (سونٹ) جیٹرا
۵	—	—	ڈاواے	ڈواڈے	—	جہڑے ، رخسار	جیٹرا	جہڑا	—

سر ، چوٹی ، سقف دہن	تالو	تالو	سر ، چوٹی ، تالو	گوئندی : تالا ٹوٹا ، کوٹا : تال کو لاسی ، کوئی : تالو	—	تالا	تالا	تالاق	۶
وہ داڑھی جو صرف ٹھوڑی پر ہو	—	کھودی	ٹھوڑی ، وہ داڑھی جو صرف ٹھوڑی پر ہو	گڈا : تولو گڈامو	—	گڈا	—	—	۷
سر کے گوندھے ہوئے بال بالوں کا جوڑا	چوٹی	جوڑا	بالوں کا جوڑا ، کلہسی ، تاج ، بالوں میں پھول سجانا ، گوندھے ہوئے بال	کو ڈاگو : چوٹی پار جی : چوٹا	—	سوڈو	چوٹی کا	چوٹی	۸
نرم بال ، آن	—	مُبر	ملائم بال ، نرم پر ، پلکیوں یا ابروؤں کے بال	کو لاسی : مُبور ٹائیکی : مُبر	—	—	مُبوٹا	—	۹
اون ، نرم بال	پشیم	پشیم	اون ، نرم بال	—	پوچو	پوچو	—	پُوچو	۱۰
گردن ، گڈا	گردن	گڈا	گردن	گڈا با : گڈو تولو : کنٹیپلو	گڈنو	گانو	کوٹنو	کوٹنو	۱۱
حلق و غیرہ	—	گھنڈی	—	براہوئی : کچھ	—	—	—	—	۱۲
بغل	—	کچھ	بغل	—	—	—	—	—	

مغربی پاکستان کی زبانیں

دراوڑی گروہ کی زبانیں

معنی	اردو	پنجابی	معنی	دیگر	تلگو	کناری	ملیالم	تامل	نمبر شمار
پستان	—	مما	پستان ، دودھ	تولو : تما پارجی : سما	—	ممو	—	—	۱۳
پیت (خاص کر پرندوں کیلئے)	—	پوٹا	پیت	تولو : پوٹ کولامی ، پارجی : پوٹا	پوٹا	پوٹ	—	—	۱۴
پیت	پیت	—	بڑا پیت	تولو : توند	—	—	ٹوٹی	ٹوٹی	۱۵
بڑا پیت	توند	—	بڑے پیت والا	—	ڈوڈو	—	—	—	۱۶
بڑے پیت والا	—	ڈھڈو	پندلی	براہوئی : پنی	—	—	—	—	
پندلی	پندلی	پنجینی							

رشتہ جات

عورت	ماں ، دادی ، بزرگ عورت	اماں	استاں	ماں ، دادی ، بزرگ عورت	استاں	براہوئی : استاں	استاں	استاں	استاں	استاں
------	------------------------	------	-------	------------------------	-------	-----------------	-------	-------	-------	-------

ماں ، دادی ، بزرگ عورت

ماں

ماں (آپا : بڑی بہن)

دائی ، بچوں کے لیے
رکھی ہوئی خادمہ

تایا کے گھر والی

باپ

باپ کا بڑا بھائی

دادا

بڑی بہن

ماں کا بھائی

ماموں کی بیوی

مائی

امبو

امبڑی

بے بے

آیا

تائی

اپتا

تایا

دادا

آپا

ماموں

مائی

مامی

ماں ، دادی

ماں

ماں

رضاعی ماں

ماں

باپ

باپ ، دادا

بڑی بہن

ماموں

مائی

—

—

تولو : آپے

—

—

—

—

—

براہوئی : ساما

تولو ، پارچی : مامی

—

—

اپتا

—

—

اپتا

—

آپا

ماما

—

—

—

امبا

—

—

—

اپتا

—

—

ماما

—

—

—

—

—

تائی

آپن

تاتن

—

مامن

—

امائی

—

—

آئی

تائی

آپن

تاتتا

آپی

مامن

مامی

۲

۳

۴

۵

۶

۷

۸

مغربی پاکستان کی زبانیں			دراوڑی گروہ کی زبانیں						
معنی	اردو	پنجابی	معنی	دیگر	تلاگو	کناری	ملیالم	تامل	نمبر شمار
دلہن ، بیوی	—	وہی	دلہن ، بیوی ، عورت	—	اٹاڈی	—	—	وٹووائی	۹
چولستانی (پنجابی) : کٹڑی بھٹی بیوی ، بہو	—	—	بیوی بہو	گوڈائی : گڈی گوڈائی : کورپار گوڈائی : کورل	کوڈائیو	—	—	—	۱۰
سندھی :- کنوار : بیوی	—	سوکن	بیوی	گوڈائی : اسکینا	—	—	—	—	۱۱
دوسری بیوی ، سوت	—	ننان	نند : خاوند کی بہن	—	—	—	—	ناتٹون	۱۲
خاوند کی بہن	نند	سہیلی	سہیلی ، نوکرانی ، عورت	—	چیلی	—	—	چٹلاتی	۱۳
سکھئی	سہیلی	سہیلی		—					
بیوی کی بہن	ساک	ساک							

ملتانفی، تولی (پنجابی) ، سندھی :-

زال : بیوی ، عورت

چھوٹا (خالبا اردو 'لوڑکا' بھی

اسی سے مشتق ہے)

چھوٹی

نسبت ٹھہراانا۔ شادی کی پہلی رسم

شادی کی ایک رسم جب کہ شادی

سے کچھ دن پہلے عورت کو

علاجہ کمزے میں بٹھوادیتے ہیں

شادی

قبیلہ ، خاندان ، رشتہ دار

سندھی :- کسٹیب : قبیلہ ، خاندان

سور ، سورال ، سوسر کا خاندان

شادی کی رشتہ داری

لوڈا

چھوٹا ، چھوٹی عمر کا

گوندی : لوڈا

لیٹا

—

—

۱۳

لوڈی

واپستہ پونا، شادی کرنا،

مالتو : مانیئے

ماتو

—

مانا

۱۵

منگنی

منگنا

ماٹیاں

تولو : بی گے

ویامو

—

—

۱۶

—

ویاہ

—

—

—

—

—

کیاہ

شادی کا رشتہ

—

—

—

—

—

کنہی

گھر ، گھرانہ ، خاندان ،

تولو : بی گے

—

—

—

—

—

گھڑما

—

—

—

—

—

—

گھڑم

—

—

—

—

—

—

گھڑم

—

—

—

—

—

—

گھڑمائی

—

—

—

—

—

مغربی پاکستان کی زبانیں

دراوڑی گروہ کی زبانیں

معنی	اردو	پنجابی	معنی	دیگر	تلاگو	کناری	ملیالم	تامل	زیر شمار
گائے بھینسوں کا گھ	—	وگ	گائے بھینسوں کا گھ	براہوئی : بگ	—	—	—	—	۹
اونٹنی	—	ڈاچی	اونٹنی	براہوئی : ڈاچیہ	—	—	—	—	۱۰
طوطا (سندھی : طوطو)	طوطا	توتتا	طوطا	—	—	—	تاتتا	تاتتائے	۱۱
فاختہ	—	گھگی	فاختہ	—	—	—	گٹووا	گٹووا	۱۲

سامان خورد و نوش

پانی	—	نیر	پانی	پانی	تولو : نیرو	نیرو	نیر	نیر	نیر	پوٹائی	۱
پانی	پانی	پانی	پانی	پانی	—	—	پوٹال	پوٹال	پوٹائی	۲	

(منڈا اور دراوڑی گروہ میں مشترک)

روٹی (سندھی : روٹی)	روٹی	روٹی	روٹی	روٹی	تولو : اوڈے	روٹ	روٹی	روٹی	—	۳
پڑی روٹی : روٹی پشتو :- ڈوڈے : روٹی	—	روٹ	روٹ	روٹ	تولو : اوڈے	—	—	—	—	۴
ہلکی روٹی	چپاتی	چپاتی	باریک روٹی	باریک روٹی	گولامی : اِباتی ٹائیگی : اِبات	—	—	—	—	۵
چاول	—	مونجی	چاول	چاول	کوڑے، کوئی } مانجی کورخ،	—	—	—	—	۶
موٹا چاول (بھتم، اسی سے مستق ہے)	بھات	—	وہ چاول جس کا چھلکا ابھی نہ اتارا گیا ہو	وہ چاول جس کا چھلکا ابھی نہ اتارا گیا ہو	—	—	—	باتا	—	۷
—	چاول	چول	چاول	چاول	قدیم تامل : چور	—	—	—	سور	۸
غلہ کوئی بھی کھانے کی شے نیز ابلے ہوئے دال چاول	اناج	اناج	خوراک، ابلے ہوئے چاول ابلے ہوئے دال چاول	خوراک، ابلے ہوئے چاول ابلے ہوئے دال چاول	تولو : انسو	—	انی	آن	آن	۹
پاپڑ چھوٹی ڈبل روٹی	پاپڑ	پاپڑ	پاپڑ	پاپڑ : چنے کی کاغذی روٹی	تولو : پاپڑم	—	پاپڑی	پاپڑم	پاپڑم	۱۰
بیسن کا سالن حلو	—	کڑھی	کڑھی	سبزی یا گوشت	—	—	کڑی	کڑی	کڑی	

مشرقی پاکستان کی زبانیں

دراوڑی گروہ کی زبانیں

نمبر شمار	تامل	ملیالم	کناری	تلاگو	دیگر	معنی	پانڈی	ارڈو	معنی
۱۱	—	—	آنڈی	—	تولو ، کوٹا : آنڈی ٹوڈا : آڈی	کھو کھلے بانس کابر تن دودھ دوہنے کابر تن ، مٹی کابر تن	پانڈیا	سالن بنانے کے لیے مٹی کابر تن	—
۱۲	کوٹی	—	کوڈی	—	کوڈاگو : کوڈی	ابالنا ، گرم کرنا	کاڑھنا	ابالنا ، اچھی طرح پکانا	—
۱۳	—	اٹٹو	اڈ کے	—	تولو : اڈی گے	پکانا ، ابالنا	—	بھوننا ، بگھارنا	—
۱۴	تالی	تالی کا	تالی سوا	تالنجو	—	تلا ، بھوننا ، بگھارنا	تلا	—	—
۱۵	کٹٹو	—	کٹا	گٹو	تولو : گٹو	مترش	کھٹنا	کھٹنا	مترش
۱۶	کار	کارم	کارا	کارو	براہوٹی : کھارین	نمکین ، تلخ	کھارا	کھاری	بہت نمکین
۱۷	کاڑو	کاڑوکا	—	—	—	گڑوا	کوڑا	کوڑا	گڑوا (سندھی : کوڈو)
۱۸	مٹی	مٹونیم	مٹوٹیا	مٹوٹی	براہوٹی : مٹی	گدو	توٹبا	—	خشک گدو

بیگن (سندھی : واگن)	بینگن	وینگن بتاؤں بھٹھے	بینگن	کو لاسی : ونکے مالتو : بشنگو	ونکا	بدنے	—	—	۱۹
مٹر (سندھی : مٹر)	مٹر	مٹر	مٹر	کو ڈاگو : مُنڈرے	—	—	مو مٹرا	مٹرائی	۲۰
مولی (سندھی : موری)	مولی	مولی	مولی	تولو : مولانگی	مولانگی	مولانگی	مولانگی	مولانگی	۲۱
ماش کی دال	آرد	—	ماش کی دال	—	—	آردو	آرتنو	آرتنو	۲۲
(سندھی : مسج)	مسج	مسج	کالی مسج	—	—	—	—	ملکو	۲۳
—	—	—	سرخ مسج	کوٹا : ماشو	—	—	ملا کٹو	—	—
جیسے شکر گندی بمعنی میٹھی جڑ	—	گندی	گنٹھی دار جڑ	تولو : کندی	گلا	گدی	—	کنٹ	۲۴
قل	قل	قل	قل	کو ڈاگو : ایل	—	ایل	ایل	ایل	۲۵
الانچی	الانچی	لاچی	الانچی	کو ڈاگو : ایل کی	ایل کی	ایل کی	—	—	۲۶
ناریل	کھوپرا	کھوپا	ناریل	تولو : کوپرا	کوپری	کوپری	کوپرا	کوپاری	۲۷

ضروریات خانہ داری

نمبر شمار	دراوڑی زبانوں میں عہد و میت کے ساتھ مستعمل	معنی	پنجابی	اردو	معنی
۱	آری	کاٹنا	آری	آری	لکڑی چیرنے کا آلہ (دانت + آری) درانتی دانت آری کی تقابلی صورت
۲	آرا	کیڑا ، دھجی	دانتی	—	کیڑے کا چھوٹا ٹکڑا
۳	آلے	پیلنا	ایرا	پیلنا	چارپائی
۴	کٹلی	چارپائی	کھٹ	کھاٹ	چارپائی
۵	کڑک	دروازہ	کھٹری	—	چھوٹی چارپائی
۶	کرتھی	چھج	کھڑک	کوڑ	دروازہ
۷	کوڈا	سکا ، گھڑا	کرندی	—	سکاروں کا چھج نما اوزار
			گھڑا	گھڑا	—

ایک کوزہ نما برتن ہانڈی	—	گڑوا کٹیوی
کدال	کدالی	گندھالی
مشکیزہ	—	کٹونا
چھوٹی ٹوکری	—	گوٹا
گھڑا	—	چائی
—	چٹائی	چٹائی
کیلا	کھوٹونا	—
دھاگہ رسی ، ڈوری	—	تند
دھاگہ ، رسی	ڈوری	ڈور
دستیناہ	چمٹا	چمٹا
دیوار	—	گندھ

پانی ڈالنے کا چھوٹا برتن	پانی ڈالنے کا چھوٹا برتن
ایک قسم کی گیتی	پانی کا برتن
پانی کا برتن	چھوٹی ٹوکری
مٹی کا برتن ، مٹی کا گھڑا	مٹی کا برتن ، مٹی کا گھڑا
چٹائی	چٹائی
کیلا	کیلا
دھاگہ	دھاگہ
رسی ، دھاگہ	رسی ، دھاگہ
دستیناہ	دستیناہ
دیوار	دیوار

کٹوا	کٹوا	۸
کنٹالی	کنٹالی	۹
کونانی	کونانی	۱۰
کوٹا	کوٹا	۱۱
چائی	چائی	۱۲
چٹا	چٹا	۱۳
گوٹا	گوٹا	۱۴
تنتو	تنتو	۱۵
ڈار	ڈار	۱۶
چمٹا	چمٹا	۱۷
گوڈا	گوڈا	۱۸

نمبر شمار	در اوڑی زبانوں میں عمومی کے ساتھ مستعمل	معنی	پنجابی	اردو	معنی
۱۹	کٹکی	کھڑکی	کھڑکی	کھڑکی	—
۲۰	رجو	رسا	رسا	رسا	بڑا رسا
۲۱	چھاتار	چھاج	چھج	چھاج	چارپائی
۲۲	منچم	چارپائی	منچی	—	پتھر کا چپٹا ٹکڑا
۲۳	سل	پتھر	سل	سل	طستری
۲۴	تالی کا	طستری	تھالی	تھالی	بیشہنے کی چٹائی ، تخت ، سجادہ نشینی
۲۵	گدوگ	بیشہنے کی جگہ ، تخت	گندی	گندی	سندھی :- گندی : ایضاً

زیورات و ملبوسات

دستار لگام کی رسی	پگڑی باک	پک پگڑی واک	رسا	اکا، پکا	۱
دامن ، دوپٹے کا سرا	انچل	—	سر پر لپیٹنے کا رسا یعنی پگڑی	تلکو : تالا پک	۲
سادہ کناری طلاقی یا روہلی کناری	گوٹا	گوٹ گوٹا	دامن ، کیڑے کا سرا	انسو	۲
ریشم	—	پٹ	کیڑے کا کنارہ ، کیڑوں کے کناروں پر لگائی جانے والی کناری	گوٹو	۳
چہلی (پشتو : چیل)	چیل	چیل	ریشم	پٹو	۴
جوئے	—	کھیرٹی	جوئے	چپالو ، اسپل	۵
جوئے	—	لتر	جوئے	کیری	۶
دھونی ، لنگوٹ	کچھ	کچھا	جوئے	برابوئی : لتر	۷
جوئے ، پاؤں	—	کہلا	لنگوٹ	کچ	۸
			پاؤں	کال	۹

نمبر شمار	دراوڑی زبانوں میں عمومی کے ساتھ مستعمل	معنی	پنجابی	اردو	معنی
۱۰	اٹی کائے	سونے کے سکوں یا قیمتی پتھروں سے بنا ہوا ہار	تتکا	—	چاندی یا سونے کے سکوں سے بنا ہوا ہار
۱۱	اوٹو	بچوں کے سونے یا چاندی کے کڑے	پاؤنٹے	—	(پاؤں + اٹے) بچوں کے پاؤں میں پہننے کے سونے یا چاندی کے کڑے
۱۲	کافی	گلے کا ہار ، جانوروں کے گلے میں خوبصورتی کے لیے ڈالنے والی رسی	گافی	—	ہاتھ یا گلے میں پہننے کیلئے دھاگے کا ہار ، جانوروں کے گلے میں خوبصورتی کیلئے ڈالی جانے والی رسی
۱۳	گجیرے	پاؤں کا کنگن خاص کر جس پر گھنٹہ لگے ہوں	گجرا	—	ہاتھ کا کنگن ، بھولوں کی پہنچھی
۱۴	کنکن	کنکن	کنکن	کنکن	کنکن
۱۵	کڑکا	کنکن - کوئی بھی گول کڑی	کڑے	کڑے	کڑے
۱۶	بالے	کوئی بھی گول کڑی نہا زیور	والی	ہالی	کانوں میں پہننے کا کڑی نہا زیور

زبور	ابھرن	—	زبور	ابھر نام
انگروٹھی	—	مُنڈری	انگروٹھی	مود پرا ۱۸
کانوں میں پہننے کی بڑی بالی	—	مُنڈراں	—	—
	پیرا	پیرا	پیرا	وجیرا ۱۹
	موتی	موتی	موتی	موتو ۲۰

پیشہ وارانہ نام

بازاری عورتوں کا دلال	دلال	دلال	آڑھتیا ، کمیشن ایجنٹ	دلال	۱
محرر - سیٹھ کا خاص ملازم	گاشتی	—	محرر ، منشی	گاشتی	۲
ہندو ساہوکاروں کا حساب کتاب رکھنے والا کلرک	منیم	منیم	مکھیا - محکمہ مال کا ایک عہدہ دار	منیم	۳

نمبر شار	دراوڑی زبانوں میں عمومی استعمال کے ساتھ	معنی	پنجابی	اردو	معنی
۳	پراجو	نیلام	—	پراج	نیلامی کرنے والا
۵	مالی	باغبان	مالی	مالی	تھک تیل وغیرہ قسم کی ضروریات
۶	کرائی	بقال	—	کریانیہ	زندگی بچانے والا
۷	سوچی	چمڑے کا کام کرنے والا	سوچی	سوچی	چمڑے کا کام کرنے والا
۸	چھمبیکا	درزی	چھمبیا	—	درزی ، رنگریز
۹	چالیان	باقندہ	جالاہا	جولاہا	دھنیا
۱۰	پنجاری	دھنیا	پنجیا	—	(سندھی :- واڈو : بڑھئی)
۱۱	بڈیکا	بڑھئی	—	بڑھئی	شراب کا کاروبار کرنے والا
۱۲	کلتو ، کل	تاڑی ، دیسی شراب	کادل	—	

(کا + بار) کندھوں پر ڈولی اٹھانے والا ، کندھوں پر بہنگی اٹھا کر سودا سلف بیچنے والا

کشتی بان (بنگالی :- مانجھی : ملاح)

پرانا سامان بیچنے والا

—

پهلوان

پنجاب کی ایک جرائم پیشہ قوم

چھوٹی ذات کے لوگ ، سراسی

(ملتانى : پراپیں) پنجاب کی ایک ڈھول بجا کر مانگنے والی قوم

حجام

خوشبو پات کا کاروبار کرنے والا

۱۶۱

کہار

مانجھی

کہاڑی

دائی

—

—

ڈوم

—

—

گندھی

کہار

—

کہاڑیا

دائی

متل

باوریا

ڈوم

بھرائی

نائی

—

وہ بانس جو بہنگی میں استعمال ہوتا ہے

بڑی کشتی

انواع و اقسام کا سامان بیچنے والا ، پھیری والا

نرس ، آیا

پهلوان

جنوبی ہند کی ایک جرائم پیشہ قوم

ایک جرائم پیشہ قوم

جنوبی ہند کی ایک قوم جس کے افراد ڈھول بجا کر مانگتے ہیں (دراوڑی : پرا بمعنی ڈھول)

حجام

خوشبو ، صندل کی لٹی

۱۳

۱۴

۱۵

۱۶

۱۷

۱۸

۱۹

۲۰

۲۱

۲۲

صفات اور اسمائے صفات

مغربی پاکستان کی زبانیں			دراوڑی گروہ کی زبانیں							
معنی	اردو	پنجابی	معنی	دیگر	تلگو	کناری	ملیالم	تامل	نمبر شمار	
حکمت ، سمجھ ، سوچ مشین	— کل	کلا کل	سیکھنا ، پڑھنا ، فن ، حکمت	کوٹا : کل	—	—	کل	کلا	کل	۱
ہندو دکاندار جو کہ، غالباً ان کے پڑھے لکھے ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے	—	کراڑ	اہل فن ، صاحب علم	—	—	—	—	کڑاوار	کڑار	۲
سردی ، محبت ، تشفی (آنکھوں کی ٹھنک ، کلیجے کی ٹھنک)	ٹھنک	ٹھنڈ	سردی ، محبت ، تشفی ، پیماس بجھانا	کورگ } تولو } تشی	—	—	—	—	تن	۳
بے عقل ، بے وقوف	مور کھ	مور کھ	ضدی ، بیوقوف ، جاہل	کوٹا : مورک	—	—	—	—	مور کو مورکا	۴
سستی ، اکتاہٹ ، تھکاوٹ	—	آس	تھک جانا ، اکتا جانا	—	—	—	آسو	—	آسو	۵

چھوٹا ، ٹھیکنا	—	گٹھا	چھوٹا ، ٹھیکنا	تولو : گڈا	گڈا	گڈا	—	—	۶
—	بڑا	بڑا	بڑا	—	پیرو	پیرو	پیرو	پیرو	۷
—	ہلکا	لوکا	چھوٹا ، ہلکا	—	لک وو	لکو	لکو	الکو	۸
رنگ (بنگالی :- ون : رنگ)	—	ون	رنگ	—	ونوو	ون	ورن	ورنوو	۹
(سندھی : رنگ) جس کا کوئی رنگ نہ ہو یعنی خلد (بنگالی :- رنجک ، رنجین : رنگ)	رنگ	رنگ رنجین	—	رنگ	{ رنگ رنجین رنجمو }	رنگ رنجین رنجک	—	رنگ رنجین	۱۰
(سندھی :- کارو : کالا)	کالا	کالا	کالا	تولو : کاری	—	کاری	کارو	کارو	۱۱
(سندھی :- نیرو : نیلا)	نیلا	نیلا	نیلا	—	نیلی	نیلی	نیلی	نیلو نیلمو	۱۲
سبز	ہرا	ہرا	سبز	—	—	ہری	ہری	اری	۱۳
خال خال ، کوئی کوئی (بنگالی :- وورل : خال خال)	—	ورلا	خال خال ، کوئی کوئی	—	ورلامو	ورل	ورل	—	۱۴

مغربی پاکستان کی زبانیں			دراوڑی گروہ کی زبانیں						
معنی	اردو	پنجابی	معنی	دیگر	تلگو	کناری	ملیالم	تامل	نمبر شمار
چھپانا ، ڈھانک دینا	ڈھانکنا ڈھانپنا ڈھکنا	ڈھکنا	چھپانا ، ڈھانکنا	کو لاسی : ڈانگو ڈانپ : ڈانپ ناٹیکی : ڈھانپ	ڈاگو	—	—	—	۱
ڈھکنا	ڈھکنا	ڈھکن	بند کرنا ، منع کرنا	سالتو : اڈکنا	اڈو	اڈے	اٹی کا	اٹائی	۲
روکنا ، بند کرنا روکنا ، منع کرنا	بٹانا — — —	بٹانا اڈکنا بٹکنا اڈکنا اڈکنا	بند کرنا ، منع کرنا	—	—	—	—	—	—
پہننا دوپٹہ	اوڑھنا اوڑھنی	—	لباس پہننا	کو ڈاگو : اوڈی گو نڈی : اوٹنا	—	اوڈو	اوٹوکا	اوٹو	۳
ایک طرف ہو جانا ، پیچھے ہٹ جانا	پٹنا	پٹنا	جگہ دینا ، ایک طرف ہو جانا ، پیچھے ہٹنا	—	اوٹو	اوٹو	اوٹوکا	اوٹو	۴

5	کرائی	کرايوڪا	ڪرايوڪا	ڪرائي	ڪرائي	ڪرائي	ڪرائي	ڪرائي	ڪرائي
6	ڪلا	ڪلروڪا	ڪلروڪا	ڪلا	ڪلا	ڪلا	ڪلا	ڪلا	ڪلا
7	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي
8	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي
9	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي
10	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي
11	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي	ڪوئي

—	خفا ہونا	خفا ہونا	غصے ہونا	—	کو پا	کو پی	—	—	—	۱۶
سفیدی کرنا ، اپائی کرنا وغیرہ	پوتنا	پوچنا پوچا پھیرنا	ملنا ، رنگ کرنا ، سفیدی کرنا ، فرش پر گوبر ملنا ، صفائی کرنا	تولو : پوچونی	—	پوسو	پوچو کا	پوچو	—	۱۷
—	آنکھیں مشکانا	آنکھیں مشکانا ، اکھ مشکے لاؤنا	جلدی جلدی آنکھیں جھپکنا ، آنکھیں مارنا	—	مٹی کمو	مشکیو	—	—	—	۱۸
پاؤں تلے روندنا ، مسلنا	—	—	روندنا ، کچلنا ، مسلنا	—	مدوگو	مدی	ستی	ستی	—	۱۹
جیسے مکان کی بنیاد میں اٹھانا	اٹھانا اٹھانا	اٹھانا	اٹھانا ، اٹھا کر لے جانا ، بنانا (مکان وغیرہ)	کولامی : اینٹ تولو : ایٹونی	ایٹو	ایٹو	—	—	—	۲۰
آواز ، کہا ہوا (پوٹھو باری :- باننا : کہنا ، بتلانا) کہنا ، بتلانا ، سنانا وغیرہ	بانن	بانن	آواز ، بولنا ، کہنا ، بیان کرنا ، بتلانا	براہوئی : پائٹنگ	وانی	وانی	پانی کا	پانی	—	۲۱

مغربی پاکستان کی زبانیں

دراوڑی گروہ کی زبانیں

معنی	اردو	پنجابی	معنی	دیگر	تلاگو	کناری	ملیالم	تامل	نمبر شار
آواز دینا	بلانا	بلانا	آواز دینا ، کہنا ،	—	پالو کو	—	—	—	—
روکنا ، منع کرنا	—	ٹھا کنا	روکنا ، منع کرنا	—	—	تاگ	—	تاگائی	۲۲
ڈگمگانا ، لڑکھڑانا ، جھولنا	جھولنا	جھولنا ڈولنا	بلنا ، حرکت کرنا ، ڈگمگانا ، پینک بڑھانا ، جھولنا	کوئی : تلانگا	—	تولا کو	تولا کو	تولہ	تولہ
بہہ جانا ، ٹپکنا ، سیال شے کا گر جانا	—	ڈبلنا	بہہ جانا ، ٹپکنا ، گر جانا	کو ڈاگو : تولی	تولو کو	تولو کو	تولی	تولی	۲۳
—	ٹانگنا	ٹنگنا	لٹکانا	کو ڈاگو : تنگ	تونگو	توگو	تنو کا	تنکو	۲۵
کانوں میں پہننے کے زیور جو کہ لٹکتے رہتے ہیں (سندھی : دھوٹن)	—	ٹنگل ٹوکان	کان میں پہننے کا ایک زیور	—	—	—	—	ٹنگل	—
دھونا	دھونا	دھونا	دھونا ، نہانا	—	—	تویو	—	توئے	۲۶

برصغیر کی زبانوں کا تقابلی جائزہ

آریائی زبان	پاکستانی زبانیں										
سنسکرت	بنگالی	اردو	پنجابی	ملتان	سندھی	پراکرت	براہوئی	ٹوڈا	کناری	تامل	ملیالم
ابھم	اسی	میں	میں	مان	اون	ہاں	ای	آن	نان	نا	نان
مدیاہ	امار	میرا	میرا	مانڈا میتڈا	مجھو سوہن جو	ماہان سہارو	کنا	بندو	نانادو	اینادو	اینڈو
توام	تھی	تو	توں	توں	توں	توں	فی	فی	فی نو	فی	فی
تودیاہ	تھار	تیر	تیرا	تینڈا	توجو	توہاں	نا	ندو	نینادو	اونادو	ونڈا
توا	تھرا	تم	تسین	تسان	اوپین	توچھا	نم	نیو	فی وو	نیرو	نینل
یویام	تھادیر	تھہارا	تسانڈا تساڈا	تسانڈا	اوپانجو	تھہاں تھہارو	نما	نم دو	نماندو	امادو	نینا دا
یشمدیاہ	آئی	وہ	اوہ	او	ہو	سو	او	او	اوانو	اوان	اوان
یشاکھم	نان ہا	اسکا	اوپدا	اوندا	پنانجو	تدو	وانا	اوان	اوانا	اواندو	اوانزے
تلمدیاہ، تسمیر											

آریائی گروہ کی زبانیں

سنسکرت	اوستائی	فارسی	قدیم یونانی	آٹسلینڈی	اطالوی	اردو
اہم	اوم	من	ایگو	ایکا	آئیو	میں
ماما	مائے	ام	موئے	میک	میو	میرا
توام	توام	تو	تو	تو	تو	تو
توا	تائے	ات	یومیز	تھن	توا	تیرا
یویام	یوزیم	شا	—	—	—	تم
یشاکم	یشا	امان	—	—	—	تمہارا
ساہ	اوا	او	سی	کن	ایسو	وہ
تسیہ	شے	اش	کینسوس	کنس	سوا	اس کا

مندرجہ بالا اسمائے ضمیر کے خاکوں سے دراوڑی اور پاکستانی زبانوں خاص کر سندھی اور ملتانی بولی کے ساتھ مطابقت اور ان کا سنسکرت کے ساتھ اختلاف بالکل واضح ہے۔ اردو، پنجابی اور بنگالی میں 'را' اور سندھی میں 'جو' کے لاحقات دراوڑی اور ملتانی ضہائر کے لاحقات 'را'، 'دا' اور 'ڈا' کے مترادف ہیں۔ خود سنسکرت کے بعض ضہائر بھی دراوڑی زبانوں سے متاثر ہوئے ہیں جیسا کہ خاکہ مذکورہ میں خط کشیدہ ضہائر سے واضح ہے۔

دراوڑی اور وادی سندھ کی موجودہ زبانوں میں لغوی اشتراک خاص کر پیشہ وروں کے نام، افعال اور اسمائے ضمیر میں واضح مطابقت اس امر کا بین ثبوت ہے کہ آریاؤں کی آمد سے قبل وادی سندھ میں

دراوڑ اور منڈا اقوام کا دور دورہ تھا اور ہڑپہ و موئن جو دڑو کی گلیوں اور بازاروں میں انہی گروہوں سے تعلق رکھنے والی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ جب آریائی قبائل یہاں وارد ہوئے تو جہاں خود انہوں نے یہاں کی مقامی زبانوں سے گہرے اثرات قبول کیے وہاں کسی حد تک انہوں نے مقامی زبانوں کو بھی متاثر کیا لیکن ان کے اقلیت میں ہونے کی بناء پر یہ اثرات اتنے ہمہ گیر نہ تھے۔ اس سے مقامی زبانوں کا زیادہ تر صرف لغوی پہلو ہی متاثر ہوا اور صرف و نحو کا ڈھانچہ کافی حد تک محفوظ رہا جو کہ تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ ابھی تک موجود ہے۔ اہل علم حضرات نے وادی سندھ کی آریاؤں سے قبل کی زبانوں کو قدیم پراکرتوں کے نام سے یاد کیا ہے۔ وادی سندھ کی موجودہ زبانیں انہی قدیم پراکرتوں کی ارتقائی صورت ہیں یعنی ہاری زبانوں کی مورث اعلیٰ سنسکرت نہیں بلکہ براہ راست دراوڑی زبانیں ہیں۔

ایک عوامی گیت

قارئین کے تفریح و تہنہ اور اپنے مطمع نظر کی وضاحت کے لیے دراوڑی گروہ سے تعلق رکھنے والی گونڈی زبان کی دیومالا سے ایک مقبول گیت پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ترجمہ دیا جا رہا ہے تا کہ ناظرین کو دراوڑی اور پنجابی کے درمیان باہمی مشابہت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ پنجابی ترجمہ میں بعض جگہ ایسے مترادف الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جو کہ روزمرہ کی زبان میں مستعمل نہیں ہیں لیکن عام طور پر آسانی سے سمجھے جا سکتے ہیں نیز عام بول چال یا کلاسیکی ادب میں ان الفاظ کے استعمال کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

ساند سوم جی کا گیت

اردو	پہنہ-چمبا بی	گو نڈی
<p>ساند سوم جی کا گیت سنو اے بابا چھ بیویاں اس نے کیں (بھر بھی) سنگ بابا پیدا نہیں ہوا - ساتوئیں بیوی (اس نے) کی - اس سے سنگ بابا ہیٹ میں پڑ گیا - اس کے حمل کا باپ کو پتہ نہیں دیا گیا چل دیا باپ (پر دیس کو) - اس کے گھر والے (یعنی بیویاں) اکٹھے ہوئے چھوٹی بیوی سو رہی تھی باقی چھ (وہاں) موجود تھیں - انہوں نے کہا غلے کی ٹوکری اس کے سر پر چڑھا دیں ، ہارے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے - ایسا کہا ایسا ہی کیا (ٹوکری) کا منہ اس کے سر پر چڑھا دیا -</p>	<p>ساند سوم جی دا گیت سنو رے بابا چھی سو کناں (بیویاں) کیتیاں سنگ بابا نہیں جمیا - ستوئیں سو کن کیتی اود تیں سنگ بابا ہیٹ پے گیا - اوبدے حمل دا باہل نون پتہ نہ دتا ٹریسا باہل (پر دیس نون) تن دا (اوبدا) پر یوار اکٹھا ہویا لوڈی سو کن ستی رہی (دوجیاں) چھی (اوتھے) سن - اوبناں نے کہا گوٹے دا منہ اوبدے تالو (سر) تے چڑھا دئیو اساں دے آنکن (ویڈڑے) پتر جمیا ایداں کہا ایہو کینا (کیتا) گوٹے دا منہ اوبدے تالو تے چڑھا دتا</p>	<p>ساند سوم جی ناساک کویات روباہن سرک اسک کیتور سنگ باہن ہلے پتور یرُون اسک کیتور اوی تے سنگ باہن اوترے تور اولار ایٹان باہن پن واکے تکس توں باہن، تنوا پری سمیتے کیالے لورو اسکنا سووق سارون مستا اوی تون کوٹی اوناتے تلا دو ریسی ”اسوں انکا چاوا پتی“ آدات ایے کنت انا تے تلا تون دور بتوں</p>

پنجابی اور راوڑی زبانوں میں ضامنی اور مفعولی علاقوں کا اشتراک

پوٹھوہاری اور ملتانى بولیاں پنجابى زبان كى دو اہم شاخیں ہیں۔ اول الذكر پنجاب كے بالائى حصے ميں مروج ہے اور دوسرى جنوب مغرب ميں۔ ان دونوں بوليوں كو منجھلى (مركزى پنجابى) كى نسبت يہ امتياز حاصل ہے كہ يہ کناروں پر واقع ہونے كى وجہ سے نسبتاً بيرونى حملوں كے لسانى اثرات سے محفوظ رہى ہیں۔ يہى وجہ ہے كہ آج بھى ان ميں قديم عنصر كى جھلك نظر آتى ہے۔ ايسى ہى چند جھلكيوں كا مختصر سا جائزہ پيش خدمت ہے۔

ہم پوٹھوہار كے قديم شہر ٹيكسلا ميں كھيلے جانے والے ايك الميہ سے اپنى بحث كا آغاز كرتے ہیں۔ كہتے ہیں كہ مہاراجہ اشوك كے ولى عہد وردھن كى آنكھیں بہت خوبصوت تھیں اور يہاں كے عوام اس صفت كے باعث اسے 'كنال' كہتے تھے۔ روايت ہے كہ شہزادہ كى سوتيلى ماں مہارانى تيشيا ركھشا نے اس پر اپنى محبت كے ڈورے ڈالنے چاہے اور كافي چھل فريب كھيلے مگر ناكام رہى۔ آخر اپنے انتقام كى آگ بجھانے كے ليے اس نے شہزادے كى يہى خوبصورت آنكھیں نكلوا ڈالیں۔

سوال يہ ہے كہ آج سے كوئى سوا دو ہزار سال قبل پوٹھوہار كے عوام شہزادہ كو اس كى خوبصورت آنكھوں كى بناء پر 'كنال' كيون كہتے تھے؟ يعنى 'كنال' اور آنكھوں ميں باہمی كيا رشتہ ہے؟ بعض حضرات نے اس كى وضاحت كرتے ہوئے لكھا ہے كہ ہاوت ديس ميں اس نام كا ايك خوبصورت آنكھوں والا پرندہ ہوتا ہے اور اسى نسبت سے يہ نام پڑگيا۔ ليكن خوبصورت آنكھوں اور 'كنال' كے باہمی رشتے كا سوال پھر بھى بيچ ميں رہا۔

برصغير پاك و ہند كے مختلف لسانى گروہوں كى طرف نظر ڈالیں تو دراوڑى گروہ كى زبانوں ميں آنكھ كے ليے ذيل كے الفاظ ملتے ہیں:

تامل ، ملیالم ، کناری ، کولای : کن
 تلگو ، تولو ، گڈابا اور کوئی وغیرہ : کنو
 کورخ ، براہوئی : خن

’ل‘ کا لاحقہ بطور وصفی علامت کے استعمال ہوا ہے۔ آج بھی یہ لاحقہ پنجاب میں عام مروج ہے جیسے کہ اگر کسی کا پیٹ بڑھا ہوا ہو تو اسے ’ڈھڈل‘ (ڈھڈ بمعنی پیٹ) کہتے ہیں۔ بڑے دانتوں والے کو ’دندل‘ اور بڑی آنکھوں والے کو ’اکھل‘ وغیرہ۔ اس طرح ’کن‘ کے ساتھ وصفی علامت ’ل‘ کی لاحقیت سے جو اسم صفت وجود میں آتا ہے اس کے معنی موٹی آنکھ والا یا خوبصورت آنکھوں والا بنتے ہیں۔

اگر بات محض اسی ایک قصہ کہانی تک محدود ہوتی تو ہم اسے اتفاق امر یا زیادہ سے زیادہ مستثنیات میں شمار کرنے میں حق بجانب ہوتے لیکن پنجابی اور دراوڑی زبانوں میں باہمی صوتی اور گرامری مطابقت نیز سرمایہ الفاظ کے گہرے اشتراک کی موجودگی میں اس قسم کی مثالوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے مطمع نظر کی وضاحت کے لیے ہم دراوڑی اور پنجابی میں اضافی اور مفعولی علامتوں کے اشتراک کی مثال پیش کرتے ہیں۔

پوٹھوہاری میں پنجابی زبان کی دیگر بولیوں میں مروج علامت اضافت ’دا‘ کے برعکس ’نا‘ کی علامت مستعمل ہے جیسے کہ راولانا پنڈی (راولوں کا گاؤں) ، ماہیئے ناپکھی (محبوب کا پنکھا)۔ پوٹھوہار کے شاعر باقی صدیقی (متوطن ٹیکسلا) کے پنجابی کلام میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں جیسے کہ :

تینڈی اکھیاں نی لو
 مینڈے دلے نا قرار
 تینڈے شملے نی چھاں
 مینڈا ہار تے سنگار

ترجمہ : تیری آنکھوں میں (محبت) کی چمک

میرے دل کا قرار ہے

تیرے طرہ کی چھاؤں
میرا ہار اور سنگار ہے

پوٹھوہار کا علاقہ گندھارا کی قدیم تہذیب کا مرکز بھی رہا ہے اور
مہاراجہ کنشک کے عہد میں یہاں کے نو آباد کار فوجی خدمات ، بدھ مت
کی تبلیغ اور دیگر کاروباری سلسلوں کی بدولت یہاں سے نقل مکانی کر کے
وسط ایشیا کی کشن سلطنت میں آباد ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج
بھی روسی ترکستان کے علاقے سے دریافت ہونے والے گندھارا تہذیب کے
آثار سے دستیاب ہونے والی خروشتی تحریروں میں اسی علامت اضافت کے
استعمال کا سراغ ملتا ہے۔ جیسے کہ شارسین نی پترا بالا سین (شارسین
کا بیٹا بالا سین) ، پیپانی بھوم پراسیمہ (پیپا کی زمین کے بارے میں) ،
سانگلانی کاچو توسا چوری داگا (سانگلا کی کاچونو نے چوری کی)۔
دراوڑی گروہ کی بعض زبانوں میں 'نا' (مادہ نون) بطور علامت اضافت
مستعمل ہے جیسے کہ :

براہوئی : باسنی نا موسم : (باسنی : گرمی) گرمی کا موسم
سراواں نا بھلا سردار : (بھلا : بڑا) سراواں کا بڑا سردار

کناری : بیلگ اینا پتریک : (بیلگ : صبح۔ پتریک : اخبار) صبح کا
اخبار۔ ہنینا توٹا : (ہنو : پھل۔ اینا : علامت اضافت۔ توٹا :
باغ) پھلوں کا باغ۔ ہڈگینا یچمانا : (ہڈگو : بحری جہاز۔
اینا : علامت اضافت۔ یچمان : مالک) ناخدا

تامل : پونن کڈم : (پون : پنا ، سونا۔ کڈم : برتن) سونے کا
برتن۔ اترن کرئی : (اتر : دریا۔ کرئی : کنارہ) دریا کا کنارہ

'نا' کی علامت کا استعمال یہیں تک محدود نہیں بلکہ برصغیر کی
کئی ایک دوسری زبانوں میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں جیسے کہ :

گجراتی : تبت سنونا فائدہ : کالجی نی چھو کریاں پتاننا مکھ نی
سندر تا ماٹے تبت سنو ووارے پسند کرے چھے

(تبت سنو کا فائدہ : کالج کی اڑکیاں اپنے چہرے کی
خوبصورتی کے لیے تبت سنو ہمیشہ پسند کرتی ہیں)

پوری : ہمنا سگلا بھات کھایت گٹو (ہارا تمام چاول کھا گئے)

تمنا بات ہم کو بھاوت ناپیں (تمہاری بات ہم کو پسند نہیں)

(سید قدرت نقوی سے منقول)

دکنی میں اسلئے ضمیر کے ساتھ 'ن' کی علامت اضافت کا استعمال عام ہے جیسے کہ :

غیر جب لیوے تم نام ہووے میرا دہن تلخ

شکرو شہد پلاویں تو نہ جاوے دو سخن تلخ

(محمد قلی قطب شاہ ، ۱۵۸۰ تا ۱۶۱۱ء)

چلے چندنی میں جب لشک پیر ہارا

اونن عکس دیہے چندر تھے اپارا

(قطبا)

سمہیلی نہ کر توں ہمن سینے دند

کہ میں بوجھے ہوں تیرے سب چھند پنند

پنجاب میں بھی اس علامت اضافت کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں

جیسے کہ :

تم اوراں سے پیاری سوکھ کرت ہیں

ہمن سے برہنی سو دوکھ بھرت ہیں

(محمد افضل پانی پتی ، و - ۱۶۷۲ء)

کلام العشق ہمنا کوں سنا حکمت سوں منطق سوں

وگر نہ اس مطول کوں رکھا تھا مختصر کر کر

(ناصر علی سرہندی ، معاصر ولی دکنی)

ویسے اردو اور پنجابی میں اپنا ، اپنے اور اپنی میں 'نا' ، 'نے' اور

'نی' بطور علامت اضافت مستعمل ہیں -

دراوڑی زبانوں میں 'نا' کے علاوہ تا، ٹا، ڈا، ڈا اور را کے لاحقے بھی مختلف حالتوں اور مختلف زبانوں میں اضافی علامتوں کے طور پر مروج ہیں جن میں کہ، 'دا' کی علامت عمومیت کے ساتھ مستعمل ہے جیسے کہ:

تامل : چلپا دی کڑم : (چلپا : ٹخنے - کڑم : کڑے) ٹخنوں کے کڑے

یعنی پائل، پا زیب

کناری : چناں دا سر پلی : (چناں : سونا - سر پلی : زنجیر) سونے کی زنجیر

تلگو : واری دی : (واری : وہ) بمعنی اس کا

بعض اوقات دوسری اضافی علامتوں کے ساتھ ساتھ 'نا' کی علامت کا الحاق بھی کر دیتے ہیں جیسے کہ کناری میں تمہارا یعنی 'تم کا' کے لیے بجائے نی دو (نی : تم) کے نینا دو مروج ہے۔ اسی طرح تامل میں 'اس کا' کے لیے بجائے 'ادودٹیا' (ادو : وہ) کے ادن دٹیا اور تمبی ادو (تمبی : چھوٹا بھائی) کی بجائے تمبی ان دو بمعنی 'چھوٹے بھائی کا' کہتے ہیں۔ بعینہ یہی صورت پنجابی کی لہندا بولی میں بھی موجود ہے جیسے کہ مرکزی پنجابی 'اوہ دا' (اس کا)، 'تساڈا' (تمہارا) کو لہندا میں 'اوبندا' اور 'تسانڈا' وغیرہ پکارتے ہیں۔ اسی طرح پھوٹوہاری میں مروج 'مہاڑا' پنجابی اور اردو 'میرا' کی لہندا شکل 'مینڈا' ہے۔

اپنے مطمع نظر کی مزید وضاحت کے لیے ہم ذیل میں دراوڑی زبانوں کی اضافی حالت کی گردان کی مثال پیش کرتے ہیں تاکہ اس سے اضافی لاحقوں کے استعمال کا صحیح اندازہ کیا جا سکے :

مار بمعنی درخت کی اضافی حالت کی گردان

تامل ملیالم کناری تولو کورگ

واحد : مارات اینا مارات این درے مارادا ماراتا ماراترا

جمع : مارن گل اینا مارانا لوڈے مارا گل آ مارو کولے -

بعض حضرات نے اس 'نا' کی علامت کو سنسکرت کے بعض اسماء کی اضافی حالت میں مروجہ جمع کی علامت 'انام' کے ساتھ منطبق کرنے کی کوشش کی ہے جسے کسی طرح صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وضاحت کے لیے ذیل کی گردان ملاحظہ ہو :

سنسکرت میں اسماء کی اضافی حالت کی گردان

دھی (خیال)	بھو (زمین)	ندی (ندی)	ودھو (عورت)
واحد : دھیہ	بھوواہ	ندیہ	ودھواہ
تثنیہ : دھیوہ	بھووہ	ندیوہ	ودھووہ
جمع : دھیام	بھووام	ندی نام	ودھو نام

جیسا کہ اس گردان سے واضح ہے سنسکرت میں زیادہ تر 'اہ' کا لاحقہ علامت اضافت کے طور پر مستعمل ہے۔ اس پہلو میں وضاحت کے لیے ذیل میں چند مزید مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

وکرماہ سبھا : و کرم کا دربار

امرتسیہ سر : امرت کا تالاب

راکشساہ 'کنتر : راکشمی کی بیوی

ان حالات میں جب کہ اردو پنجابی 'را' پنجابی 'دا' اور 'ڈا' لہندا 'نڈا' اور پوٹھوہاری 'نا' کی اضافی علامتوں کا سنسکرت سے کوئی رشتہ نہ جوڑا جا سکے اور اس کے برعکس برصغیر کی آریاؤں سے قبل کی مروجہ زبانوں میں یہی علامتیں مستقل طور پر اور تواتر سے مستعمل ہوں تو پھر ان کی اصل کی تلاش کے لیے محض قیاس آرائیوں اور دور از کار تاویلات پر تکیہ کرنا کہاں تک روا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ علامتیں براہ راست دراوڑی زبانوں کے ورثہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

اسی سلسلے میں ملتانی بولی میں مروجہ مفعولی علامت 'کو' اور 'کوں' نیز پوٹھوہاری میں 'کی' کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

پنجاب میں اس علامت کے استعمال کا سب سے پہلا دستاویزی ثبوت حضرت شیخ فرید الدین شکر گنجؒ (۱۱۷۳ تا ۱۲۶۵ء) کے پنجابی کلام میں ملتا ہے مثلاً :

پاک رکھ توں دل کو غیر متی آج سائیں فرید کا آوتا ہے
قدیم قدیمی کے آونے سے لازوال دولت کو پاوتا ہے

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ حضرت شکر گنجؒ کی مادری زبان ملتانی تھی کیونکہ آپ لہندا کے علاقہ کے رہنے والے تھے۔ اس کا ایک ثبوت آپ کی صاحبزادی بی بی عائشہؒ کے کلام کے نمونہ سے بھی ملتا ہے۔ حضرت سید علاؤ الدین ضیاء چشتیؒ دولت آبادی کے احوال میں منقول ہے کہ ایک بار حضرت شاہ برہان الدین غریبؒ (متوفی ۱۳۳۷ء) دولت آباد کے قیام کے دوران بی بی عائشہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں ان کی عابدہ اور زاہدہ بیٹی بھی موجودہ تھیں۔ آپ اسے دیکھ کر متبسم ہوئے۔ یہ دیکھ کر بی بی عائشہؒ نے اپنی ملتانی زبان میں فرمایا :

’اے برہان الدین ! ساڈی دھی کو کیا ہنسدا ہے‘

(یعنی اے برہان الدین تو ہماری بیٹی کو دیکھ کر کیا ہنستا ہے)

ملتانی بولی میں آج بھی مفعولی حالت کے لیے ’کو‘ اور ’کوں‘ کی علامت مستعمل ہے جیسے کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے :

بے شک دوہاں جہاناں کوں خالق قدرت نال اپایا

ہکڑیاں عشق حقیقی ہکڑیاں عشق مجازی لایا

سک منجھی وال دی سوہنی کو جنگھ مچھلی کنوں کھوایا

صدقوں امر فرہاد کوں شیریں چٹن کوہ فرمایا

’پیر رانجھا‘ مصنفہ چراغ (متوطن ڈیرہ غازی خاں)

(تصنیف ۱۷۰۹ء)

’حضرت عباس اوں سوار کوں آندا ڈیکھ کے فرمایا :

اے شخصصا ! تیں جہیئے مسافراں دیاں تانگہاں

اساں مسافراں کوں ہن۔“

(مرثیہ از میر باز محکوم ، متوطن میانوالی)

پوٹھوہاری میں مفعولی علامت 'کو' کی بجائے 'کی' مستعمل ہے جیسے کہ :

می کی کیہ پتہ اے (مجھ کو کیا پتہ ہے)
تو کی آکھیا سی (تجھ کو کہا تھا)

پنجاب کے باقی حصوں میں بھی اس مفعولی علامت کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں ویسے اسے عمومیت حاصل نہیں مثلاً :

ناں مجھ کو سوکھ دن نہ نیندراتا
برہوں کی آگ میں سینہ جراتا
اری جس شخص کو یہ دیو لا گا
سیانا دیکھ اس کو دور بھاگا
(مجد افضل پانی پتی)

کلام العشق ہمنما کون سنا حکمت سوں منطق سوں
وگر نہ اس مطول کوں رکھا تھا مختصر کر کر
(ناصر علی سرہندی)

سپہت جنہاں کو بکھیسے سوئی پوتے دار
(صفت) (بخشیئے)

کنجی جن کودتی آ تنہاں ملے بھنڈار
(گورونانک، ۱۳۶۹ تا ۱۵۳۸ء)

ملتان اور پوٹھوہار کے علاوہ باقی ماندہ پنجاب میں بھی اس مفعولی علامت 'کوں' کے استعمال کی مثالیں نایاب نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ سید فضل شاہ (۱۸۳۷ تا ۱۸۹۰ء) نے اپنے بارہ ماسے میں بھی اس علامت کو استعمال کیا ہے جیسا کہ :

بیساکھ کہے سن باورے مت اتنا کرلا
ہم بھی چلے مسافری کہو جیٹھ کو جا
کاتک سکھیو پی گیا بن جوگن بن باس
پیا جیا کولے گئے کیا جینے کی آس

پنجاب کے علاوہ شمالی ہند کے دوسرے حصوں میں بھی شروع ہی سے اس علامت کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں جیسے کہ :

شبان ہجران دراز چون زلف و روز وصال چون روز کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کا ٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریم برد تسکین
کسے پڑی ہے جو جا سناوے ہارے پی کو ہاری بتیاں
(امیر خسروؒ، و - ۱۳۲۵ء)

ہمنا تمہن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی کے گفتا ریختہ در ریختہ در ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے
(سعدی کا کوروی، و - ۱۵۹۳ء؟)

دکن میں بھی شروع ہی سے 'کو' کی مفعولی علامت کی مثالیں

ملتی ہیں مثلاً :

کھڑے کھڑے پیو جیو میں آپس آپ دکھاوے
ایسے میٹھے معشوق کوں کوئی کیوں دیکھے پاوے
جنہ دیکھے اوسی کوں اسے اور نہ بھاوے
(خواجہ گیسو درازؒ ۱۳۲۱ تا ۱۴۲۲ء)

نادر بہارستان کا زرگر ہزاروں صنع سوں
کتا جرت گلزار کی جمہاراں کوں خوش سنگھار آج

غواصی بخشتا تجھ ناز کوں آج

جو اس کے قل لاہور ہو تا

(غواصی، عہد قطب شاہی ۱۶۱۱ تا ۱۶۲۵ء)

سندھی میں یہ مفعولی علامت پوٹھوہاری کی طرح 'کی' کی شکل

اختیار کر لیتی ہے جیسا کہ شاہ عبدالمطیف بھٹائیؒ (۱۶۸۹ تا ۱۷۵۱ء)

کے کلام سے ظاہر ہے :

ہل ہٹین سین ہوت دی

پیریں پنہ و سار

قاصدا ٹی کار

کہیں رسائی کیچ کی

ترجمہ : دل کے ذریعے (مجت کا) راستہ طے کر

(اس راہ میں) پاؤں سے چلنا بھول جا

قاصدوں کی طرح (پاؤں سے راستہ چل کر)

تمہاری کیچ تک کہاں رسائی ہو سکتی ہے -

سون سیو ڈٹھا ماں

جنہیں ڈٹھا پرین کی

ترجمہ : اری ماں میں نے اسے دیکھ لیا

جس نے میرے محبوب کو دیکھا ہے -

اصل میں یہ علامت تھوڑے بہت ردو بدل کے ساتھ برصغیر کے شمالی

حصے کی زبانوں کے ایک بڑے حصہ میں مستعمل ہے - بنگالی میں یہ 'کے'

کی شکل میں مروج ہے جیسے کہ :

امی تو ما کے بہالو باشی

(میں تم کو چاہتا ہوں)

تاہا کے بہیترا آ شیتے داؤ

(اس کو اندر آنے دو)

بابر کا یہ مصرعہ تو تاریخی حیثیت کا حامل ہے جس میں مفعولی

علامت 'کو' کی بجائے 'کا' استعمال کی گئی ہے :

'مج کا نہ کچھ ہوس مانک و موتی'

ظاہر ہے کہ بابر نے اس مفعولی علامت کا استعمال اپنے عہد کی

مروجہ زبانوں ہی سے سیکھا ہوگا -

اس وسیع الاستعمال مفعولی علامت کے اشتقاق کے بارے میں مستشرقین نے عجیب عجیب ٹوٹو کر بن کھائی ہیں لیکن دور کی کوڑی لانے کے باوجود کسی تسلی بخش نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ سندھی گرامر کے مصنف ڈاکٹر ٹرمپ (E. Trumpp) سندھی کی مفعولی علامت 'کی' اور بنگالی 'کے' کو سنسکرت کی ظرفی حالت 'کرتے' (بمعنی واسطے، کے لیے) سے مشتق مانتے ہیں۔ مسٹر جاہن بیمز (J. Beames) اور ہورنلی (R. Hornle) اسے سنسکرت ککشم (کو کوہ) سے مأخوذ تسلیم کرتے ہیں۔ بھنڈار کر کے نزدیک اس کی اصل سنسکرت 'کم' بمعنی 'کیا' ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ علامت سنسکرت کے 'اساکم' (ہارا) سے نکلی ہے۔ کیلاگ (S. H. Kellog) نے اضافی علامت کیرک کو اس کا مبداء گردانا ہے۔

بظاہر ان متضاد قسم کے نظریات میں کوئی یگانگت نظر نہیں آتی لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ سب نظریات ایک ہی قدر مشترک کے حامل نظر آتے ہیں اور ان کی تہ میں صرف ایک ہی جذبہ کار فرما نظر آتا ہے کہ جیسے بھی ہو اس مفعولی علامت کے ڈانڈوں کو کھینچ تان کر سنسکرت کی کسی اصل سے ملا دیا جائے۔ اس قسم کے طرز تحقیق کے زیر اثر انہوں نے یہاں کی قدیم غیر آریائی زبانوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا وگرنہ انہیں اس قسم کی دور از کار تاویلات لانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

دراوڑی گروہ کی تمام تر معروف اور غیر معروف زبانوں میں 'ک' کا لاحقہ بطور ایک مفعولی علامت کے عمومیت کے ساتھ مستعمل ہے۔ تامل اور ملیالم میں اس مفعولی علامت کی شکل 'کو' ہے۔ تلگو میں 'کو' اور 'کی' اور کناری 'کے' اور 'گے'۔ تولو 'کو' اور 'گو' اور ٹوڈامیں 'ک' اور 'گ' ہے۔ دراوڑی زبانوں میں اس علامت کے استعمال کا دستاویزی ثبوت جنوبی ہند کے مالا بار کے ساحل سے دستیاب ہونے والے تامل زبان کے ایک کتبے سے ملتا ہے جو کہ ۷۷۷ء کا تحریر شدہ ہے۔ اس میں 'نگرا تو کو' بمعنی نگر کو یعنی 'شہر کو' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ موجودہ تامل میں بھی اس کی بعینہ یہی صورت ہے۔ یہی صورت دراوڑی گروہ کی دوسری زبانوں کی بھی ہے جیسا کہ کناری اور تلگو کی ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے :

مچھ کو ہم کو تجھ کو تم کو اس کو ان کو
 کناری : ناں گے نام گے نینا گے نما گے اوانی گے اوارى گے
 تلگو : نا کو ما کو نی کو می کو وانی کی واری کو
 مزید وضاحت کے لیے ذیل کی دراوڑی زبانوں کی مفعولی حالت کی
 گردان ملاحظہ ہو :

دراوڑی مارم یا مارا (بمعنی درخت) کی مفعولی حالت کی گردان

تامل ملیالم کناری تلگو توالو کورگ
 واحد : مارا تر کو مارا تی نوں مارا کے مارا کو مارو کو مارا ک
 جمع : مارنگلر کو مارئل کو مارگل کے مارل کو مارو کولک -

دراوڑی زبانوں کے برعکس سنسکرت میں اس مفعولی علامت کا کہیں
 سراغ نہیں ملتا بلکہ اس زبان میں زیادہ تر یائے معروف مفعولی علامت کے
 طور پر استعمال ہوئی ہے جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہے :

وہرائے گان دداتی

(برہمن کو گائے دی اس نے)

بھوجیں دو تو رگھوے وسشٹاہ

(بھوج کی طرف سے قاصد رگھو کو بھیجا گیا)

راما یا ناما

(راما کو سلام)

سنسکرت میں اسماء کی مفعولی حالت کی گردان

دھی (خیال) بھو (زمین) ندی (ندی) ودھو (عورت)
 واحد : دھیئے بھووے ندیائے ودھوائے
 تشبیہ : دھی بھیم بھو بھیم ندی بھیم ودھو بھیم
 جمع : دھی بھیاہ بھو بھیاہ ندی بھیاہ ودھو بھیاہ

قدیم پراکرتوں کی ادبی صورت میں بھی اس مفعولی علامت کے
 استعمال کی مثال نہیں ملتی جیسا کہ ذیل کی گردان سے ظاہر ہے :

پراکرتوں میں پت (بیٹا) کی مفعولی حالت کی گردان

سہاراشٹری	ماگدھی	اودہ ماگدھی	جیں ماگدھی
واحد : پتاء	پتاء	پتایا	پتائے

حیرانی کی بات ہے کہ مستشرقین نے اتنے واضح حقائق کو کس طرح نظر انداز کر دیا۔ اصل میں سرے سے اس دور کا طرز استدلال ہی غلط تھا۔ مستشرقین کو ہمیشہ یہی جستجو رہی کہ مقامی زبانوں کا فلاں لفظ سنسکرت کے کون سے مادے سے مشتق ہے۔ اس کے لیے وہ سنسکرت کے سمندر کو کھنگالتے اور جو بھی کوئی خرف ریزہ ہاتھ لگ جاتا اسے گوہر مقصود سمجھ کر گلے کا ہار بنا لیتے۔ انہوں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی کہ اس 'فلاں' لفظ کا ماخذ یہاں کی غیر آریائی زبانوں میں بھی تو موجود ہو سکتا ہے۔ اگر ان کے اس طرز فکر کا اس دور کی معلومہ تاریخ کے پس منظر کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا جائے تو انہیں ایک حد تک معذور سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اس وقت تاریخ ہمیں یہی بتلاتی تھی کہ دراوڑی اقوام کا حقیقی وطن جنوبی ہند ہی ہے اور ان کا تاریخی یا تہذیبی لحاظ سے شمالی ہند کے ساتھ کوئی رشتہ موجود نہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ شمالی ہند اور جنوبی ہند کی زبانوں کے درمیان کسی رشتہ کے بارے میں سوچتے۔ لیکن جب محکمہ آثار قدیمہ کی کوششوں سے وادی سندھ کی قدیم غیر آریائی تہذیب منظر عام پر آئی تو اس وقت برصغیر کی زبانوں کے بارے میں تحقیق و تدقیق کے چشمے قریب قریب خشک ہو چکے تھے۔ جاہن بیمر (John Beams)، جارج بیوہلر (G. Buehler)، رابرٹ کاڈویل (R. Caldwell)، کولبروک (Cole Brook)، گنڈرٹ (H. Gundert)، میکس مولر (Max Muller)، جارج گریسن (Grierson)، ارنسٹ ٹرمپ (Trumpp)، ہورنلے (Hornle) اور ویبر (A. Weber) وغیرہ ہم نے اپنے پیچھے جو خلا چھوڑا وہ پر نہ ہو سکا اور اس طرح ان کی تحقیق جامد و ساکت ہو کر رہ گئی۔ اب ان کی تحقیق کو نئے حقائق کی روشنی میں آگے بڑھانے کی بجائے اسے ہی حرف آخر تسلیم کر لیا گیا ہے اور نئی راہوں کی تلاش

کو علمی الحاد کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ آج بھی ہمارے ماہرین لسانیات اپنے گرد و پیش سے آنکھیں بند کیے انہی پرانے خداؤں کی پرستش میں مگن ہیں۔ وہ آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے کہ ماضی کے دھندلکے پردوں کو چیر کر ایک نئی تہذیب اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ تاریخ عالم کے اسٹیج پر جلوہ گر ہو چکی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب ہڑپائی تہذیب کے آثار سے برآمد ہونے والی مہروں پر کندہ تصویری اور علامتی تحریر کو پڑھا نہیں جا سکا تو پھر اس تہذیب کے لسانی پہلو کے بارے میں کچھ کہنا کیسے ممکن ہے۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ بجا لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آخر آریاؤں کی آمد سے قبل یہاں ایک اعلیٰ پایہ تہذیب کی حامل قوم آباد تھی۔ آریا آئے کہیں جنگ و جدل ہوا تو کہیں میل ملاپ۔ بہر حال اس باہمی میل جول کے نتیجے میں مقامی اور نووارد دونوں زبانیں متاثر ہوئیں پھر اس کے بعد کئی ایک دوسری تہذیبی لہریں بھی مقامی زبانوں کو متاثر کرتی رہیں۔ لیکن اس سے کسی طرح بھی یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں کی قدیم زبانیں یکسر نیست و نابود ہو گئیں۔ ہمارے سرمایہ الفاظ میں دراوڑی عنصر کی موجودگی کے ساتھ ساتھ یہاں پر خالصتاً دراوڑی الاصل اضافی اور مفعولی علامتوں کے وسیع استعمال سے یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ ہڑپائی تہذیب کی دراوڑی زبان آج بھی نئے جامہ میں یہاں موجود ہے۔

سنسکرت اور پراکرتیں

”...خداوند نے کہا دیکھو یہ لوگ سب ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے۔ وہ جو یہ کرنے لگے ہیں تو اب کچھ بھی جس کا وہ ارادہ کریں ان سے وہ باقی نہ چھوٹے گا۔ سو آؤ ہم وہاں جا کر ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکیں۔ پس خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روٹے زمین پر پراگندہ کیا۔“

(پیدائش : عہد نامہ عتیق)

انسان ازمنہ قدیم ہی سے لسانی تقسیم کے بارے میں سوچتا رہا ہے لیکن اس کے نظریات اساطیری مفروضوں یا مذہبی روایات تک محدود رہے۔ اہل عرب کی نظر میں دنیا کی زبانیں صرف دو حصوں میں منقسم تھیں اول ان کی اپنی زبان یعنی عربی، دوم وہ تمام غیر زبانیں جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھیں جنہیں انہوں نے تحقیر کے طور پر عجمی یعنی گونگوں کی زبان کا نام دیا۔ یہی حال یونانیوں کا بھی تھا۔ انہوں نے دنیا کی زبانوں کو یونانی اور بربری (وحشی یعنی وہ زبان جو بربر یعنی بڑبڑ کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہ آئے) گروہوں میں بانٹ رکھا تھا۔ آریائی قبائل اپنی زبان کو سنسکرت یعنی شائستہ یا دیوبانی یعنی دیوتاؤں کی زبان قرار دیتے تھے۔ اس کے برعکس برصغیر کی مقامی زبانوں کو پراکرت یعنی خود رو یا پھر ناگ بانی یعنی سانپوں کی زبان کہتے تھے۔ جب تک تقابلی لسانیات نے جنم نہیں لے لیا تب تک اسی قسم کی گروہ بندیوں سے کام چلایا جاتا رہا۔ سامی، حامی، تورانی، سیتھین اور گوڈین وغیرہ اصطلاحات اسی قسم کے طرز فکر کے نتیجہ میں وضع کی گئیں۔ لیکن آج تقابلی لسانیات کی بدولت زبانوں کو بجائے ڈھیلے ڈھالے نسلی یا علاقائی گروہوں میں تقسیم کرنے کے ان کی ہیئت کو مدنظر رکھ کر حد بندی کی گئی ہے۔

آج سے ڈیڑھ دو صدی قبل تک غیر زبانوں کے مطالعے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور اس زمانے میں اس قسم کے مطالعے کے لیے وہ آسانیاں فراہم نہ تھیں جو کہ آج کل کا خاصہ ہے۔ اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانیں کسی خاص مقصد کے لیے سیکھی جاتی تھیں جیسے کہ یورپ میں علم و ہنر کی زبان یونانی تھی اور مذہب کی لاطینی۔ اسی طرح برصغیر پاک و ہند میں فارسی کو علم و ادب اور درباری اور سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا اور اسلامیات عالم کی طرح عربی کو مذہبی زبان کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اس طرح زبانوں کے تقابلی مطالعے کے لیے مواقع فراہم نہ تھے اور نہ اس قسم کی کوئی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ لیکن اب جغرافیائی حدیں ٹوٹ چکی ہیں اور انسانوں کے درمیان علاقائی تعصبات اور نسلی تنافر کی جو وسیع خلیجیں حائل تھیں انہیں آہستہ آہستہ پاٹا جا رہا ہے۔ آج ویت نام کے مجاہد امریکی حکومت سے ہر سر پیکار ہونے کے باوجود کرسس کے موقع پر امریکی عوام کے نام خیر سگالی کے جذبات کا پیغام بھیجتے ہیں۔ اس طرح آج نہ صرف غیر زبانوں کا مطالعہ آسان ہو گیا ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ آج ہم یہ جاننے کے لیے کتنے بے چین ہیں کہ امریکی عوام کے احساسات کیا ہیں۔ روس میں علم و حکمت کی حدوں کو کیسے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ جاپان کی برق رفتار صنعتی ترقی کی تہ میں کیا راز پوشیدہ ہے اور چین کی عظیم الشان قوم کی یکجہتی کے پس منظر میں کون سی قوتیں کارفرما ہیں۔ ان عوامل کے مطالعے کے لیے محض تراجم پر انحصار نہیں کیا جا سکتا بلکہ کسی قوم کی روح کے اندر جھانکنے کے لیے اس کی زبان سے شناسائی لازمی ہے۔

تقابلی لسانیات کی تاریخ

گو تقابلی لسانیات کے جرثومے بڑی دیر سے پرورش پا رہے تھے۔ کوئی ایک صدی قبل از مسیح میں رومن گرامر دان مارکس تیرنٹیوس وارو (Marcus Terentius Varro) نے لاطینی اور یونانی کے درمیان بعض مماثلتوں کا ذکر کیا ہے لیکن اس نے اس سے یہ غلط نتیجہ اخذ کیا کہ لاطینی نے یونانی سے جنم لیا ہے۔ حقیقت میں تقابلی لسانیات کو سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کا سہرا جرمنی کے ماہر لسانیات فرانز بوب

(Franz Bopp) (۱۷۹۱ تا ۱۸۶۷ء) کے سر بندھتا ہے اور سنسکرت کی دریافت اس نئی سائنس کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ لیکن خود یورپ میں یہ تحریک پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ جوسف جوسٹس شلیگر (Joseph Justus Scaliger) (۱۵۴۰ تا ۱۶۰۹ء) نے یورپی زبانوں کے بارے میں ایک رسالہ قلمبند کیا جس میں اس نے ان زبانوں کو گیارہ مختلف گروہوں میں تقسیم کیا۔ اس تقسیم کی بنیادیں مترادف الفاظ کی مطابقت اور ان کے اختلافات پر رکھی گئی تھیں۔

اس سلسلے میں مشہور ریاضی دان لیبنز (Leibniz) کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس نے بڑی محنت سے معلومہ زبانوں کا سرمایہ، الفاظ اکٹھا کیا۔ ان کوششوں میں اسے زارینہ، روس کیتھرائن ثانی کی سرپرستی حاصل تھی۔ بعد ازاں یہ مجموعہ، الفاظ مناسب گروہ بندی کے لیے ایک جرمن سیاح پالاس (Pallas) کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ، 'دنیا کی زبانوں کا تقابلی فرہنگ' کی صورت میں ۱۷۸۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں دو سو پچاس الفاظ کے مترادفات درج تھے۔ یہ تالیف دو سو (۲۰۰) زبانوں پر محیط تھی جن میں ایک سو انچاس (۱۴۹) ایشیائی اور انچاس (۴۹) یورپی زبانیں شامل تھیں۔ اس کی ایک اگلی اشاعت میں افریقی اور امریکہ کے سرخ ہندوستانیوں کی زبانوں کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس عہد میں اتنے وسیع مطالعے کے لیے ضروری آسانیاں فراہم نہ تھیں۔ اس لیے اس میں کئی ایک خامیوں کا باقی رہ جانا لازمی تھا۔ اس تالیف کا سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ اس نے ایک نئی تحریک کو جنم دیا جو کہ پروان چڑھ کر تقابلی لسانیات کی سائنس کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

پالاس کے تقابلی فرہنگ سے متاثر ہو کر ہسپانوی ماہر لسانیات لورینزو ہیرواس (Lorenzo Hervás) (۱۷۳۵ تا ۱۸۰۹ء) نے ۱۸۰۵ء میں 'زبانوں اور بولیوں کی اساس پر اقوام عالم کی تقسیم' شائع کی جس میں تین سو مختلف زبانوں کے نمونے پیش کیے گئے تھے۔ اسی طرح جرمنی کے فلاسفر اور گرامر دان ایڈلنگ (Adelung) نے 'زبانوں کی عمومی سائنس' کے عنوان سے اپنی کوششوں کو ۱۸۰۶ء تا ۱۸۱۷ء میں چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ اس میں دنیا کی پانچ سو زبانوں اور بولیوں

میں عیسائی مذہب کی 'مناجات ربانی' کے نمونے درج تھے -

دوسری طرف برصغیر میں یورپی اقوام کی آمد نے مشرقی علوم خاص کر سنسکرت کے مطالعے کی داغ بیل ڈال دی - ۱۵۹۷ء میں ایک اطالوی سیاح بونا ونتورا ولگانیؤس (Bonaventura Vulcanius) نے اپنے مشاہدہ کی بناء پر ذکر کیا کہ جرمن اور فارسی زبانوں میں بائیس الفاظ مشترک طور پر مستعمل ہیں - اسی طرح سولہویں صدی عیسوی میں ایک دوسرے اطالوی باشندے سسیٹی (Sasseti) نے ہندوستان کی سیاحت کے بعد اس حقیقت کا اظہار کیا کہ سنسکرت اور اطالوی زبانوں میں چھ ، سات ، آٹھ ، نو ، خدا اور سانپ کے لیے ایک ہی قسم کے الفاظ مستعمل ہیں جیسے کہ اطالوی میں سئی (Sei) ، ستے ، آٹو ، نووے ، دیو اور سرپ ہے - سنسکرت میں سس ، سپت ، اسٹو ، ناوا ، دیوا اور سرپ ہے -

یسوعی فرقے کا پادری ہینرک راتھ (Heinrich Roth) (۱۶۲۰ تا ۱۶۶۸ء) سب سے پہلا یورپی ہے جس نے سنسکرت کے بارے میں تحقیق و تدقیق کا کام شروع کیا - وہ تیس سال کی عمر میں برصغیر میں وارد ہوا - پہلے گوا میں قیام کیا پھر ۱۶۵۴ء میں آگرہ میں رہائش اختیار کی - یہاں اس نے ہندوستانی ، فارسی اور سنسکرت میں دسترس حاصل کی اور یہیں اس نے اپنی مشہور کتاب 'سنسکرت گرامر' تالیف کی - لورینزو پیرواس نے بھی اس مخطوطے سے استفادہ کرنے کا ذکر کیا ہے - جرمن یسوعی پادری جاہنیز ارنسٹ ہانزلبین (Johannes Ernst Hanxleben) نے ہندوستان میں اپنے قیام ۱۶۹۹ء تا ۱۷۳۲ء کے دوران 'سنسکرت گرامر' اور 'لغات مالابار' نامی دو کتابیں قلمبند کیں جن سے مغربی مستشرقین خاص طور پر فریڈرک شلیگل نے کافی استفادہ کیا - آسٹریا کے ایک عالم کارمیلائیٹ پالینوس (Carmelite Paulinus) نے بھی مالا بار میں اپنے قیام (۱۷۷۶ء تا ۱۷۸۹ء) کے دوران سنسکرت گرامر ترتیب دی جو کہ ۱۷۹۰ء میں روم سے اشاعت پذیر ہوئی - پالینوس نے اس کے علاوہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن ، مذہب اور ادب کے بارے میں اور بھی کئی کتابیں قلمبند کیں - ان میں اٹلی کے شہر پدوا (Padua) سے ۱۷۹۸ء میں شائع ہونے والی ایک کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ اس میں

اس نے ژند ، سنسکرت اور جرمن زبانوں کے درمیان بعض مشترک خصوصیات کا ذکر کیا ہے ۔

ایک جرمن مبلغ بنجامن شولز (Benjamin Schultze) نے ۱۹ اگست ۱۷۲۵ء کو پروفیسر فرینکن کے نام ایک خط میں اس دلچسپ اتفاق کا ذکر کیا کہ سنسکرت ، جرمن اور لاطینی میں بڑی حد تک مماثلت موجود ہے ۔ خاص کر ان کے اعداد کے ناموں میں ۔ ایک یسوعی پادری پونس (Pons) نے ۱۷۴۰ء میں سنسکرت ، لاطینی اور یونانی کے درمیان بعض مشابہتوں کا ذکر کیا تھا جس کا حوالہ بینفے (Benfey) نے اپنی تصنیف 'لسانیات کی تاریخ' میں دیا ہے ۔ ایک فرانسیسی یسوعی مبلغ کارڈوز (Cordoux) نے ۱۷۶۷ء میں فرانسیسی تعلیمی ادارے کے نام ایک یادداشت بھیجی جس میں سنسکرت اور لاطینی الفاظ کے درمیان مماثلت کا ذکر تھا ۔

اہل مغرب کو سنسکرت سے متعارف کرانے اور تقابلی لسانیات کی داغ بیل ڈالنے میں سرولیم جونز (William Jones) (۱۷۴۶ تا ۱۷۹۳ء) کو اولیت کا شرف حاصل ہے ۔ حیرو اور آکسفورڈ میں اپنی طالب علمانہ زندگی ہی میں اس کے جوہر نمایاں ہونے لگے تھے ۔ خاص کر غیر زبانوں سے اسے والہانہ شغف حاصل تھا ۔ چوبیس سال کی عمر ہی میں اس نے دس غیر زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا جن میں عبرانی ، عربی اور فارسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ذریعہٴ معاش کے طور پر اس نے وکالت سیکھی اور ۱۷۷۴ء میں وکالت کی سند حاصل کر لی ۔ ۱۷۸۳ء میں اسے فورٹ ولیم کلکتہ کی سپریم کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کر دیا گیا ۔ یہاں اسے سنسکرت کا گہرے طور پر مطالعہ کرنے کا موقع ملا ۔ ۱۷۸۴ء میں اس نے ایک دوسرے انگریز عالم سر چالس ولکنز کے تعاون سے مشرقی علوم کی ترویج و ترقی کے لیے ایشیائیک سوسائٹی کی بنیاد رکھی ۔ ۲۷ ستمبر ۱۷۸۶ء کو اس سوسائٹی کے تیسرے سالانہ جلسے میں اس نے اپنے تاریخی خطبے میں جو الفاظ کہے انہیں آج تقابلی لسانیات کی بنیادیں تسلیم کیا جاتا ہے ۔ اس خطبے میں اس نے سنسکرت ، یونانی ، لاطینی ، جرمن ، کٹی اور فارسی کے درمیان باہمی لسانی رشتوں کا ذکر واضح اور واشگاف الفاظ میں کیا ۔ اگرچہ وہ خود اپنی زندگی میں اس تقابلی مطالعے کو بالتفصیل پیش نہ کر سکا لیکن اس کے قائم کردہ

مکتب فکر کے حامیوں نے اپنی کاوشوں سے اس کے نظریات کو حقیقت کا روپ دے دیا۔

۱۸۰۲ء میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو اسی وقت اتفاق سے ایک انگریز ماہر سنسکرت الیگزینڈر ہملٹن (Alexander Hamilton) (۱۷۶۵ تا ۱۸۲۴ء) فرانس کے راستے اپنے وطن کو واپس لوٹ رہا تھا کہ اسے قید کر لیا گیا اور اسے فرانسیسی علماء کو سنسکرت پڑھانے کی سزا دی گئی۔ اس سزا سے استفادہ کرنے والوں میں فرانسیسی علماء کے علاوہ جرمنی کا رومانی شاعر فریڈرک شلیگل (Friedrich Schlegel) (۱۷۷۲ تا ۱۸۲۹ء) بھی شامل تھا۔ اس پہلو میں مزید مطالعے کے بعد فریڈرک شلیگل نے ۱۸۰۸ء میں اپنی معلومات کو 'ہندوستان کی زبان اور حکمت' کی صورت میں شائع کیا۔ اس میں اس نے سنسکرت اور اہم یورپی زبانوں کے تفصیلی موازنے کے بعد ان کے سرمایہ الفاظ اور گرامر کی خصوصیات کے درمیان باہمی رشتوں کو ایک امر مسلمہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ انہی دنوں میں ڈنمارک کے ایک عالم راسموس راسک (Rasmus Rask) (۱۷۸۷ تا ۱۸۳۲ء) نے بھی اپنے وسیع مطالعے اور سیاحت کے نتیجے میں اپنی تصنیفات میں اسی نظریہ کی تائید کی۔

جیکب گرم (Jakob Grimm) (۱۷۸۵ تا ۱۸۶۳ء) نے اپنے بھائی ولہلم (Wilhelm) (۱۷۸۶ تا ۱۸۵۹ء) کے تعاون سے راسک کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں قدیم جرمن شاعری اور لوک گیتوں کا مطالعہ کیا۔ اس طرح مختلف زبانوں میں الفاظ کے صوتی تہیر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے جو اصول و ضوابط پیش کیے آج انہیں اس کے نام کی نسبت سے 'قانون گرم' کہا جاتا ہے۔ اس کی ۱۸۲۲ء میں شائع شدہ 'تقابلہ جرمن گرامر' کے اب تک سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس سے قبل زبان اور ادب کو لازم و ملزوم تسلیم کیا جاتا تھا۔ یعنی جن زبانوں میں ادبی تخلیقات موجود نہ ہوں انہیں زبان کی حیثیت سے درخور اعتناء تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن جیکب گرم نے ان کی اپنی آزاد اور جداگانہ حیثیت کا نظریہ پیش کیا اور کہا کہ زبان اپنے تعارف کے لیے ادب کی محتاج نہیں بلکہ انفرادی طور پر ایک مقام کی حامل ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جرمنی کے مشہور ماہر لسانیات فرانز بوب ہی نے سب سے پہلے تقابلی لسانیات کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا۔ اصل میں اس عہد میں جہاں ایک طرف ہیرواس اور ایڈلنگ کے تقابلی فرہنگ ذہنوں کو متاثر کر رہے تھے تو دوسری طرف شایگل راسک اور گرم کی تصنیفات ذہنوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ اب یہ دھارے مل کر ایک ندی کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ اگرچہ تقابلی فرہنگوں کی تحریک کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی لیکن پھر بھی اس سے انکار نا ممکن ہے کہ اس تحریک نے نئے بیج بونے کے لیے زمین کو پہلے سے تیار کر دیا تھا۔ فرانز بوب سب سے زیادہ شلیگل کی تصنیف 'ہندوستان کی زبان اور حکمت' سے متاثر ہوا۔ اس نے باویریا میں لیسیم (Lyceum) کے مقام پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۱۲ء میں سنسکرت کے مطالعے کے لیے حکومت کے خرچ پر پیرس کی راہ لی۔ وہاں چار سال کی تعلیم کے بعد اس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'سنسکرت کے صرفی پہلو کا یونانی، لاطینی، فارسی اور جرمن زبانوں سے موازنہ' مرتب کی۔ بوب کا خیال تھا کہ وہ ان زبانوں کی صرف و نحو کے تقابلی جائزے کی مدد سے ان کی اس ابتدائی صورت کا اندازہ لگا سکے گا جب کہ ابھی تک یہ ایک ہی زبان تھیں اور ان میں مختلف بولیوں کا فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن زندگی کی ناپائیداری نے اسے اپنے ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی مہلت نہ دی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس کے نظریات کی بنیادوں پر تقابلی صرف و نحو کی عہارت استوار کر دی گئی۔ جیسا کہ کولمبس اگرچہ ہندوستان کی تلاش میں نکلا تھا لیکن اس میں ناکامی کے باوجود ایک نئی سر زمین کی دریافت کا باعث بن گیا۔

لسانی تقسیم کی بنیادیں

یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا کہ بظاہر نظر آتا ہے۔ خاص طور پر جب کبھی برصغیر کی موجودہ زبانوں کی تقسیم کا مسئلہ زیر بحث لایا جاتا ہے تو اکثر ان کے بنیادی عناصر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس پہلو میں کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل زبان کے تخلیقی پہلوؤں اور اس کے ارتقاء کی مختلف کڑیوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کے بعد انسانی

نسلوں کی گروہ بندی اور ازمناہ قدیم میں ان مختلف النسل گروہوں کی نقل مکانی کے راستوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ پھر تہذیبی روابط اور زبانوں کے باہمی میل جول سے پیدا ہونے والے مسائل کا احاطہ بھی لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام امور کا ایک مختصر سے مضمون میں احاطہ کرنا ممکنات میں سے نہیں۔ بلکہ یہ موضوعات ایسے ہیں کہ جو خود ضخیم جلدوں کے متقاضی ہیں۔

آج ان فرسودہ نظریات کے لیے علمی دنیا میں کوئی جگہ نہیں کہ جس کی رو سے شروع میں کسی ایک ہی مقام پر ایک ہی زبان پیدا ہوئی اور پھر آگے چل کر تمام دنیا میں پھیل گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف جغرافیائی حالات کے تحت مختلف مقامات پر مختلف زبانوں نے جنم لیا اور پھر مختلف طور پر ارتقائی منازل طے کیں۔ یہ تخلیق و ارتقاء کا پہلو آج بھی جاری و ساری ہے۔ فرسودہ الفاظ اور کہنہ تراکیب خشک پتوں کی طرح جھڑتی چلی جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئی کونپلیں پھوٹی اور پھلتی رہتی ہیں۔ ایسے الفاظ کی کمی نہیں جو کہ آج سے صدی ڈیڑھ صدی قبل بہاری زبان کا ایک جزو لاینفک تھے لیکن آج وہ بہاری فرہنگوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ دور کیوں جائے آج سے ربع صدی پہلے، بھہیلی، رتھ، بگھی، فٹن، و کٹوریہ اور ٹم ٹم وغیرہ بہاری روزمرہ کی زبان کا حصہ تھے لیکن آج شاذ و نادر ہی سننے میں آتے ہیں۔ اس کے برعکس ہائیڈروجن، ایٹم بم، ریڈیو، ٹیلیویژن، راکٹ، خلائی طیارے، سینا سکوپ اور کتنے ہی دوسرے الفاظ نادانستہ طور پر بہاری زبان میں داخل ہو چکے ہیں اور یہ ترک و انجذاب کا عمل زبان کی زندگی کے ساتھ ساتھ یونہی جاری و ساری رہے گا۔

جیسا کہ مذکور ہے لسانی تقسیم اور انسانی نسلی گروہ بندی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن یہاں ہم بجائے اس کے عمومی پہلو پر بحث کرنے کے اپنے موضوع کو صرف برصغیر تک محدود رکھیں گے۔ سب سے پہلے ہمیں دیکھنا ہے کہ زبان کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ اگرچہ اظہار خیال کے لیے اشاروں، کنایوں، چہرے کے تاثرات، سیٹیوں، تالیوں، ڈھول کی تھاپ اور کئی ایک دوسرے طریقوں سے کام لیا جا سکتا ہے بلکہ لیا جاتا ہے لیکن ہم یہاں زبان سے مراد اس

اظہار خیال سے لیتے ہیں جو کہ باہمی گفت و شنید کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ دوسرے معنوں میں زبان ان صوتی اکائیوں کے مجموعے کی مخصوص ترتیب کا نام ہے جو کہ انسانی نطقی اعصاب کی حرکات و سکنات کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں اور اعصاب سہاعت کے ذریعے ذہن انسانی تک پہنچ کر کچھ معنی پیدا کرتی ہیں۔ یعنی نطق انسانی صوتی اکائیوں کو جنم دیتا ہے۔ صوتی اکائیوں کی مخصوص ترتیب کے نتیجے میں الفاظ تشکیل پاتے ہیں اور یہ الفاظ ہماری روزمرہ کی بات چیت کا اینٹ مسالا ہیں جن سے زبان کی عمارت تکمیل پذیر ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ مختلف انسانی نسلی گروہوں کے نطقی اعصاب کی ہیئت کے اختلافات، مخصوص مورثی پس منظر اور مختلف لسانی رجحانات کے نتیجے میں صوتی تفاوت، الفاظ کی ہیئت کے اختلافات اور الفاظ کی ترکیبی ہیئت میں عدم مطابقت کا ہونا لازمی امر ہے۔

اگر دیوار کے دوسری طرف کچھ افراد بات چیت کر رہے ہوں تو ہم بغیر دیکھے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ زید اور بکر آپس میں باتیں کر رہے ہیں بلکہ اگر شور و غوغا کا عالم بھی ہو اور صدہا اشخاص ایک ہی وقت میں بول رہے ہوں تو بھی ہم باسانی مختلف افراد کی آوازوں کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر ایک شخص کا لب و لہجہ دوسرے سے جدا ہے۔ مختلف صوتی اکائیوں کے درمیان وقفوں کے انداز میں اختلاف ہے اور ہر ایک کی آواز کا زیر و بم ایک دوسرے سے علیحدہ ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو ایک ہی محلے میں بسنے والے اور ایک ہی زبان کے حامل لیکن مختلف نسلی، مذہبی یا طبقاتی گروہوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی زبانوں میں ایک حد تک اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آزادی سے پہلے خود متحدہ پنجاب میں جب مختلف مذاہب کے لوگ محلوں میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو آباد تھے تو ان کی زبانوں میں بنیادی یگانگت کے باوجود فروعی اختلافات موجود تھے۔ ہندو گھرانوں میں ماں کو بھابو، باپ کو لالہ یا بابو جی اور بھائی کو بھائی پکارا جاتا تھا۔ سکھوں میں ماں کو انبو، باپ کو بابو یا چاچا اور بھائی کو ویر کہتے تھے۔ مسلمانوں میں ماں کو بے یا ماں، باپ کو ابا، بابو یا چاچا اور بھائی کو بھرا یا ویر

کہنے کا رواج تھا۔ علاقائی بولیوں میں بھی اس قسم کے اختلافات موجود ہوتے ہیں جیسے کہ پنجاب کے دوآبہ اور مالوہ کے علاقے میں بھائی کو بھرا، ماجھا میں بھاء، امرتسر کے علاقے میں بھاؤ، لہندا میں بھرا اور پوٹھوہار میں بھاپا کہتے ہیں۔ اسی قسم کے لسانی اختلافات سے افراد اور اقوام کو ایک دوسرے سے ممیز کیا جاتا ہے اور انہی اختلافات کی بنیادوں پر مختلف انسانی گروہوں میں حد فاصل قائم کی جاتی ہے۔

زبانوں کی تقسیم اور گروہ بندی

جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں زبان صوتی اکائیوں کے مجموعے کی با معنی ترتیب کا نام ہے۔ یعنی اس میں تین مختلف عوامل کارفرما ہیں: اول نطق انسانی سے پیدا شدہ اصوات، دوم صوتی اکائیوں کے ذریعے تشکیل پانے والے مجموعہ، اصوات یعنی الفاظ، سوم الفاظ کی مخصوص ترتیب یعنی صرف و نحو۔ لازماً لسانی تقسیم کی بنیادیں بھی انہی تین عناصر پر استوار کی جا سکتی ہیں اور انہی تینوں عناصر کے باہمی اشتراک یا اختلاف کی بناء ہی پر مختلف لسانی گروہوں کے باہمی رشتوں ناطوں کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

صوتیات

نطق انسانی کے فطری طور پر ایک ہی ہیئت کے ہونے کی وجہ سے مختلف اقوام کے درمیان آوازوں کا اشتراک یا ان میں مماثلت کا ہونا کوئی غیر فطری امر نہیں لیکن پھر بھی کئی ایک ایسی آوازیں ہیں جو کہ مخصوص جغرافیائی یا نسلی گروہوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور اکثر اوقات یہی مخصوص صوتی نظام لسانی گروہوں کے درمیان وجہ امتیاز تسلیم کیا جاتا ہے۔

لیکن لسانی تقسیم میں صوتیات کو حرف آخر تصور کرنا کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ لسانی گروہوں کی نقل مکانی کے دوران نئے ماحول اور نئے تقاضوں کے زیر اثر ان کے آہنگ میں کئی ایک انقلابی قسم کی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ سب سے بڑی اور واضح مثال خود سنسکرت ہی کی ہے۔ آریائی زبانیں بنیادی طور پر لٹوی، حلقی و تالوئی غنائیہ اور مدہم ہائیں

آوازوں سے یکسر مبرا ہیں۔ یہ آوازیں برصغیر پاک و ہند کے قدیم لسانی گروہوں، منڈا اور دراوڑی کی خصوصیات میں سے ہیں لیکن جب آریائی قبائل برصغیر میں آباد ہو گئے تو مقامی اثرات کے تحت ان کی زبان کی صوتی ہیئت میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ اگرچہ سنسکرت اپنی لغوی اور صرفی و نحوی خصوصیات کی بناء پر آریائی لسانی گروہ کی ایک اہم ترین رکن تصور کی جاتی ہے لیکن اس کے صوتی پہلو پر مقامی رنگ غالب ہے اور مذکورہ بالا مستعار شدہ آوازیں اس کے صوتی نظم کا ایک جزو لاینفک تسلیم کی جاتی ہیں۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی اس قسم کے اثرات کی مثالوں کی کمی نہیں۔ افریقہ کی عربی بولنے والی غیر عرب نسل سے تعلق رکھنے والی اقوام اکثر ض، خ، غ اور ق وغیرہ آوازوں کا تلفظ اس طرح ادا نہیں کر سکتیں جیسا کہ حجاز کے تازی عربوں کا خاصہ ہے۔ اس پہلو میں علماء کے گروہ کو استثنائی حیثیت حاصل ہے۔

لغات

صوتیات کے بعد سرمایہ الفاظ کی باری آتی ہے۔ مختلف زبانوں میں الفاظ کا کثرت اشتراک یا ان کے درمیان گہری مماثلت اور مطابقت ان میں باہمی لسانی رشتوں کی غمازی کرتی ہے۔ لیکن الفاظ کا یہی گہرا اشتراک کسی سابق دور میں ان زبانوں کی حامل اقوام کے آبا و اجداد کے درمیان گہرے تہذیبی رشتے یا وسیع تجارتی تعلقات کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ سنسکرت میں دراوڑی عنصر، فارسی اور ہسپانوی میں عربی، اردو اور برصغیر کے شمالی حصے کی دیگر زبانوں میں پرتگیزی عناصر کی موجودگی سے واضح ہوتا ہے۔ پھر بھی اکثر اہل الرائے حضرات کی نظر میں بنیادی الفاظ مثلاً ضہائر، رشتہ جات، اعداد و شمار، خورد و نوش، صفات اور بنیادی افعال وغیرہ کا اشتراک ان زبانوں کے درمیان باہمی رشتوں کی دلیل تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن کئی ایک محققین محض الفاظ کے اشتراک کی بناء پر کوئی فیصلہ صادر کرنا مناسب نہیں سمجھتے تاوقتیکہ اس کے صوتی اور صرفی و نحوی پہلو سے بھی اس کی تائید نہ ہوتی ہو اور یہ بات قرین عقل بھی ہے۔

صرف و نحو

جس طرح سے ماہرین حیاتیات حیوانات کی اصناف بندی کرتے وقت

ان کے ظاہری خد و خال کے علاوہ ان کے ڈھانچوں کا تقابلی جائزہ لینا اور مختلف ارتقائی منازل اور ماحول کے اثرات کے تحت پیدا شدہ اختلافات کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں بعینہ اسی طرح ماہرین لسانیات کے لیے زبانوں کے باہمی رشتوں کا تعین کرتے وقت لغات اور صوتیات کے علاوہ ان کے صرفی و نحوی ڈھانچوں کا جائزہ لینا اور ان کی مختلف ارتقائی منازل کا گہرا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

گو مختلف زبانوں کی ہم آہنگی یا غیر آہنگی سے ہم دھوکا کھا سکتے ہیں۔ سرمایہ الفاظ کی مماثلت یا تفاوت کی بناء پر ہم غلط نتائج اخذ کر سکتے ہیں لیکن صرفی و نحوی ڈھانچوں کا تقابلی جائزہ اور ان کی ارتقائی منازل کا مطالعہ ہمیں صحیح منزل تک پہنچانے کا ضامن ہے۔

گرامر کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں : اول انفرادی الفاظ کی ہیئت اور دوم جملے کی ترکیب لفظی۔ مختلف نسلی یا علاقائی گروہوں میں مختلف عادات اور علاحدہ علاحدہ جغرافیائی ماحول کے اثرات روز مرہ بول چال پر بھی اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں جیسے کہ ان کے رسم و رواج اور رہن سہن پر۔ کفایت لسانی اور سہل لسانی کی مختلف عادات کی بدولت الفاظ کی ہیئت بھی مختلف خطوط پر تشکیل پاتی ہے۔

انسانی زبان کے اولین مراحل کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا ممکنات میں سے نہیں کیونکہ جہاں تک اس کرہ ارض پر انسانی زندگی کے وجود کا تعلق ہے ماہرین کے نزدیک یہ آٹھ لاکھ سال سے دس لاکھ سال قبل تاریخ تک محیط ہے جب کہ انسانی زبان کا دستاویزی ثبوت زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سال پرانا ہے۔ اتنے طویل عرصے میں انسانی زبان کن کن ارتقائی مدارج سے گزری ہے اور مختلف اوقات میں مختلف جغرافیائی حدود میں اس میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اس کا تعین کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی دستاویزی ثبوت فراہم نہیں۔ صرف ذہن رسا کی مدد سے ہم اس قبل از تاریخ کے تاریک دور کی تاریکیوں میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ماہرین کے نزدیک انسان کی اولین زبان محض یک رکنی اصوات تک محدود تھی جیسے کہ، جا، لا اور آ وغیرہ۔ بعد ازاں جیسے جیسے

انسان ارتقاء کی منزلیں طے کرتا گیا اسی طرح زبان بھی ترقی کرتی چلی گئی اور مفرد اصوات کی جگہ مرکب الفاظ تشکیل پذیر ہونے لگے اور یہیں سے انسانی زبان میں تفاوت کا بیج بو دیا گیا جس سے مختلف علاقوں یا نسلی گروہوں میں زبان کے ارتقاء کے علاحدہ علاحدہ راستے متعین ہو گئے۔ بعض زبانیں الفاظ کی ہیئت کے لحاظ سے ابھی تک ارتقاء کی ابتدائی منازل ہی میں ہیں اور ان کا زیادہ تر سرمایہ الفاظ یک یا دو رکنی اصوات تک محدود ہے۔ ان میں مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا کی زبانیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جیسے کہ :

چینی : کان (دیکھنا)، ہسی (لکھنا)، جین (آدمی)، فانگ (گھر)، ہائی (بچہ)، ہاؤ (اچھا)۔

جاپانی : کوکو (یہاں)، کا کے (بیٹھنا)، کودے (یہ)، یاما (پھاڑ)، کوا (دریا)، میزو (پانی)، فی (پر)۔

کوریائی : پی (بارش)، پے (جہاز)، پان (کمرہ)، مل (پانی)، پم (رات)، نن (آنکھ)، سن (ہاتھ)، تن (دولت)۔

لسانی ارتقاء کی دوسری کڑی مرکب الفاظ کی تشکیل ہے جو کہ دو یا دو سے زیادہ مفرد الفاظ یا سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے ترکیب پاتے ہیں جیسے کہ فارسی شاباش (شاد + باش)، تندرست (تن + درست) اور برشگال (ورش + گال)، سنسکرت سنگھم (سم بمعنی اکھٹا + گام بمعنی جانا یعنی اکھٹے جانا)، دھنیجیا (دھن بمعنی دولت + جے بمعنی فتح یعنی مال غنیمت)۔ اسی طرح جرمن وسن شافٹ (وسن بمعنی عقل، دانش + شافٹ بمعنی صورت یعنی حکمت، سائنس)۔ اسی طرز پر سویڈی، ویٹن شاپ اور ڈنمارکی ویڈن شاپ بمعنی سائنس، علم و حکمت وغیرہ۔

برصغیر کی قدیم زبانوں مثلاً منڈا اور دراوڑی گروہ کی مختلف شاخوں میں بھی اس قسم کی مثالیں عام ہیں جیسے کہ منڈاری میں :

آسر : تیر کہاں (آ : کہاں - سر : تیر)

آجی لیدرا : بیاہ شادی کے موقع پر بیوی کی دادی کو دیا جانے والا کپڑا۔

(آجی : بزرگ عورت - لیدرا : کپڑا - پنجابی : لیترا)

باہا پرب : پھولوں کا جنم دن - منڈا قبائل کا ایک تہوار جو کہ
ماہ چیت میں سال نام کے درخت کے شگوفے پھوٹنے کے
موقع پر منایا جاتا ہے -

(باہا : پھول - پرب : یوم پیدائش)

دراوڑی زبانوں سے مثالیں

ناڑ پتو (تامل) : چالیس (ناڑ ، نال : چار - پتو : دس)

ناڑ کالی (تامل) : چار پاؤں والی یعنی کرسی - (ناڑ : چار -
کال : پاؤں - پنجابی : کھلا)

کارہولو (کناری) : برساتی گھاس (کار : موسم برسات ہواو : گھاس)

ہاری اپنی زبان بھی اس قسم کے مرکبات سے بھری پڑی ہے جیسے
کہ جنگجو ، چارپائی ، منجدھار اور کھیون ہار وغیرہ -

الفاظ کی تشکیل کے بعد ایک جملے میں الفاظ کی ترکیب کا مسئلہ
سامنے آتا ہے - مختلف نسلی اور علاقائی گروہوں میں اظہار خیال کے لیے
بنیادی الفاظ کی ترتیب ایک دوسرے سے جدا ہے - بعض گروہوں میں
فاعل، فعل اور حروف ربط کو علاحدہ علاحدہ اکائیوں کی صورت میں استعمال
کیا جاتا ہے اور بعض میں ان اکائیوں کو سہل لسانی اور کفایت لسانی
کے رجحانات کے زیر اثر ایک دوسرے میں مدغم کر دیا جاتا ہے - اس
طرح مختلف صرفی و نحوی ڈھانچوں نے جنم لیا اور آج انہی اختلافات کی بناء پر
زبانوں کو قواعد گرامر کے اعتبار سے مختلف زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے -
ماہرین نے دنیا کی زبانوں کو صرف و نحو کے لحاظ سے دو بڑے گروہوں
میں تقسیم کیا ہے : اول تصریفی ، دوم غیر تصریفی - آریائی ، سامی
اور بعض امریکی قبائل کی زبانیں اولین گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور
قریب قریب باقی تمام زبانیں دوسرے گروہ سے - دوسرے گروہ کو ہیئت
کے لحاظ سے ماہرین نے مزید دو حصوں انفرادی (Isolating) اور
اتصالی (Agglutinative) میں تقسیم کیا ہے -

انفرادی زمرہ سے تعلق رکھنے والی زبانوں میں چینی اور اس سے منسلک شاخوں کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان میں بنیادی الفاظ کے ساتھ کوئی لاحقے یا سابقے استعمال نہیں کیے جاتے بلکہ ہر ایک لفظ انفرادی طور پر اپنی الگ حیثیت میں استعمال ہوتا ہے۔ ان میں فاعل، فعل اور مفعول کی ترتیب کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی ہے جیسے کہ چینی زبان کی مندرجہ ذیل مثالوں سے ظاہر ہے:

(الف) جین تی فانگ زو : آدمی کا گھر

چینی زبان میں 'زو' کا لفظ جملے کے تکملے کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور کوئی معنی نہیں دیتا۔

(ب) چے جین کان چیئن ہائی زو

یہ آدمی نظر دیکھا بچہ : اس آدمی نے بچہ دیکھا

(ج) وو شو تیئن ہشے

میں گزرے دن لکھا : میں نے کل لکھا

اتصالی یا تالیفی زبانوں کے زمرے میں آریائی سامی اور بعض قدیم امریکی زبانوں کو چھوڑ کر قریب قریب باقی تمام زبانیں شامل ہیں۔ خاص کر سلاوی، یورالی، التائی، منگولی، ترکی، تاتاری اور برصغیر پاک و ہند کی اکثر زبانیں یعنی دراوڑی، منڈا، دامن ہالیہ کی پہاڑی زبانیں، شمال مشرقی اور مشرقی ہند کی ناگا زبانیں اور پراکرتوں سے ماخوذ تمام تر زبانیں شامل ہیں۔ یہ زمرہ اصل میں انفرادی اور تصریفی زبانوں کی درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان زبانوں میں اکثر بنیادی الفاظ کے ساتھ لاحقات کے اتصال سے مطلوبہ معنی حاصل کر لیے جاتے ہیں لیکن بنیادی الفاظ اور لاحقات کو ایک دوسرے سے بڑی آسانی سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ یہ لاحقات مکمل الفاظ کا مخفف ہوتے ہیں اور انفرادی طور پر بھی معنی کے حامل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان لاحقات کی اصل گم ہو چکی ہوتی ہے اور انفرادی طور پر یہ کچھ معنی نہیں دیتے لیکن بنیادی الفاظ کے ساتھ مل کر معنی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس زمرے میں کئی ایک زبانیں انفرادی گروہ سے قریب ہیں اور کئی ایک تصریفی گروہ سے لگاؤ کھاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دراوڑی،

پنجابی اور اردو زبان کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔ یہ زبانیں گو اتصالی گروہ سے منسلک قرار دی جاتی ہیں لیکن ان میں نہ تو جڑواں الفاظ کی بھرمار ہے اور نہ الفاظ کی تشکیل میں لاحقوں یا سابقوں سے زیادہ مدد لی گئی ہے جیسے کہ :

اردو	پنجابی	کناری
ان فالتو کاغذوں کو جلا دو کل کی رات چوری ہو گئی بہت گرمی ہے میں نے گاڑی گزار دی (یعنی میں گاڑی سے رہ گیا) روٹی کو مکھن اچھی طرح لگاؤ	ایہ وادھو کاگتاں نوں ساڑ دیتو کل دی رات چوری ہو گئی (کالا : چور) باہلا سیک ہے گا میں گڈی ٹہادق (ملتان : ماں : میں) روٹی نوں مکھن چنگالاؤ	(ا) اے انو پائکتا کا گدلا نوں سوڑو (ب) کلے دا راتری کلو و آتو (ج) باہلا سیک آگیدے (د) نان گے گاڈی ٹھے تو (ر) روٹی گے بین چناگی بچھو

اردو	پنجابی	تلگو
<p>اس نے بیوی کو مارا صندوق کو تالا لگاؤ سہر بان کر کے کچھ آگے سرک جائیں</p> <p>یہ راستہ کہاں تک پہنچاتا ہے یعنی یہ راستہ کہاں جاتا ہے</p>	<p>اوہ نے وھٹی نوں کھیا پٹی نوں (ملتانى : کو) چندرالاؤ دیا (سہر بانى) کر کے کچھ پرے سر کو ایہ واٹ کیتھے (ملتانى : کدائیں) پچوندی اے</p>	<p>(الف) اتا نوں بھار یا نوں کھینو (ب) پٹی کو بیگام و بی (ج) دیا ونچھئی کو نچھم پئی زرگن دی (د) اے باٹ اکاڈ کی پوتوندی</p>

جو عنصر دراوڑی اور برصغیر کے شالی حصے کی زبانوں کے اتصالی گروہ میں شمار کیے جانے کا باعث ہے وہ ان کے معاون افعال میں ان کے ضائر کے لاشقات کے مطابق تبدیلی کا واقعہ ہونا اور ان میں مادوں اور ضائر کا ایک دوسری سے انفرادی طور پر ممیز ہونا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے ہم اردو، پنجابی اور تامل کا باہمی صرفی موازنہ پیش کرتے ہیں:

فعل حال کی گردان

مصدر 'کردا' (تامل سے (تامل : آندو بمعنی ہونا فعل معاون)

تامل ضائر کی لاحق صورت	تامل ضائر	تامل	پہنچائی	اردو
ان	تان	شے یندران	اوہ کردا ہے	وہ کرتا ہے
انا	تام	شے یندرانا	اوہ کر دے بن	وہ کرتے ہیں
(ل : علامت تانیث)	—	شے یندرال	اوہ کردی ہے	وہ کرتی ہے
اے	فی	شے یندرے	توں کردا ہیں	تو کرتا ہے
دیر	زیر	شے یندرایر	تسہیں کردے ہو	تم کرتے ہو
این	نان ، یان	شے یندرین	میں کردا ہاں	میں کرتا ہوں
ایم	یام	شے یندرام	اساں کردے ہاں	ہم کرتے ہیں

اس کے مقابلے میں ترکی زبان کی مثال لیجیے - اس میں مادہ کے ساتھ لاحقات کی مدد سے مطلوبہ معنی حاصل کر لیے جاتے ہیں جیسے کہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہے :

’ات‘ بمعنی گھوڑا

اتم : میرا گھوڑا (’م‘ واحد متکلم کی اضافی حالت کی علامت)

ات لرم : میرے گھوڑے (’لر‘ علامت جمع)

اسماء کے علاوہ افعال کی بھی یہی حالت ہے جیسا کہ ترکی ’یازمق‘ بمعنی لکھنا کی ذیل کی صورتوں سے واضح ہے - یاد رہے کہ ترکی میں ’مق‘ محض مصوری لاحقہ ہے :

یازدی : اس نے لکھا

یازدی دیدی : اس نے لکھا تھا (’دیدی‘ ماضی بعید کی علامت ہے)

یازدی لر دیدی : انہوں نے لکھا تھا (’لر‘ علامت جمع)

یازمدی لر دیدی : انہوں نے نہیں لکھا تھا (’م‘ علامت نفی)

(بحوالہ : اردو زبان کا ارتقاء)

تصریفی زبانوں میں جنہیں لسانی ارتقاء کی ترقی یافتہ کڑی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کفایت لسانی (وہ عمل جس کے تحت زبان پر گراں گزرنے والے الفاظ کو حذف کر دیا جاتا ہے جیسے کہ شادباش سے ’د‘ حذف کر کے شادباش رہ گیا) اور سہل لسانی (وہ عمل جس کے تحت تلفظ کی آسانی کے لیے دو لفظوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا جاتا ہے جیسے کہ تن درست سے تندرست) کے اثرات کے تحت مختلف معانی حاصل کرنے کے لیے مادے کے ساتھ لاحقات کو اس طرح چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ ان میں باہمی امتیاز مشکل ہو جاتا ہے اور اکثر لاحقات کی انفرادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے یعنی اپنے طور پر علیحدہ وہ کسی معنی کے حامل نہیں ہوتے اور نہ وہ علیحدہ آزادانہ طور پر مستعمل ہو سکتے ہیں - مثال کے طور پر فارسی دیدم : میں نے دیکھا اور دیدی : تو نے دیکھا میں مادہ ’دید‘ کے ساتھ استعمال ہونے والے لاحقات ’م‘ اور ’ی‘ انفرادی طور پر مستعمل نہیں ہو سکتے گو افعال کے ساتھ ملحق ہو جانے سے معنی اختیار کر لیتے ہیں - تصریفی زبانوں میں بھی دو مختلف قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں - آریائی گروہ میں زیادہ تر مادہ کے ساتھ لاحقات کی مدد سے معنی حاصل کیے جاتے ہیں جیسے کہ سنسکرت، اوستائی اور یونانی میں فعل حال کی گردان کی مثال سے واضح ہے :

فعل حال کی گردان

مصدر دینا سے (اوستائی : دادن ، یونانی : ڈینو ، سنسکرت : دا)

سنسکرت ضاثر کی لاحقی حالت	سنسکرت ضاثر	سنسکرت	اوستائی	یونانی	اردو
تی	سا	دادتی	دادائتی	ڈیدائٹی	وہ دیتا ہے
تی ، اتی	تے	دادتی	دادتی	ڈیدائٹی	وہ دیتے ہیں
سی	توام	دادسی	دادھی	ڈیداس	تو دیتا ہے
تا	یویام	داتا	داستا	ڈیدوٹے	تہم دیتے ہو
می	ابام	دادمی	دادمی	ڈیدامی	میں دیتا ہوں
مس	واپام	دادمس	دادے مسہی	ڈیدامس	ہم دیتے ہیں

اردو زبان کی قدیم تاریخ

اگر آپ سنسکرت اور تامل ضاثر کی لاحقی صورتوں کا موازنہ کریں تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ دراوڑی لاحقات حقیقی ضاثر سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں جہاں کہہ آریائی لاحقات اکثر صورتوں میں اپنی ضاثر سے بالکل لگاؤ نہیں کھاتے۔ سامی زبانوں میں مختلف ضاثر کو لاحقات کی بجائے زیادہ تر حرکات کی تبدیلی سے ظاہر کیا جاتا ہے جیسے کہ عبرانی میں مصدر لمد (ل م د) بمعنی کرنا کی ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے :

عبرانی ضائر کی لاحقی صورت	عبرانی ضائر	عبرانی	اردو
اید	بو (وہ)	لمید	اس نے کیا (مذکر)
آو	بیم (وہ : جمع مذکر) بیں (وہ : جمع مؤنث)	لمدو	انہوں نے کیا
ت	اتا (تو : مذکر)	لمدات	تو نے کیا (مذکر)
تیم	اتیم (تم : مذکر)	لمد تیم	تم نے کیا (مذکر)
ت	ات (تو : مؤنث)	لمدت	تو نے کیا (مؤنث)
تین	(اتین تم : مؤنث)	لمدتین	تم نے کیا (مؤنث)
تی	اتی (میں)	لمداتی	میں نے کیا
نو	اناز نو (ہم)	لمدانو	ہم نے کیا

عربی میں بھی یہی صورت موجود ہے جیسے کہ مصدر کتب بمعنی لکھنا سے :

کتب	:	لکھنا
کتب	:	اس نے لکھا
کتیب	:	لکھا گیا
کاتب	:	لکھنے والا
کتاب	:	لکھا ہوا
کتب	:	کتاب کی جمع

امریکہ کے قدیم باشندوں کی زبانوں میں بھی تصریفی رجحانات کی مثالیں ملتی ہیں جیسے کہ ایڈٹیک قبیلہ کی 'تو بتل بل' (Tubatulabal) نامی زبان کی مثال سے ظاہر ہے :

تیک : کھانا - تیکت : وہ کھا رہا ہے - تیکی نات : وہ کھلوا رہا ہے - تیکی وے دیت : وہ کھا رہے ہیں - تیکی وے دینات : وہ کھلوا رہے ہیں -

اسی زبان کے بعض جملوں کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں :

ای شی وا گنات : وہ اس کی خاطر اس کے بالوں میں کنگھی کر رہا ہے -

وی ناگے م : اسے تحفہ دینے کے لیے آیا -

ہند آریائی زبانوں کا پس منظر

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ہند آریائی قبائل کا حقیقی وطن کونسا تھا۔ آیا یہ برصغیر سے اٹھ کر شمال مغربی دروں کی راہ سے ایران ہوتے ہوئے یورپ میں پھیل گئے یا پھر قطب شمالی سے نقل مکانی کر کے برصغیر تک پہنچے۔ ان کی نسلی خصوصیات کا ذکر بھی ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ آیا یہ نیلی آنکھوں، سفید چمڑی اور سنہرے بالوں والی نسل تھی یا بھوری آنکھوں، گندمی رنگ اور سیاہ بالوں کے حامل تھے یا پھر یہ مختلف نسلوں کا مجموعہ تھے۔ ہمارے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ یہ قبائل شروع میں کسی ایک علاقے میں رہائش پذیر تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے۔ ممکن ہے کہ ان میں بولیوں کا معمولی اختلاف موجود ہو۔ تاریخ کے کسی مخصوص دور میں یہ قبائل جہد للبقاء کی خاطر اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے اور غول در غول یورپ اور ایشیا کی پہنائیوں پر چھا گئے۔

جہاں بھی ہند آریائی قبائل پہنچے ان سے قبل وہاں مختلف نسلوں، زبانوں، مذہبوں اور رسم و رواج کے حامل قبائل آباد تھے۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جب دو قومیں آپس میں ملتی ہیں چاہے یہ ملاپ جنگ کی بدولت ہو یا بھائی چارے کی صورت میں تو وہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے تہذیب و تمدن، رسم و رواج، رہن سہن، مذہبی عقائد

اور لسانی پہلو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ یہی واقعہ آریائی قبائل کے ساتھ پیش آیا۔ ان کے ورود سے قبل یونان میں میسنائی اور سنوئی تہذیبوں کا دور دورہ تھا۔ ایران میں سمیری اور سامی اقوام کا بول بالا تھا اور وادی سندھ میں دراوڑی اور منڈاگروہ سے تعلق رکھنے والے قبائل آباد تھے۔ اس طرح یہاں جن نئی تہذیبوں نے جنم لیا وہ آریائی اور مقامی عناصر کی آمیزش کا نتیجہ تھیں۔ آریائی منازل طے کرتے وقت ان تہذیبوں کا چہرہ مہرہ ایک دوسرے سے اس حد تک بدل گیا کہ بظاہر ان میں کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی۔ بعینہ یہی صورت حال ان کی زبانوں کے ساتھ پیش آئی۔ سکندر یونان سے اٹھا اور ایران کو پامال کرتا ہوا وادی سندھ تک آ پہنچا۔ اس کے ہمراہ اور ہم عصر مؤرخوں نے باقی دنیا بھر کے حقائق قلمبند کیے لیکن اس نسلی اور لسانی اشتراک کی طرف کسی نے اشارہ تک نہیں کیا۔ یہ بالکل حال ہی کی بات ہے کہ قریباً چار ہزار سال کی بیگانگی کے بعد آریائی زبانوں کی حامل اقوام نے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اب یہ ایک قبیلے کی مختلف بولیاں نہیں ہیں بلکہ مقامی عناصر نے ان کو منفرد زبانوں میں تبدیل کر دیا ہے جن کے لب و لہجے، سرمایہ الفاظ اور صرف و نحو میں کئی ایک بنیادی اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ گو موجودہ صورت میں انہیں آریائی خصوصیات کی حامل زبانیں تو ضرور قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے کوئی زبان بھی سو فیصد خالص آریائی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ جہاں اکثر رشتوں، جسمانی اعضاء اور ہندسوں کے ناموں میں گہرا اشتراک پایا جاتا ہے وہاں تہذیب و تمدن اور بعض جغرافیائی خصوصیات سے متعلقہ ناموں میں بعد المشرقین کا تفاوت موجود ہے۔ ہم یہاں آریائی گروہ کی چار بڑی شاخوں یعنی سنسکرت، فارسی، یونانی اور لاطینی سرمایہ الفاظ کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہیں :

مشترکہ سرمایہ الفاظ

اردو	سنسکرت	فارسی	یونانی	لاطینی
ماں	ماتر ، ماتا	مادر	میٹر	مائر
باپ	پتر ، پتا	پدر	پائر	پیٹر
بھائی	بھراتر	برادر	پھرائٹر	فرائر
بہٹی	دوہتر	دختر	تہغتر	—
آنکھ	اکشی	—	اشے	او کولس
ابرو	بھرو	ابرو	اپھوس	—
دانت	دانت	دندان	ادنتوس	ڈینٹ
پاؤں	پد	پاء	پاؤس	پیس
چمڑا	چرم	چرم	درما	—
چ	شش	شش	پیکس	سیکس
سات	سپت	ہفت	ہیپٹ	سیپٹم
آٹھ	اشٹ	ہشت	اکٹو	او کٹو

ظاہر ہے کہ یہ لغوی اشتراک ان زبانوں کے ہم اصل ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ لیکن ان زبانوں کے سرمایہ الفاظ کے بعض پہلوؤں میں وسیع اختلافات کا موجود ہونا ان غیر آریائی مقامی عناصر کی نشان دہی کرتا ہے جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے :

مختلف الاصل سرمایہ الفاظ

اردو	سنسکرت	فارسی	یونانی	لاطینی
پڑھنا	پاٹھ	خواندن	سپوڈاسو	لیگرے ، لیشیو
لکھنا	لکھ	نوشتن	گرافیس	سکرائبرے
کتاب	پستک	نامہ	بائبلوس	لائبرو
سمندر	ساگر، سمدر	دریا	تھالاس	مارے
پہاڑ	پربت	کوه	اوروس	مونس

سنسکرت اور آریائی زبانیں

عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ سنسکرت ایک شدہ زبان ہے اور غیر آریائی عناصر سے یکسر مبرا و منزہ ہے۔ اکثر ماہرین اسے قدیم ہند آریائی گروہ کی ایک مثالی زبان تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں امور حقائق کے سراسر منافی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اس قسم کے نظریات محض یک طرفہ مطالعے اور ذہنی تعصبات کی پیداوار ہیں۔ موجودہ دور کے غیر جانبدارانہ مطالعے نے یہ امر ثابت کر دیا ہے کہ سنسکرت نے بڑی شدت کے ساتھ مقامی اثرات قبول کیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لسانی تقسیم کے لحاظ سے سنسکرت آریائی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا قواعدی ڈھانچہ بڑی حد تک آریائی گروہ کی مشترکہ خصوصیات کا حامل ہے اور اس کا بیشتر سرمایہ الفاظ بھی آریائی الاصل ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جو بات لاطینی، یونانی، فارسی، سنسکرت اور اس گروہ کی دوسری زبانوں کو ایک دوسری سے ممیز کرتی ہے وہ ان میں مقامی

اور دیگر غیر آریائی عناصر کی موجودگی ہے۔ ورنہ ان چاروں زبانوں میں ذرہ بھر بھی فرق نہ ہونا چاہیے تھا۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب آریائی قبائل وادی سندھ میں وارد ہوئے تو وہ ایک خانہ بدوشانہ طرز زندگی کے حامل تھے اور گہ بانی ان کا سب سے اہم پیشہ تھا۔ اس کے برعکس سپت سندھو میں نہایت ہی ترقی یافتہ شہری تہذیب و تمدن کا دور دورہ تھا۔ اس خانہ بدوشانہ اور شہری تہذیب کے باہمی ٹکراؤ کے اثرات سے نہ تو یہاں کی مقامی زبانیں ہی محفوظ رہیں اور نہ آنے والے قبائل کی۔ آریائی قبائل نے اس نئی سرزمین میں آباد ہونے کے بعد مقامی مذہبی عقائد اور رسوم کو اپنا لیا جن میں گاؤ، پھل اور لنگ کی پوجا کے علاوہ نہانا بھی مذہبی فرائض میں شامل قرار دے دیا گیا۔ آریاؤں کے مشہور دیوتا اندر، ورن اور شو وغیرہ بھی یہیں کی قدیم غیر آریائی دیومالا کا حصہ ہیں۔ شہری تہذیب، مقامی مصنوعات اور پیداوار سے متعلقہ تمام تر ذخیرہ الفاظ بھی مقامی عناصر کا مرہون منت ہے۔ آج یہ غیر آریائی الاصل الفاظ بھی اسی طرح سنسکرت کا ایک جزو ہیں جیسا کہ اس کا آریائی الاصل حصہ۔

ہمیں یہاں اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ گو آریائی قبائل قریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل از مسیح وادی سندھ میں وارد ہوئے لیکن یہاں تحریر کا آغاز کوئی تیسری صدی ق م کے لگ بھگ ہوا جب کہ غالباً تجارت پیشہ حضرات نے فنیقی رسم الخط سے متاثر ہو کر براہمی حروف ایجاد کیے یا انہیں درآمد کیا۔ یہاں جتنا بھی دستاویزی مواد ملتا ہے وہ اس کے بعد کے زمانے ہی کا ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آریاؤں کی آمد کے وقت کی زبان کا کوئی صحیح نمونہ ہمارے سامنے موجود نہیں۔ اس بارہ سو سال کے طویل عرصے میں آریاؤں کی زبان کا مقامی اثرات سے متاثر ہونا ایک فطری امر ہے جس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔

سنسکرت کا صوتی نظام

جیسے کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ کسی بھی زبان کے لسانی رشتوں یا اس پر بیرونی اثرات کا اندازہ لگانے کے لیے اس کا تین پہلوؤں سے جائزہ لینا ضروری ہے : اول صوتی ہیئت ، دوم صرف و نحو اور سوم مرمایدہ الفاظ - سب سے پہلے ہم سنسکرت کے صوتی پہلو کا جائزہ لیتے ہیں -

جہاں تک سنسکرت کی صوتی ہیئت کا تعلق ہے اگر اس کا آریائی کنبے کی مشہور زبانوں فارسی ، یونانی اور لاطینی کی صوتیات سے موازنہ کیا جائے تو ایک مبتدی بھی آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ ان کے درمیان واضح فرق موجود ہے - فارسی میں حروف صحیحہ کی تعداد اکتیس ہے لیکن ان میں صوتی لحاظ سے ہم مخرج حروف بھی شامل ہیں جیسے کہ ت ، ط ، ذ ، ز ، ظ اور ث س ص وغیرہ - ان میں سے بیشتر حروف عربی سے مستعار ہیں - اگر عربی سے مستعار شدہ حروف یعنی ، ث ، ح ، خ ، ذ ، ص ، ض ، ط ، ظ ، ع ، غ اور ق کو خارج کر دیا جائے تو باقی صرف بیس حروف رہ جاتے ہیں جو کہ آریائی صوتیات کی نمائندگی کرتے ہیں - اسی طرح یونانی میں حروف صحیحہ کی تعداد انیس اور لاطینی میں سترہ ہے - ان کے مقابلے میں سنسکرت میں ان حروف کی تعداد تینتیس (۳۳) ہے اور ان میں کوئی دو حروف ہم آواز نہیں ہیں - ظاہر ہے کہ یہ فالتو حروف جو کہ زائد صوتی اکائیوں کی ترجیحی کرتے ہیں بنیادی طور پر آریائی صوتیات کا حصہ نہیں ہو سکتے - خاص کر سنسکرت کے علاوہ دیگر تمام آریائی زبانیں حلقی ، تالوئی اور لٹوی غنائیہ (سندھی : چ ، گ ، ٹ) ، مدہم ہائیں (گھ ، چھ ، دھ ، بھ) اور بعض سخت ہائیں (چھ ، ٹھ ، ڈھ) آوازوں سے یکسر عاری ہیں جب کہ سنسکرت کی صوتیات میں ان آوازوں کو ایک اہم مقام حاصل ہے -

خود سنسکرت اور اس کی نزدیک ترین اور ہم عصر آریائی شاخ اوستائی میں گہرا صوتی تفاوت موجود ہے - اکثر ہائیں ، لٹوی اور غنائی آوازیں مثلاً ٹ ، ٹھ ، ڈھ ، بھ ، پھ ، چھ ، جھ اور گ (تالوئی غنائیہ)

اوستائی میں موجود نہیں۔ اسی طرح سنسکرت میں مروجہ کئی ایک مصوتوں کو ظاہر کرنے والی صوتی اکائیوں کے مترادفات سے بھی اوستائی عاری ہے۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ سنسکرت کی یہ آوازیں غیر آریائی ہیں اور لامحالہ مقامی زبانوں یعنی دراوڑی اور منڈا گروہ سے مستعار شدہ ہیں۔ ان میں سے لٹوی اور غنائی آوازیں دراوڑی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور ہائیں آوازیں منڈا گروہ سے مخصوص ہیں۔

یہاں یہ امر بھی ملاحظہ خاطر رہے کہ اکثر آریائی اور دیگر زبانوں کا معاملہ اردو زبان سے مختلف ہے یعنی وہاں حروف صحیحہ کی تعداد بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ ان زبانوں کی بنیادی آوازیں مثلاً سنسکرت میں بھاگ (حصہ) اور بہار (وزن) میں مستعمل 'بھ' کی آواز کے لیے ایک منفرد حرف موجود ہے اور یہ ایک ہی صوتی اکائی شمار کی جاتی ہے کیونکہ اس میں 'ب' اور 'ہ' کی آواز ایک دوسری میں پوری طرح جذب ہیں اور ان کے درمیان کوئی سکتہ موجود نہیں۔ فارسی، یونانی اور لاطینی وغیرہ میں اس اور اس قبیل کی دوسری آوازوں کو قلمبند کرنا ممکن نہیں مثلاً فارسی میں ہم بہار اور بہزاد میں 'ب' اور 'ہ' کو علیحدہ علیحدہ صوتی اکائیوں میں لکھیں اور پڑھیں گے۔ یہی صورت اس قسم کی دوسری آوازوں کی بھی ہے جیسے کہ سنسکرت پھل (میوہ) اور پھین (جھاگ) کو اگر فارسی میں لکھیں تو یہ پھل اور پھین کی صورت میں 'پ' اور 'ہ' کی مختلف صوتی اکائیوں کی صورت میں پڑھا جائے گا۔

اردو کے حروف ابجد اور صوتی پہلو کے بارے میں المیہ یہ ہے کہ اس کا صوتی نظام تو براہمی حروف تہجی کے تحت آتا ہے لیکن اس کے لیے سامی رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ مطلوبہ آوازوں کے لیے عربی حروف تہجی میں ضروری اصلاح کر لی گئی ہے جیسے کہ ٹ، ڈ، ژ، گ اور ہائیں آوازیں جیسا کہ بھ، پھ، تھ، وغیرہ۔ ہائیں آوازوں کو اکثر علماء محض ان کے دو حروف سے تشکیل پانے کی بناء پر مرکب آوازیں قرار

دے دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی بنیادی طور پر انفرادی صوتی اکائیوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور براہمی الاصل تمام رسم الخطوں مثلاً ناگری، بنگالی اور گورمکھی وغیرہ میں ان آوازوں کے لیے صرف ایک ایک حرف مستعمل ہے۔

جہاں تک کہ سنسکرت کی صوتیات میں دراوڑی عنصر کی موجودگی کا تعلق ہے اس بارے میں جناب آنرک ٹائیلر، ڈاکٹر سپیگل، ڈاکٹر گنڈرٹ، جناب کڈویل، سر جارج گریمرسن اور دوسرے ماہرین لسانیات پوری طرح متفق ہیں۔ جارج گریمرسن نے اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ:

”یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اکثر حالات میں مقامی غیر آریائی زبانوں کے اثرات کے تحت آریائی الفاظ کا تلفظ تک بدل گیا۔“
(ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ)

سنسکرت کے لب و لہجے پر مقامی اثرات کے بارے میں میکڈانل کا قول ہے کہ:

”سنسکرت میں لب و لہجے کی تبدیلی پراکرتوں کے اثر و نفوذ کی مرہون منت ہے۔ اس امر کو باور کرنے کے لیے کافی وجوہات موجود ہیں کہ پراکرتوں کا یہ لب و لہجہ نہایت قدیم عہد سے تعلق رکھتا ہے اور یہ سن عیسوی کی ابتداء سے کئی صدیاں پیشتر ان میں موجود تھا۔“
(سنسکرت ادب کی تاریخ)

سنسکرت صرف و نحو

صرف و نحو کے پہلو میں بھی سنسکرت پر مقامی اثرات کی شہادتیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر میکڈانل رقمطراز ہیں کہ:

”کلاسیکی سنسکرت صوتی ہیئت کے لحاظ سے بعینہ ویدوں کی قدیم زبان سے مشابہت رکھتی ہے۔ لیکن صرف و نحو کے لحاظ سے یہ اس سے مختلف ہے۔ خاص کر سنسکرت میں صرف و نحو کی کئی ایسی صورتیں یکسر غائب ہیں جو کہ

ویدوں کی زبان میں موجود تھیں۔ علاوہ ازیں اس کے لغوی پہلو میں بھی کئی ایک نمایاں تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔“
(سنسکرت ادب کی تاریخ)

مشہور روسی مستشرق ہرمین اولڈنبرگ (Herman Oldenberg) نے اپنی تصنیف ’قدیم ہند، اس کی زبان اور مذہب‘ میں ویدوں کی زبان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”ان کی عبارت جس ہیئت میں ہم تک پہنچی ہے اسے قدیم مصوروں کے ایسے شاہکاروں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جنہیں مختلف ادوار میں بعض ماہر اور بعض نااہل لوگوں نے متواتر ترمیم و تنسیخ کا نشانہ بنا کر اصل کو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا ہو۔ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بھجنوں کو نئے سرے سے تشکیل دیتے وقت بعض متروک اور بعید از فہم قدیم الفاظ کو خارج کر کے ان کی جگہ رائج الوقت اور قابل فہم الفاظ داخل کر دیے گئے۔ قواعد دانوں کے ستم بھی کچھ کم نہ تھے کہ جنہوں نے ویدوں کے بھجنوں کی قدیم اور طبعی ہیئت کو اپنے مروجہ اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔“

جرمن پروفیسر تھوڈور بینفے (Theodor Benfey) اپنی تصنیف ’سنسکرت زبان کی مکمل صرف و نحو‘ میں رقمطراز ہیں کہ :

”سنسکرت ایک نہایت قدیم اور وسیع زبان ہے۔ اس کے ادبی دور میں نہ صرف وہ مختلف بولیاں اس کے شانہ بشانہ موجود تھیں جو کہ اسی سے جنم لے کر پروان چڑھی تھیں بلکہ وہ مقامی مقبول عام زبانیں بھی اس کے پہلو بہ پہلو مروج تھیں جو کہ اس سے بالکل مختلف الاصل تھیں۔ نتیجہً پراکرتوں میں مروجہ کئی ایک (صرفی و نحوی) ترکیبیں سنسکرت میں سرایت کر گئیں۔ علاوہ ازیں کئی ایسے الفاظ بھی سنسکرت میں شامل ہو گئے جو کہ بنیادی طور پر غیر زبانوں سے تعلق رکھتے تھے۔“

(دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر، کاڈویل)

سنسکرت کا سرمایہ الفاظ

ظاہر ہے کہ جب سنسکرت کا صوتی نظام اور صرفی و نحوی ڈھانچہ، مقامی اثرات سے دامن نہ بچا سکا تو روزمرہ کی زبان یعنی لغوی سرمایہ اس سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ دراوڑی زبانوں میں سنسکرت اور سنسکرت میں دراوڑی عنصر کی موجودگی کوئی غیر فطری امر نہیں۔ جب دو لسانی گروہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کا آپس میں لین دین لازمی و لابدی ہے۔ آج تک اکثر مذہبی، نسلی یا ذہنی تعصبات کے زیر اثر سنسکرت کو ایک شدہ زبان قرار دیا جاتا رہا لیکن یہ کسی طرح بھی حقائق کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ سنسکرت کے لغوی پہلو پر مقامی اثرات کے بارے میں محققین کے درمیان کوئی اختلاف رائے موجود نہیں۔ جرمنی کے ایک ماہر لسانیات ڈاکٹر سپیگل کا بیان ہے کہ:

”سنسکرت کے وہ الفاظ جو کہ لٹوی اور بعض دنتی اصوات

سے تعلق رکھتے ہیں دراوڑی زبانوں سے مستعار ہیں۔“
(آریاؤں کی اصل، ٹائلر)

ڈاکٹر میکڈانل بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

”مقامی زبانوں کی شروعات نہایت قدیم عہد سے تعلق رکھتی

ہیں۔ یہاں تک کہ جب ویدوں کے بھجن تخلیق ہو رہے تھے

تو عوام میں ایک ایسی مقبول زبان رائج تھی جو کہ

صوتی لحاظ سے ویدوں کی ادبی زبان سے بالکل مختلف تھی

کیونکہ خود ویدوں کی زبان میں کئی ایسے الفاظ ملتے

ہیں جو کہ مختلف صوتی ہیئت کے حامل ہیں۔ ان کے بارے

میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ بھجنوں کے خالقوں نے یہ

الفاظ مقبول عام مقامی زبان سے مستعار لیے۔“

ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی بھی اسی رائے سے متفق ہیں۔

انہوں نے اپنی تصنیف ’ہندی اور ہند آریائی زبانیں‘ میں سنسکرت کے

اولین دور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”پہلا دور ۱,۵۰۰ ق م تا ۴۰۰ ق م ہے۔ اسی دور

میں چاروں وید لکھے گئے اور سنسکرت روزمرہ میں مقامی

الفاظ داخل ہو گئے - یہی وجہ ہے کہ خود ویدوں میں پھل ، نیلا ، بل ، ول (بمعنی خوبصورت ، اچھا) ، شام اور پوجنا وغیرہ الفاظ ملتے ہیں - لطف کی بات یہ ہے کہ اس قبیل کے تمام الفاظ تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ دراوڑی گروہ کی زبانوں میں بھی ملتے ہیں۔“

سرجارج گریسن نے مقامی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”آریائی قبائل جو کہ شمال مغرب کی سمت سے برصغیر میں داخل ہوئے ان کے ورود کے ابتدائی دور ہی سے ان کا واسطہ دراوڑی اقوام سے پڑا - نوواردوں نے ان کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم کیے اور ان کے اکثر دیوی دیوتاؤں اور رسم و رواج کو اپنا لیا - زبان کے معاملے میں انہوں نے مقامی سرمایہ الفاظ کا کچھ حصہ اپنا لیا - خاص کر لٹوی حروف کے حامل الفاظ جو کہ بنیادی طور پر آریائی زبانوں میں موجود نہیں آریائی قبائل کے برصغیر میں داخل ہونے کے بعد ان کی زبان میں شامل ہوئے - ایسے الفاظ دراوڑی اور منڈاگروہ کی زبانوں میں عمومیت کے ساتھ موجود ہیں - یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ غیر آریائی زبانوں کے اثرات کے تحت خود آریائی الاصل الفاظ کا تلفظ بھی بدل گیا۔“ (ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ)

بشپ کاڈویل (Rev Robert Caldwell) اپنی تصنیف ’دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر‘ میں رقمطراز ہیں کہ :

”کافی عرصے سے میں اس امر کا قائل ہو چکا ہوں کہ کتنے ہی دراوڑی الاصل الفاظ سنسکرت کے لغوی سرمائے میں داخل ہو چکے ہیں - اغلب ہے کہ الفاظ کا اس سے بھی زیادہ حصہ کئی دوسری مقامی زبانوں (منڈا وغیرہ) سے سنسکرت میں شامل ہوا ہو - اگرچہ سنسکرت میں دراوڑی الاصل الفاظ کی ایک بڑی تعداد موجود ہے لیکن جب کوئی ایسا لفظ سامنے آتا ہے جو کہ دراوڑی اور سنسکرت میں مشترک

طور پر موجود ہو تو بلا سوچے سمجھے یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ یہ سنسکرت اصل سے تعلق رکھتا ہے۔“

جناب کاڈویل نے مذکورہ کتاب میں سنسکرت پر دراوڑی اثرات کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے۔ جناب کٹل (Rev. F. Kittel) نے اپنے ایک مضمون 'سنسکرت لغات میں دراوڑی عنصر' میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ :

”اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں کہ دراوڑی الاصل الفاظ کی ایک بڑی تعداد سنسکرت زبان میں داخل ہو چکی ہے لیکن مقامی علماء اکثر اس کے خلاف یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کئی مثالوں سے اپنے مطمع نظر کی وضاحت کی ہے۔“

ماہر لسانیات ڈاکٹر گنڈرٹ (Gundert) نے اپنے ایک محققانہ مضمون 'سنسکرت میں دراوڑی عنصر' میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”سنسکرت میں دراوڑی الفاظ کا کثرت سے پایا جانا خلاف توقع نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ گو آریائی قبائل برصغیر کے گوشے گوشے تک پہنچ گئے اور صدہا سال تک مقامی اقوام کے دوش بدوش آباد رہے مگر انہوں نے یہاں سے کوئی اثرات قبول نہ کیے۔ اسی طرح دراوڑی زبانوں میں آریائی عنصر کا پایا جانا بھی ایک فطری امر ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“

صاحب مضمون اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :

”دراوڑی الفاظ سنسکرت میں کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں اور لب ولہجے کے لحاظ سے بھی وہ اس حد تک بدل چکے ہیں کہ ان میں امتیاز مشکل ہے۔ برہمن اپنی زبان کی تقدیس کا بھرم قائم رکھنے کے لیے اکثر انہیں کسی نہ کسی آریائی اصل سے مشتق قرار دے دیتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں کر پاتے تو پھر خود انہیں ہی سنسکرت کے سرمایہ الفاظ کا حصہ

ٹھہرا دیتے ہیں۔ برصغیر میں شاید ہی کوئی ایسا ماہر لسانیات ہوگا جو کہ سنسکرت میں دراوڑی عنصر کی موجودگی کو تسلیم کرتا ہو۔ ہاں ایسے ماہرین لسانیات کی کمی نہیں جو شد و مد کے ساتھ تمام تر دراوڑی سرمایہ الفاظ کو سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل بتاتے ہیں۔ اگر جذبات سے بالاتر ہو کر دیکھا جائے تو معاملے کی تہ تک پہنچنا مشکل نہیں۔ جب دو مختلف لسانی حلقوں سے تعلق رکھنے والی قومیں مدتوں تک ایک دوسرے کے ساتھ گہرا میل جول رکھتی ہیں چاہے یہ میل جول جنگ و جدل کی صورت میں ہو یا کاروباری شکل میں فطری طور پر وہ ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ لازماً یہی کچھ آریائی نوواردوں اور مقامی آبادی کے مابین باہمی تعلقات کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوا ہوگا۔“

(جرنل آف دی جرمن اورٹینٹل سوسائٹی)

۱۸۶۹ء بحوالہ کاڈویل)

تعجب ہے کہ آج سے ایک صدی پیشتر ڈاکٹر گنڈرٹ نے جس رائے کا اظہار کیا تھا وہ آج بھی ہمارے ماہرین لسانیات پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ آج بھی ہم انہی غلط قسم کے میلانات و رجحانات کا شکار ہیں جو کہ آج سے ایک صدی پیشتر کے متعصب برہمنوں کا حصہ تھا۔

سنسکرت لغات کے اشتقاقی پہلو

دنیا کی کوئی زبان بھی خالص پن کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہر ایک زبان نے اپنے ارتقاء کے دوران اپنے گرد و پیش کی زبانوں سے اکتساب کیا ہے۔ اس سے نہ سنسکرت مبرا ہے اور نہ کوئی دوسری زبان۔ اگر سنسکرت کے سرمایہ الفاظ کا تجزیہ کیا جائے تو اشتقاق کے لحاظ سے یہ چار مختلف عناصر کی حامل نظر آتی ہے۔

اول : خالصتاً آریائی عنصر جیسا کہ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہے :

مستشرق	لاطینی	یونانی	فارسی	سنسکرت	اردو
روسی : دووا - لیتھوانی : دو	دوؤ	دوا	دو	دوؤ	دو
روسی : تریس - گاتھی : تریس	تریس	تریس	سہ	تریس	تین
روسی : ستو	سٹم	پیکٹان	صد (اوستائی : سٹم)	شٹم	سو
روسی : مائے - سلووانی : مائے	مائیر	میٹر	مادر (اوستائی : مٹر)	ماتر	ماں
—	ریج	ریجن	—	راجن	راجہ
روسی : گاتھی : موس	موس	موس	موش	موشا	چوہا
آئس لینڈی : رادر - جرمن : راتھ	—	ادانتھروس	—	ردرا	سرخ
سو یڈی : راد	—	—	—	—	—
آئس لینڈی : بیرا	فیرے	پھیرا	بار	بھار	آٹھانا
روسی : دویر - آئس لینڈی : ڈیر	—	دورا	در	دوار	دروازہ

دوم : وہ عنصر جو کہ نئے ماحول میں پہنچ کر نئی ضروریات کے پیش نظر انہوں نے خود وضع کیا جیسے کہ :

مرگ بستنو

بمعنی ہاتھوں والا جانور یعنی ہاتھی - یاد رہے کہ آریائی قبائل نے اپنی نقل مکانی کے دوران برصغیر میں داخل ہونے سے پہلے ہاتھی کبھی نہ دیکھا تھا - جب انہوں نے وادی سندھ میں اس بھاری بھر کم جانور کو اپنی سونڈ سے ہاتھ کی طرح کام لیتے ہوئے دیکھا تو اسے ہاتھوں والا جانور کا نام دے دیا -

ترنی

بمعنی پار لگانے والا ، عبور کرنے والا نیز تیز رو یعنی پانی کا جہاز - اپنی نقل مکانی کے دوران آریاؤں نے ندی نالوں اور دریاؤں کو عبور کرنے کے لیے چھوٹی کشتیاں تو عام دیکھی اور استعمال کی تھیں جس کا ثبوت مختلف آریائی زبانوں میں اس کے لیے ہم مخرج الفاظ کی موجودگی ہے جیسے کہ سنسکرت :- ناؤ : کشتی ، فارسی : ناؤ ، یونانی : ناؤس اور لاطینی : نوٹس وغیرہ - چونکہ اس سے پہلے بڑے جہاز سے ان کا واسطہ نہیں پڑا تھا اس لیے برصغیر میں پہنچ کر انہوں نے بڑے دریائی یا سمندری جہاز کو دیکھا تو اسے 'عبور کرنے والا' کا نام دے دیا -

پست

بمعنی مٹی کا کام ، مٹی کی اشیاء بنانا ، قلمی تحریر اور کتاب وغیرہ - ایسا معلوم دیتا ہے کہ آریائی قبائل کے وادی سندھ میں ورود کے وقت یہاں بھی بابل اور نینوا کی طرح مٹی کی لوحوں پر لکھنے کا رواج موجود تھا لیکن غالباً ان لوحوں کو پکایا نہ جاتا تھا جس کی بناء پر وہ مٹی کی لوحیں زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکیں لیکن چکنی مٹی کی یہ لوحیں اپنے پیچھے پست یا پستک بمعنی کتاب کا لفظ اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ گئیں -

لکھ

لکیریں مارنا ، خراش ڈالنا ، کھرچنا ، گودنا ، تصویر بنانا ،

لکھنا وغیرہ۔ ان پڑھ نوواردوں نے جب مقامی لوگوں کو لکھتے دیکھا تو ان کے اس عمل کو ' لکھ ' یعنی لکیریں وغیرہ مارنا کا نام دے دیا۔

سوم : سرمایہ' الفاظ کا وہ عنصر جو کہ انہوں نے اپنی نقل مکانی کے دوران شرق اوسط اور دوسرے علاقوں سے اخذ کیا۔ یاد رہے کہ آریائی قبائل اپنے آبائی وطن سے نقل مکانی کر کے فوراً ہی اپنی اپنی منازل پر نہیں پہنچ گئے بلکہ ٹھہرتے ٹھہراتے، چلتے چلاتے ایک طویل عرصے میں نئی سرزمینوں تک پہنچے۔ مثال کے طور پر محققین کے نزدیک ہند آریائی قبائل جنہیں حطی کا نام دیا گیا ہے کوئی ۲۰۲۰۰ ق م میں ایشیاء کوچک میں نمودار ہوئے۔ ایران میں ان کے ورود کا دور ۲۰۰۰ تا ۱۶۰۰ ق م شمار کیا جاتا ہے۔ اس طرح ۱۵۰۰ ق م کے لگ بھگ یہ قبائل وادی' سندھ کی مغربی حدود میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دوسرے معنوں میں انہوں نے کوئی سات سو سال کا عرصہ شرق اوسط میں گزارا۔ اس دوران میں ہم عصر قوموں سے روابط کی بناء پر ان کے سرمایہ' الفاظ کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ یہ پہلو ابھی تک تشنہ' تحقیق ہے لیکن اس پہلو کی لسانی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں پر چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ مثالیں سمیری اور سنسکرت کے بعض الفاظ کے باہمی اشتراک پر مشتمل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جب آریائی قبائل شرق اوسط میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے تو اس وقت یہاں سمیری سیاسی غلبہ ختم ہو چکا تھا لیکن ان کی زبان ابھی تک زندہ تھی۔ اکادی قوم جو کہ سامی نسل سے تعلق رکھتی تھی باوجود اپنے سیاسی غلبے کے سمیری زبان سے مستفید ہو رہی تھی اس لیے آریائی قبائل نے یہاں اپنے قیام کے دوران اس زبان کے ذریعہ اظہار ہونے کی بناء پر اس سے کچھ عنصر کو اپنا لیا مثلاً :

آب بمعنی پانی

سمیری :- اب : پانی اور سمندر وغیرہ۔ اب زو : پاتال کا پانی

اکادی :- اپسو : گہرے پانیوں یا پاتال کے پانیوں کا دیوتا

سنسکرت :- اپ ، اپسو بمعنی پانی

اوستا : اپ - جدید فارسی : آب

ہشتو : اوبہ

بلوچی : اپ

نالہ بمعنی ندی کی چھوٹی شاخ یا بڑی نالی نیز نہر

سمیری ، کلدانی :- نار : نہر ، نالہ وغیرہ

سنسکرت :- نارا : پانی کا ذخیرہ یا بہتا ہوا پانی

عربی ، عبرانی :- نہر (کلدانی سے مشتق)

دھرتی بمعنی زمین

سمیری :- دیر : زمین

کلدانی :- دیراتی : زمین کی دیوی ، دھرتی ماتا

سنسکرت :- دھارا : زمین - دھراتری : زمین کی دیوی

عبرانی ، عربی :- دہر : دنیا

اس سلسلے میں اور بھی کئی ایک مثالیں موجود ہیں جیسے کہ :

سمیری :- نٹنار بمعنی چاند

سنسکرت :- چندر

سمیری :- آتو : سورج یا سورج دیوتا

سنسکرت :- آدتیہ : سورج یا سورج دیوتا

سمیری :- کار : پہاڑ

سنسکرت :- گیر : پہاڑ

اسی طرح ہندو دیومالا میں اندر ، اندرانی اور شکتی کے بھی وہی کردار ہیں جو کہ سمیری دیومالا میں انو ، انینی اور سکت (زمین اور جنگ کی دیوی) کے ہیں - لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے

جس کے بارے میں فی الحال مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ منسکرت میں شرق اوسط کے لسانی عنصر کی موجودگی نے بعض محققین کو عجیب و غریب خیال آرائیوں کا موقع دیا ہے۔

چہارم : سرمایہ الفاظ کا وہ حصہ ہے جو کہ آریائی قبائل نے وادی سندھ اور دوآبہ میں اپنی رہائش کے دوران مقامی زبانوں سے اخذ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس عنصر کو ابھی تک وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا کہ یہ مستحق ہے گو بعض اہل الرائے حضرات نے اس پہلو میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔ اگر غیر جانبدارانہ طور پر تحقیق کی جائے تو منسکرت کے لغوی سرمائے کا ایک بڑا حصہ مقامی زبانوں سے مشتق ثابت ہوگا۔

اس پہلو میں اگرچہ کافی کام ہو چکا ہے جس میں ذیل کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

(الف) ڈاکٹر کاڈویل : دراوڑی زبان کی تقابلی گرامر
(ب) ڈاکٹر جارج بیوپلر : منسکرت صوتیات میں لٹوی آوازوں کی اصل

(ج) ڈاکٹر گنڈرٹ : منسکرت میں دراوڑی عنصر

(د) پادری کٹل : منسکرت لغات میں دراوڑی عنصر

(ر) پروفیسر ٹی برو : منسکرت میں دخیل الفاظ

(س) پروفیسر ایم بی ایمینو : ہندوستانی لسانیات کا قبل از تاریخ کا عہد

اگر ان فاضل مصنفین کی طرف سے پیش کردہ مثالوں کو یکجا کر دیا جائے تو فرہنگ کی ایک اچھی خاصی کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اس بارے میں ابھی تک بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ ہم یہاں صرف الف کی تختی میں سے چند ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کریں گے :

سنسکرت معنی	معنی	تلگو	کناری	ملیالم	تامل
اکا : ماں	بڑی بہن ، بزرگ عورت	اکا	اکا	اکا	اکا
آنگن : صحن	بازار ، کھلی جگہ ، صحن	انگدی	انگڑی	انائی	انگائی
آنچل	آنچل ، کپڑے کا دامن	انچو	انچو	—	انشو
اٹالا : اتاری	چوبارہ ، بلند مکان	اٹاری	اٹا	اٹم	اٹم
اڈنا : ڈھال	بند کرنا ، روکنا ، چھپانا	اڈو	آڑ	اٹا	اٹائی
انال : آگ	آگ ، گرمی ، بخار	—	انالو	انال	انال
انیکا : فوج ، دستہ	فوج کی دستہ بندی	—	انی	انی	انی
آمنڈکا : ارنڈ کا پودا	ارنڈ کا پودا	آمنڈمو	امندا	امنکو	آمنٹکو
امبا : ماں ، دیوی	ماں ، دیوی	امبا	امبا	امان	امان
ارمانا : مقدار کا پیمانہ	مقدار کا پیمانہ	—	—	اوانم	امانم
لاکشا : لاکھ	لاکھ ، پیروزہ	—	—	اراکو	اراکو
الاجی : جلن	جلن ، حسد ، آگ	اڈانو	اڈاتو	اڈالشا	اڈاڑشی
آلسا : سستی ، تکان	تھکاوٹ ، سستی	الایو	السیکا	السال	آلشو
آواکا لکنا : آمیزش کرنا	آمیزش کرنا ، گھولنا	کلائیو	کالی	کلروکا	کلا
آلی : سہیلی	سہیلی	آلی	آلی	آلی	—

ظاہر ہے کہ اولین دور میں سنسکرت آریائی قبائل میں بول چال کا واحد ذریعہ تھی اور یہ ان تمام خصوصیات کی حامل تھی جو کہ ایک زندہ اور فعال زبان کا حصہ ہوتا ہے۔ اس میں غیر زبانوں کے الفاظ جذب کر کے اپنے سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیتیں بدرجہہ اتم موجود تھیں۔ ترک و انجذاب کا یہی عمل زبان کو ماحول کے پیہم بدلتے ہوئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بخشتا ہے۔ سنسکرت کی وسیع المشربی کی وضاحت کے لیے ہم یہاں پانی جیسی عام استعمال کی شے کے لیے مستعمل مختلف الاصل الفاظ کی مثال پیش کرتے ہیں :

سنسکرت الفاظ	مآخذ
نیرا	تامل ، ملیالم : نیر (دراوڑی)
امبو ، امبھسو	کورخ ، مالتو : ام (دراوڑی)
جلم	تامل ، ملیالم : ویلم (دراوڑی)
واری	تامل ، ملیالم : ماری (دراوڑی)
پانیہم ، پانی	باوری ، تریمو کی ، گھوری : پانی (منڈا)
	تامل ، پونائی ، ملیالم ، کناری : پونل (دراوڑی)
تویا	منڈاری : دا (منڈا) - تامل ، کناری : توئے بمعنی گیلا
اپو ، اپسو	سمیری ، کلدانی : اب ، ابزو
اودک ، آدان	روسی : ووڈکا ، ووڈا (آریائی)

ہند آریائی زبانوں میں پانی کے لیے مندرجہ ذیل مترادفات ملتے ہیں :

یونانی : اوتھر - حطی : وتر - لاطینی : آند ، ہائیڈرا -

اس ایک ہی مثال سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سنسکرت کہاں تک غیر آریائی عناصر سے مبرا ہے۔

پراکرتیں اور سنسکرت

جب آریائی قبائل وادی سندھ میں وارد ہوئے تو یہاں نہایت ہی ترقی یافتہ شہری تہذیب و تمدن کا دور دورہ تھا۔ جیسا کہ مختلف شہادتوں مثلاً علم الکاسیات، لسانیات اور قدیم ہندو ادب سے ثابت ہوتا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے قبل یہاں مختلف اقوام آباد تھیں۔ اسی بناء پر وادی سندھ (آریائی نام سپت سندھو) کو ویدوں میں پنچ جنیا کرشٹی یعنی پنچ قوموں کی سرزمین کا نام دیا گیا ہے۔ اتھرو وید کے ایک منتر 'حسد کا علاج' میں مرقوم ہے کہ:

”تمہیں سندھودیش میں بسنے والی کئی ایک قوموں سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے حاصل کر کے یہاں لایا گیا۔“

لازمًا یہ مختلف قومیں مختلف زبانوں کی حامل ہوں گی۔ خاص کر یہ بات تو بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آبادی کا غالب حصہ دراوڑی اور منڈاگروہوں پر مشتمل ہوگا۔ آریاؤں کی آمد سے یہاں کے لسانی ارتقاء میں ایک نیا موڑ آیا۔ جہاں ایک طرف نو واردوں کی زبان پر مقامی اثرات کے نتیجے میں سنسکرت نے جنم لیا وہاں دوسری طرف مقامی زبانوں کو نئے اثرات نے ایک نیا رنگ عطا کیا اور یہی زبانیں آگے چل کر پراکرتیں کہلائیں۔ یہ دونوں زبانیں ایک دوسری کے دوش بدوش مروج رہیں لیکن ان میں ایک طبقاتی تفاوت ضرور پیدا ہو گیا۔ سنسکرت کو برہمنی طبقے اور حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور عام طور پر مذہبی اشاعت اور علم و ادب کی تخلیق کا ذریعہ تھی۔ اس کے برعکس پراکرتیں عوام الناس کی زبانوں کا درجہ رکھتی تھیں اور لازماً عوامی ادب کی حامل بھی ہوں گی لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے نمونے دستیاب نہیں ہو سکے یا تو اسے قلمبند کرنا ضروری نہ سمجھا گیا یا پھر یہ گردشِ دوراں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکا۔

جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں کہ خود سنسکرت بھی خالص آریائی زبان کی ترجمانی کا حق پوری طرح ادا نہیں کرتی کیونکہ اس کی

تشکیل اور ارتقاء میں مقامی عناصر نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ پھر ہم محض اس سے متاثر ہونے والی مقامی زبانوں یعنی پراکرتوں کو ہند آریائی گروہ کی شاخیں قرار دینے میں کہاں تک حق بجانب ہیں؟ خود آریاؤں نے اپنے کلاسیکی ادب میں پراکرتوں کو اسربہاشا یعنی غیر آریائی باشندوں کی زبان اور یہاں کے باشندوں کو مردھرا واک بمعنی غیر زبان کے حامل قرار دیا ہے۔ آج بھی مقامی زبانوں کے آریائی الاصل ہونے کی دلیلیں محض ان کے منسکرت کے ساتھ لغوی اشتراک کی بناء پر قائم کر دی گئی ہیں وگرنہ صوتی پہاؤ اور صرف و نحو کے لحاظ سے پراکرتوں اور ہند آریائی گروہ کی زبانوں میں کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی۔

پراکرتوں کا صوتی تجزیہ

برصغیر کے شمالی حصے کی پراکرتوں کا صوتی تجزیہ کرنے سے یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ زبانیں دراوڑی اور منڈا گروہ کے اتصال سے وجود میں آئی ہیں۔ غنائی اور لٹوی آوازیں دراوڑی گروہ کی زبانوں کی خصوصیات میں سے ہیں۔ یہ اصوات نہ تو آریائی گروہ کی بنیادی صوتیات میں موجود ہیں اور نہ منڈا گروہ میں۔ اس کے برعکس ہائے، آوازیں منڈا گروہ کی خصوصیات میں سے ہیں اور دراوڑی زبانوں میں ان کا سراغ کم ہی ملتا ہے اگرچہ بعض دراوڑی شاخوں مثلاً کورکھ اور براہوئی میں 'کھ' کی آواز موجود ہے جو کہ براہوئی میں عربی زبان کے زیر اثر 'خ' کی صورت میں پکاری جاتی ہے۔

ماسوائے بعض مستثنیات کے آریائی زبانیں عام طور پر ہائے، لٹوی اور غنائی آوازوں سے عاری ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ پراکرتوں اور برصغیر کی موجودہ زبانوں میں اس عنصر کی موجودگی کو کسی طرح بھی آریائی گروہ سے مشتق قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس پہلو میں خود نووارد آریاؤں نے شدت سے مقامی اثرات کو قبول کیا ہے جس کے نتیجے میں یہاں کی آریائی زبان میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس مقامی زبانوں کے صوتی ڈھانچے میں آریائی اثرات کا شمع بھر بھی نظر نہیں آتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دراوڑی اور منڈا گروہ کی زبانوں میں مجموعی طور پر وہ تمام اصوات

پہلے ہی سے موجود تھیں جو نووارد اپنے ساتھ لائے۔ اس لیے نووارد تو ضرور نئے رنگ میں رنگے گئے لیکن یہاں کی صوتی دھنک کے لیے کوئی نیا رنگ پیش نہ کر سکے۔

جہاں تک لب و لہجے کا تعلق ہے اس پہلو میں بھی مقامی زبانیں آریائی اثرات سے کافی حد تک محفوظ رہی ہیں۔ آٹھویں صدی قبل از مسیح کے لگ بھگ تالیف شدہ 'پنج ویمانشا برہمن گرنتھ' میں وادی سندھ کے باشندوں کے بارے میں مذکور ہے کہ 'یہ لوگ آسان زبان (یعنی سنسکرت) کے آچارن (تلفظ) کو نہایت کٹھن سمجھتے ہیں۔' مقصد یہ کہ مقامی باشندے آریائی لب و لہجے کو اپنانا پسند نہیں کرتے تھے۔ یاد رہے کہ اس گرنتھ کے بھجن اس وقت تخلیق پذیر ہوئے جب کہ آریائی قبائل گنگا جمنا دوآب کی طرف نقل مکانی کرتے وقت سرسوتی اور درشدواتی (ستلج اور جمنا کے درمیان واقع دو قدیم ندیاں) کی وادیوں میں سے گزر رہے تھے کیونکہ ان میں جا بجا ان ندیوں کا ذکر آتا ہے۔ اس گرنتھ میں یہاں کے باشندوں کو وراٹ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ نہ تو آریائی مذہبی رسوم کے پابند تھے اور نہ ویدوں کی تقدیس کے قائل لیکن پھر بھی آریاؤں نے ان کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔

صرف و نحو کا ڈھانچہ

صرف و نحو کا معاملہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جہاں سنسکرت اور آریائی گروہ کی دیگر زبانیں ہیئت کے لحاظ سے تصریفی زمرے سے تعلق رکھتی ہیں وہاں اردو اور برصغیر کے شمالی حصے کی دیگر زبانیں دراوڑی گروہ کی طرح غیر تصریفی حلقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی تفاوت کے پیش نظر اٹھارویں صدی کے مشہور مستشرق جناب ہنری تھا مس کولبروک (جو کہ ۱۷۸۲ء میں برصغیر میں وارد ہوئے) سے لے کر موجودہ دور کے ماہرین لسانیات تک اکثر محققین اس امر پر متفق ہیں کہ صرف و نحو کے لحاظ سے سنسکرت اور اردو مع دیگر مقامی زبانوں کے دو مختلف حلقوں سے تعلق رکھتی ہیں اور اس پہلو میں ان کے درمیان کوئی واضح رشتہ موجود نہیں۔ مسٹر ماؤنٹ سٹیورٹ الفسٹن نے اپنی تصنیف 'تاریخ ہند' (مطبوعہ

۱۸۵۷ء) میں مسٹر کولبروک کے حوالے سے اردو زبان کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ :

”دہلی میں اسلامی حکومت کے قیام کے دوران مختلف قوموں کے درمیان باہمی میل جول اور روز مرہ کی گفت و شنید کی بدولت ایک ایسی زبان وجود میں آئی کہ جس کی لغوی بنیادیں سنسکرت پر استوار کی گئی تھیں لیکن صرف و نحو کے لحاظ سے وہ موجودہ ہندوستانی زبانوں سے مشابہ تھی۔“

مقصد یہ کہ اردو اور دیگر مقامی زبانیں صرف و نحو کے لحاظ سے سنسکرت سے مختلف تھیں۔

مسٹر گریرسن اپنی شہرہ آفاق تصنیف ’ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ‘ (مطبوعہ ۱۹۰۳ تا ۱۹۲۸ء) میں رقمطراز ہیں کہ :

”صدہا سال سے قدیم سنسکرت ہندوستانی (یعنی اردو) کے سرمایہ الفاظ پر شدت سے اثر انداز ہوتی رہی ہے لیکن یہ اس کا صرف لغوی پہلو ہی ہے جس پر یہ اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس کی صرف و نحو میں سنسکرت اثرات کا شمعہ بھی نظر نہیں آتا۔ مروجہ ہندوستانی میں سنسکرت صرف و نحو کی کوئی بھی ترکیب سامنے نہیں آتی۔“ (جلد نہم، حصہ اول)

انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے بھارت کے مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر رام بلاس شرما نے اپنی تصنیف ’بھاشا اور سماج‘ (مطبوعہ ۱۹۶۴ء) میں بار بار اس نظریے کی تردید کی ہے کہ برصغیر کے شمالی حصے کی زبانیں کسی آریائی زبان سے مشتق ہیں۔ اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ایک مضمون ’ہندی زبان کا ارتقا‘ میں ارشاد فرمایا ہے کہ :

”عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ سنسکرت نے بگڑ کر پراکرت کا روپ دھار لیا اور اس نے آگے چل کر اپ بھرنشوں کو جنم دیا جن سے کہ موجودہ زبانیں وجود میں آئیں۔ ہندی زبان کی صرفی و نحوی خصوصیات کا نہ تو اپ بھرنشوں میں نشان ملتا ہے اور نہ پراکرتوں میں۔ میرے اپنے خیال میں برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں کی بنیادیں ان زبانوں

پر استوار ہوئی ہیں جو کہ ازمنہ قدیم میں سنسکرت کے پہلو
بہ پہلو عوام میں مروج تھیں۔“

(اسٹیٹسمن ، دہلی ، ۳۰ اگست ۱۹۶۴ء)

واضح رہے کہ ڈاکٹر شرما عوام میں بولی جانے والی اردو
اور ہندی کو ایک ہی زبان کے دو مختلف نام تصور کرتے ہیں جن
میں کہ صرف رسم الخط کا فرق ہے۔

سرمایہ الفاظ

مختلف زبانوں کے درمیان باہمی رشتے کی بنیادیں محض سرمایہ الفاظ
کے اشتراک پر قائم نہیں کی جا سکتیں تاوقتیکہ تقابلی صرف و نحو اور
صوتی پہلو سے بھی اس کی تائید نہ ہوتی ہو۔ سرمایہ الفاظ کا اشتراک
تو محض ایک تیر کا نشان ہے جو کسی نئے راستے کی نشان دہی کرتا
ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو اور سنسکرت میں کافی حد تک
لغوی اشتراک موجود ہے لیکن اس سے یہ یک طرفہ فیصلہ دے دینا کسی
طرح جائز نہیں کہ یہ تمام سرمایہ الفاظ سنسکرت ہی نے اردو کو
دیا ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے یعنی خود
سنسکرت نے یہ الفاظ اردو ہی کی پیشرو زبانوں سے اخذ کیے ہوں۔

میکڈائل نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'سنسکرت ادب کی تاریخ' میں
مشہور گرامر دان پانینی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ :
'سنسکرت کے مشہور گرامر دان پانینی (چوتھی صدی قبل از
مسیح) نے اپنی گرامر میں جن قدیم رسالوں کا ذکر کیا ہے
ان میں سے ایک کا نام 'دھاتو پاٹھ' بمعنی روزمرہ بول چال
کے مصادر بیان کیا ہے۔ اس میں دو ہزار مصادر درج تھے
جن میں سے صرف آٹھ سو مصادر ایسے تھے جو کہ سنسکرت
کے سرمایہ الفاظ میں موجود تھے اور ویدک عہد کے پچاس
مصادر اس میں شامل نہ تھے۔“

اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ آج سے قریباً اڑھائی ہزار سال
قبل بھی عوامی بول چال میں غیر آریائی عنصر غالب تھا۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اپنے ایک مضمون 'اردو
میں دخیل الفاظ' میں رقمطراز ہیں کہ :

”شمال ہی نے جنوب کو سب کچھ نہیں دیا جنوب نے بھی شمال کو بہت کچھ عطا کیا ہے۔ دراوڑی تہذیب و تمدن بہت قدیم ہے۔ آریا جب ہندوستان میں آئے تو ان کے مقابلے میں نیم وحشی تھے۔ انہوں نے بہت کچھ دراوڑوں سے سیکھا۔ یہاں تک کہ ان کے بعض دیوتا بھی آریائی دیو مالا میں آگھسے اور بہت ممتاز درجہ حاصل کر لیا۔ یہی حال الفاظ کا ہے جس کی چند مثالیں یہاں لکھی جاتی ہیں۔ آئندہ تحقیق سے اور بہت سے الفاظ کے سراغ لگنے کا امکان ہے۔ کیونکہ بہت سے لفظ جن کی اصل نا معلوم ہے یا جو خواہ مخواہ سنسکرت خیال کیے جاتے ہیں بہت ممکن ہے کہ وہ دراوڑی زبان سے تعلق رکھتے ہوں۔“ (سہ ماہی اردو، جولائی ۱۹۴۹ء)

مسٹر گریرسن نے برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”عام طور پر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ مقامی زبانوں کے تمام تر سرمایہ الفاظ کی اصل سنسکرت میں تلاش کی جائے۔ بہت سے علماء کا یہ خیال ہے کہ مقامی زبانیں غیر آریائی عناصر سے یکسر پاک ہیں۔ اس حقیقت کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ کسی لفظ کا سنسکرت بلکہ خود ویدوں کی زبان میں پایا جانا اس امر کا کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے کہ یہ لفظ قدیم آریاؤں کی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی لفظ کے آریائی الاصل ثابت کرنے کے لیے سنسکرت کے علاوہ دیگر ہند یورپی گروہ کی زبانوں میں بھی اس کا سراغ لگانا ضروری ہے۔“

اس پہلو میں مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے آگے چل کر لکھا ہے کہ :

”اس امر کے امکانات غالب ہیں کہ مقامی زبانوں اور سنسکرت میں مشترک طور پر پائے جانے والے الفاظ کا کافی حصہ دراوڑی اور دیگر قدیم مقامی زبانوں سے مشتق ہو۔“

برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں کے کسی لفظ کا سراغ لگانے کے لیے کہ آیا یہ ہند آریائی گروہ سے مأخوذ ہے یا دراوڑی اور منڈا گروہ سے تو اس بارے میں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے لسانی سرمائے میں بعض الفاظ تو ایسے ہیں کہ وہ سنسکرت میں تو موجود نہیں لیکن دراوڑی زبانوں میں ملتے ہیں یا پھر اس کے برعکس سنسکرت میں موجود ہیں دراوڑی یا منڈا زبانوں میں نہیں۔ ایسے الفاظ کے مقام کا تعین کرنے کے لیے ہمیں کوئی دقت لاحق نہیں ہوتی لیکن بعض الفاظ ایسے بھی ملیں گے جو کہ علاوہ مقامی زبانوں کے سنسکرت اور دراوڑی زبانوں میں بھی یکساں طور پر موجود ہیں۔ ایسے الفاظ کی اصل کا تعین کرنے میں ہمیشہ غلطی کا احتمال ہے کیونکہ جیسے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے دونوں زبانوں نے ایک دوسری کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ اس قبیل کے الفاظ کے بارے میں تحقیق کرتے وقت ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اگر کسی لفظ کی اصل ہمیں سنسکرت کے علاوہ ہند آریائی گروہ کی دوسری زبانوں مثلاً فارسی، یونانی اور لاطینی وغیرہ میں بھی مل جاتی ہے تو اسے بغیر کسی رد و کد کے آریائی الاصل تسلیم کر لیں گے۔ اس کے برعکس اگر ایسا نہ ہو اور اس کی اصل دراوڑی زبانوں میں عمومیت کے ساتھ مروج ہو تو اسے دراوڑی الاصل تسلیم کر لیں گے اگرچہ موجودہ صورت میں ان الفاظ کی ہیئت میں بعض اوقات نمایاں تبدیلی واقع ہو چکی ہوگی۔

آریائی، دراوڑی اور برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں کے لغوی پہلو کے تقابلی جائزے کے نتیجے میں مقامی زبانوں کے سرمایہ الفاظ کو ذیل کے چار مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) خالص آریائی الاصل الفاظ

(ب) خالص دراوڑی الاصل الفاظ

(ج) مشترک آریائی الاصل الفاظ
(د) مشترک دراوڑی الاصل الفاظ

(وہ الفاظ جو کہ مقامی زبانوں کے علاوہ سنسکرت اور دراوڑی گروہ کی زبانوں میں مشترک طور پر مستعمل ہیں)

خالص آریائی الاصل الفاظ

اردو	پنجابی	ہند آریائی
پاؤں	پیر	سنسکرت :- پد - اوستائی : پازہ - لاطینی : پٹیس
ناک	نک ، ناس	سنسکرت :- ناسا - لاطینی : ناسوس - روسی : ناس
آنکھ	اکھ	سنسکرت :- اکشی - لاطینی : اکولس - یونانی : اوشے - روسی : اوکو
دانت	دند	سنسکرت :- دنت - فارسی : دندان - لاطینی : دنت
دو	دو	سنسکرت :- دوؤ - فارسی : دو - لاطینی : دوؤ
تین	تن ، ترے	سنسکرت :- تراہ - اوستائی : شری - لاطینی : تریسن - روسی : ترے

خالص دراوڑی الاصل الفاظ

اردو	پنجابی	دراوڑی
ایڑی	اڈی	تامل :- اٹی : پاؤں ، پاؤں کا نشان ، بنیاد ملیالم :- اٹی : پاؤں کا تلوا کناری ، کوڈاگو ، تولو :- اڈی : پاؤں تلگو :- اڈوگو : پاؤں کوٹا :- اڑی : پاؤں
ہنڈیا	ہانڈی	کناری ، تولو :- انڈی : کھوکھلے بانس کا بنا ہوا برتن کوٹا :- انڈی : دودھ دوہنے کا برتن ٹوڈا :- اڈی : مٹی کا برتن

اردو	پنجابی	دراوڑی
یار	یار	مایالم :- اری وو : محبت ، خواہش کناری :- اروگو : محبت کرنا
جہالر	چہالر	تامل :- شالی : آویزہ ، لٹکن ، کوئی بھی لٹکتی ہوئی چیز کناری :- جہالی : جہالر تولو :- جلی : ماتھے پر لٹکتا ہوا پھولوں کا سہرا ، کوئی بھی لٹکتی ہوئی شے
جھلک	چھلک	کناری :- شلا : چمک ، جگمگاہٹ شلشلا نا : جگمگانا ، جھلملانا تولو :- جلیکو : چمک ، جگمگاہٹ
آوہ (بھٹہ)	آوا	کناری :- آوی تلگو :- آوامو تولو :- آوے کمہار کی برتن پکانے کی بھٹی
اپہارا	آپھرنا ، پیٹ کا پھول جانا ، آپھنا ، باسی ، گوندھے ہوئے آئے کا پھول جانا	تامل :- آپو کناری :- آبو تلگو :- آبو کو کوٹا :- آب تولو :- آبار پھول جانا (پیٹ یا روٹی وغیرہ کا)
بٹنا	بٹنا	تامل :- اوٹو : کسی کے لیے ایک طرف ہو کر جگہ دے دینا

در اوڑی	پنجابی	اردو
<p>ملیالم:۔ اوڈ کو: ایک طرف ہو جانا، پیچھے ہٹ جانا کناری، تلگو:۔ اوٹو: جگہ دے دینا، ایک طرف ہو جانا</p> <p>پہننا { تامل:۔ آٹو ملیالم:۔ آٹوکا کناری:۔ آدو گڈابا:۔ اوڈ</p> <p>ٹوڈا:۔ آدپ: لباس</p> <p>کناری:۔ آکو: پتہ، چاول کی پنیری، گندم کی کونپل</p> <p>تلگو، کوئی:۔ آکو گڈابا:۔ آکی کونڈا:۔ آک</p> <p>تامل:۔ اولی: چھپنا۔ اولیو: چھپنے کی جگہ ملیالم:۔ اولی: پوشیدگی، چھپنے کی جگہ اولیگا: چھپنا کناری:۔ آلی: چھپنا تلگو:۔ اولوو: بھید، پوشیدگی کوٹا:۔ اوٹیل: چھپنا تولو:۔ اولو: پوشیدہ</p> <p>تامل:۔ شائی: برتن، مقدار کا ایک ماپ ملیالم:۔ چائی: برتن</p>	<p>—</p> <p>آگ</p> <p>(گنے کی اوپر والا حصہ)</p> <p>اوبلا</p> <p>(پوشیدگی، چھپنے کی جگہ، پوشیدہ جگہ)</p> <p>چائی (گھڑا)</p>	<p>اوڑھنا، اوڑھنی (دوپٹہ)</p> <p>آک</p> <p>(گنے کی کونپل)</p> <p>—</p> <p>—</p>

اردو	پنجابی	دراوڑی
—	باہلا	تامل :- پالا : زیادہ ، کٹی ایک - پالار : کٹی آدمی
—	بہت ، کٹی ، زیادہ وغیرہ)	{ ملیالم :- پالا کناری :- پالا تلگو :- پالو
—	بہت (بے وقوف آدمی ، مست ، کاہل قسم کا آدمی)	تامل :- چپائی : فضول قسم کا آدمی ، رذیل ، کمزور کناری :- جبٹل : غیر مستقل مزاج ، ڈھیلا ڈھالا ، مست تلگو :- جبٹو : ناقص العقل ، مست ، بہدا تولو :- جبو : ایضاً
کھاٹ	کھٹ کھٹری کھٹولہ	تامل ، ملیالم :- کٹل : چارپائی ، پلنگ تلگو :- کٹلی : ڈولی ، پلنگڑی پارچی :- کٹیا کوٹی :- کاٹ

مشترک آریائی الاصل الفاظ

اردو	پنجابی	دراوڑی	آریائی
آگ	اگ	تامل ، ملیالم :- اگی تلگو ، کناری ، تولو :- اگی	سنسکرت :- اگنی - لاطینی :- اگنس - روسی :- اوگنے
کھمبا	کھمبا	تامل ، ملیالم :- کمبو : ستون	سنسکرت :- مکھمیا : ستون -

اردو	پنجابی	دراوڑی	آریائی
		کناری: کمبا - تلگو: کمبامو	لاطینی: گمبا: ستون ، ٹانگ
سوئی	سوئی	تامل، ملیالم، کناری، تلگو: شوشی بمعنی سوئی	سنسکرت: سوشی: سوئی میو: مینا لاطینی: سوئرے روسی: شیتے گاتھی: سیوجن
دیوتا	دیوتا	تامل: تے وو، تے ووم ملیالم: تے ووم کناری، تلگو، تولو: - دیوا	سنسکرت: دیوا یونانی: تھیوس قدیم آئرلینڈی: ڈئیس
میٹھا، میٹھائی	میٹھا، میٹھائی، میٹھی (میٹھی روٹی)	تامل: متو ملیالم: مدھورم کناری: مدھو	سنسکرت: مدھو: میٹھا، شہد یونانی: میتھو - جرمن: میتھ - روسی: میڈ
راجہ	راجہ	تامل، ملیالم: ارشن کناری، تلگو: ارسو بادشاہ، حاکم	سنسکرت: راجن یونانی: ریجن لاطینی: ریج

مشترک دراوڑی الاصل الفاظ

دراوڑی	سنسکرت	پنجابی	اردو
تامل :- شامی : آقا، مالک، خدا - ملیالم ، کناری ، تلگو :- سوامی ، سامی : خدا - کولامی :- شویم : خدا تامل :- شری کائی : چاقو ، چھوٹی تلوار شری : خنجر ، چاقو کناری :- سری گی : چاقو ، خنجر - تلگو :- شری : چاقو کناری :- سیج : آرام گاہ ، بستر - تلگو :- سیج : بستر ، پلنگ - تامل :- سیکائی : بستر ، پلنگ تامل ، ملیالم :- تلا : ترازو تولام :- ترازو ، چھت کا شہتیر کناری :- تلا : ترازو ، وزن ، شہتیر - تلگو :- دولامو : شہتیر	سوامن چھریکا شایہ : بستر تلا (ترازو ، وزن ، چھت پر ڈالنے کا شہتیر) نمبا	سوامی چھری سیج تولنا تول تولا تولا نیم	سوامی چھری سیج تولنا تول تولا (وزن کرنے والا) ، تلا (ترازو) نیم (درخت کا نام)
تامل ، ملیالم :- نیمپام کناری :- نیمبا تلگو :- نیمبامو			

اردو	پنجابی	سنسکرت	دراوڑی
ناڑی	ناڑ (رگ) ، نبض ، گندم کی بالی کا نچلا کھوکھلا حصہ) ، نڑی (نلکی) ، نڑا (نرسل) ، نلی (نلکی)	ناڑی (کوئی بھی کھوکھلی شے جیسے کہ رگ ، نلکی ، نرسل وغیرہ)	تامل :- نائی : نبض ، رگ۔ ناڑی : نلکی ، نرسل ، مقدار کا پہانہ۔ ملیالم :- ناڑی : کوئی بھی کھوکھلی شے جیسے کہ رگ ، نلکی ، نرسل وغیرہ نیز گھڑی یعنی وقت کا پہانہ
پٹ : کپڑا ، پٹی ، دوپٹہ	پٹ (ریشم کا دھاگہ) ، پٹی ، دوپٹہ	پٹ : کپڑا ، لباس ، پھول دار ریشمی کپڑا	(الف) تامل ، ملیالم ، کناری :- پٹو : ریشمی کپڑا یا دھاگہ ۔ تلگو :- پٹمو : ریشمی دھاگہ پٹ : ریشمی کپڑا (ب) تلگو :- پٹائے : رنگ دار پٹی کناری ، تلگو :- پٹی } کپڑے کی پٹی ملیالم :- پٹا
پڑھنا	پڑھنا ، پتل (گیت) ، پاٹھ (مذہبی کتابوں کی تلاوت) ،	پٹھ (پڑھنا ، دہرانا ، گانا وغیرہ)	تامل :- پڈی : پڑھنا۔ پڈم : سبق۔ پٹو : گانا ، گنگنانا ۔ ملیالم :- پٹو : گانا ، گیت ، نظم۔ کناری :- پاڈو : گانا۔ پاٹ : گانا ، گیت۔ تلگو :- پاٹھی : پڑھنا ۔

اردو	پنجابی	سنسکرت	دراوڑی
	پاٹھ شالہ (ہندوں کا مذہبی سکول)		پاڈو : گانا ، گیت کورخ :- پڑنا : گانا - مالتو :- پاڑے : گانا
گھوڑا ، کوئل (تیز رفتار گھوڑا)	گھوڑا ، کوئل	گھوڑا	تامل :- کٹی رائے - ملیالم :- کٹی را - کولامی :- کڈر - کناری :- کڈیرے - کولامی ، تلگو :- گورمہ - نائیکی :- گھوڑم - کونڈ : گوڑم

ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ آریائی قبائل کے وادی سندھ میں ورود کے وقت یہاں پر غیر آریائی اقوام کا دور دورہ تھا - برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں میں دراوڑی عنصر کی موجودگی اور بلوچستان میں برابھوئی قوم کا وجود اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ان غیر آریائی مقامی اقوام میں دراوڑی گروہ کو بالادستی حاصل تھی وگرنہ مقامی زبانوں میں دراوڑی عنصر کی موجودگی کے لیے اور کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا -

آریائی اور مقامی اقوام کا باہمی میل جول ان کی زبانوں کے لیے ایک نئے موڑ کا پیش خیمہ ثابت ہوا - شروع شروع میں قدرتی طور پر ان دونوں گروہوں کو ایک دوسرے سے مطلب براری کے لیے ایک دوسرے کی زبان سمجھنے اور سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی اور روزمرہ کی بات چیت کے دوران افہام و تفہیم کے لیے ایک دوسرے کی زبان کے الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے - اس طرح دونوں زبانوں نے ایک دوسرے کے سرمایہ الفاظ کو اپنانا شروع کر دیا اور دونوں زبانوں

کا سرمایہ' الفاظ جذب و سرایت کے نتیجے میں ایک نئی شکل اختیار کر گیا۔ لیکن انفرادی طور پر ان کے صرفی و نحوی ڈھانچے ماسوا معمولی تبدیلیوں کے اپنی اصلی ہیئت میں قائم رہے۔ اس کی ایک اچھی مثال ہاری زبانوں میں مغربی زبانوں کے الفاظ کا عمل دخل ہے۔ پہلے پہل پرتگیزی یہاں آئے پھر فرانسیسی اور آخر میں انگریز۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ پرتگیزی الفاظ تو مسلسل استعمال کی بدولت ہاری زبان میں کچھ اس طرح سے رس بس گئے ہیں کہ ان کے بارے میں دوئی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ہارے دیہاتوں تک میں کمرہ، چابی، گوبھی، بالٹی، فیتہ، نیلام، باسن، نٹنھا مٹنا، پرچ، پیپا، اچار، کانجی، بمبا (پنجابی: ریل گاڑی کا انجن)، مستری، پیسہ اور آنہ وغیرہ قسم کے کتنے ہی پرتگیزی الفاظ عام بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی الفاظ کا حال ہے۔ آج اپیل، کورٹ، جج، پولیس، ڈپٹی کمشنر، ٹکٹ، اسٹیشن، ہسپتال، ہوٹل اور اسکول وغیرہ صد ہا الفاظ ایسے ہیں کہ ان کے استعمال کے بغیر کوئی چارہ نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہاری زبانوں نے باوجود اڑھائی تین سو سال کی رفاقت کے صرف و نحو کے لحاظ سے مغربی زبانوں سے ذرہ بھر بھی اثر قبول نہیں کیا۔

یہی کچھ قدیم میں بھی ہوا۔ آریائی اور دراوڑی زبانوں کے باہمی میل جول کے نتیجے میں دو نئے لسانی گروہ وجود میں آ گئے جن کا سرمایہ' الفاظ ایک دوسرے سے شدت کے ساتھ متاثر ہو چکا تھا۔ لیکن گرامری پہلو سے وہ کافی حد تک اپنی بنیادوں پر قائم تھے۔ آریائی گروہ کی زبان کی اولین صورت کو ویدک اور بعد کی صورت کو سنسکرت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مقامی زبانوں کو شروع میں پراکرت اور بعد میں اپ بھرنش کا نام دیا گیا۔ ان کا باہمی رشتہ ماں، بیٹی، خالہ یا بھانجی کا نہیں تھا بلکہ دو ہم جولیوں کا تھا۔ سنسکرت کو چونکہ بالائی طبقے کی سرپرستی حاصل تھی نیز برہمنوں نے اسے تقدس کا درجہ دے دیا تھا اس لیے اس نے مذہبی، علمی اور ادبی زبان کا درجہ حاصل کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان کے مختلف ادوار کے نمونے مذہبی کتابوں، علمی کارناموں اور کلاسیکی ادب کی صورت میں میسر ہیں۔ اس کے برعکس پراکرتیں، عوامی زبان

کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اولین دور میں جب کہ سنسکرت کا طوطی بولتا تھا تو تعلیم یافتہ برہمنی طبقہ مقامی زبانوں کو قابل التفات تصور نہ کرتا تھا۔ اس بے رخی کا نتیجہ ہے کہ پراکرتوں کے اولین دور کے تحریری نمونے دستیاب نہیں ہیں۔

چوتھی صدی قبل از مسیح تک صورت حال بدل چکی تھی۔ اب سنسکرت محض بطور ایک مذہبی اور ادبی زبان کے زندہ رہ گئی تھی اور عوام اس سے بہت دور ہٹ چکے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا آریائی زبان عوامی زبانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں اپنی انفرادیت کھوتی جا رہی تھی۔ مشہور مفسر یا سک (قریباً ۹۰۰ ق م) نے پراکرتوں کو بھاشا یعنی روزمرہ بول چال کی زبان بیان کیا ہے۔ اس کے برعکس سنسکرت کو ویدک یعنی ویدوں کی زبان کے نام سے یاد کیا ہے۔ پاتنجلی (دوسری صدی قبل از مسیح) نے جہاں پراکرتوں کا ذکر کیا ہے اسے عوام میں مروجہ زبان کہا ہے۔

اشوک (تیسری صدی ق م) کے کتبے بھی اس عہد میں پراکرتوں کے عوامی زبان ہونے کی شہادت دیتے ہیں کیونکہ یہ کتبے عوام کی رہنمائی کے لیے عوام کی زبان یعنی پراکرت میں کندہ کیے گئے تھے۔ بدھ مت اور جین مت کی مذہبی کتابیں بھی پراکرات میں لکھی گئیں۔ بدھ مت کی وسیع اشاعت کی ایک بڑی وجہ بھی عوام الناس کی زبان کا استعمال تھا کیونکہ اس عہد میں ویدوں کی زبان عوام کے لیے بھول بھلیوں سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ اس کے برعکس پراکرت کی تحریریں بڑی آسانی سے ان کے دل و دماغ میں اتر جاتی تھیں۔

گپتا عہد (چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی) میں دم توڑتی ہوئی سنسکرت نے آخری سنبھالا لینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی یہ نشاۃ ثانیہ عوام میں اس کی مقبولیت کا باعث نہ بن سکی۔ سنسکرت کے شہرہ آفاق ڈراما نگار کالی داس نے اپنے ڈراموں میں بادشاہ اور درباریوں کو سنسکرت بولتے ہوئے ظاہر کیا ہے۔ اس کے برعکس عوام الناس اور محلات کی عورتوں کو پراکرت میں بات چیت کرتے دکھایا ہے۔ اسے اس عہد کے تہذیب و تمدن کی صحیح عکاسی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

باوجود برہمنی کاوشوں کے سنسکرت زیادہ دیر تک اپنی انفرادیت قائم نہ رکھ سکی۔ گپتا عہد کے خاتمے پر جب برصغیر میں طوائف الملوک کی پھیلی تو اس کے جلو میں کئی ایک چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں نے جنم لیا۔ ان رجواڑوں نے بھی حتی المقدور سنسکرت کو مصنوعی تنفس کے ذریعے زندہ رکھنے کی کوشش کی لیکن برصغیر میں اہل اسلام کی آمد سے یہ رجواڑے بھی ختم ہو گئے اور ان کے ساتھ ہی سنسکرت نے بھی دم توڑ دیا۔ اب پراکرتوں کے لیے میدان خالی تھا۔ عوام کے ذریعہ اظہار کے علاوہ اب انہیں مذہبی، علمی اور ادبی تخلیقات کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ علاقائی عناصر نے پراکرتوں کو مقامی رنگوں میں رنگ دیا اور یہ مختلف ارتقائی مدارج طے کر کے موجودہ پراکرتوں یعنی برصغیر کے شمالی حصے میں مروجہ زبانوں کے روپ میں ظاہر ہو گئیں۔

اب دو حقائق بالکل واضح صورت میں ہمارے سامنے آ موجود ہوتے ہیں: اول یہ کہ سنسکرت آریائی زبان کی شاخ ہوتے ہوئے بھی شیر آریائی عناصر سے مبرا نہیں۔ یعنی سنسکرت اس زبان کا نام ہے جو کہ نو وارد آریائی زبان پر مقامی زبانوں کے اثر و نفوذ کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ دوم برصغیر کے شمالی حصے کی موجودہ زبانیں اور ان کی پیشرو پراکرتیں برصغیر میں مروجہ قدیم زبانوں سے ماخوذ ہیں جن میں کہ دراوڑی گروہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ نو وارد آریاؤں کی زبان نے انہیں ایک نیا رنگ عطا کیا اور یہ مختلف تہذیبی لہروں کے اثرات کے تحت ادلتی بدلتی موجودہ صورت اختیار کر گئیں۔

اصل میں ہمارے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ شروع سے لے کر آج تک برصغیر کی لسانی تحقیقات کی تمام تر باگ ڈور ماہرین سنسکرت کے ہاتھ میں رہی۔ وہ اپنے یک طرفہ مطالعے میں اس حد تک مگن تھے کہ انہیں کسی دوسری طرف توجہ دینے کا احساس تک نہ ہوا۔ جب انہیں مقامی زبانوں اور سنسکرت کے درمیان بنیادی فرق نظر آیا تو اس تفاوت کے بارے میں تحقیقات کرتے وقت بچائے گرد و پیش نظر ڈالنے کے ایک فرضی قدیم ہند آریائی زبان کا وجود تراش لیا گیا جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ سنسکرت سے مختلف ہوتے

ہوئے بھی اس سے مشابہ تھی۔ لیکن اس فرضی زبان کے خد و خال اور خصوصیات کے بارے میں وضاحت کرنا ضروری نہ سمجھا۔ اس المیے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمارے موجودہ تمام کے تمام ماہرین لسانیات بھی اسی مکتب فکر کی پیداوار ہیں۔ اپنے مخصوص رجحانات کی بدولت مقامی زبانوں کے بارے میں تحقیقات کرتے وقت وہ بھی صرف سنسکرت ہی کو پیش نظر رکھتے ہیں اور برصغیر کی قدیم زبانوں مثلاً دراوڑی اور منڈا گروہوں کی مختلف شاخوں کو درخور اعتناء تصور نہیں کرتے۔ حالانکہ جیسا ابھی بیان کیا جا چکا ہے موجودہ زبانوں کی تشکیل میں انہوں نے نہایت اہم اور بنیادی کردار ادا کیا ہے سنسکرت کو اس پہلو میں صرف ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

اگر متقدمین نے مقامی زبانوں کے بارے میں تحقیقات کرتے وقت غلط نتائج اخذ کیے تو انہیں ایک حد تک معذور سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اس عہد میں ابھی تک ہڑپہ اور موئن جو دڑو کی بلند پایہ تہذیب کے آثار مٹی کے بلند و بالا ٹیلوں کی تہ میں محو خواب تھے اور معلومہ تاریخ کی روشنی میں آریاؤں سے قبل کے عہد کو تاریک دور کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ عام طور پر یہ باور کیا جاتا تھا کہ آریاؤں کی آمد سے قبل یہاں کوئی قابل ذکر آبادی موجود نہ تھی اور یہاں کے جنگلات میں ایسے وحشی قبائل آباد تھے جو کہ ارتقاء کی ابتدائی منازل میں تھے۔ اس قسم کے تصورات کی روشنی میں اگر انہوں نے مقامی زبانوں کی ابتداء کو سنسکرت کی بجائے کسی نامعلوم قدیم ہند آریائی زبان سے منسوب کر دیا تو یہ کوئی غیر فطری امر نہ تھا۔

لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ ہڑپائی تہذیب کی دریافت نے ہاری تاریخ میں ایک سنہرے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ اب آریاؤں سے پہلے کا زمانہ تاریک دور کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا بلکہ آج ہمیں اپنے اس قدیم تہذیب و تمدن پر بجا طور پر ناز ہے۔ کیا اب بھی ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس قدیم ہند آریائی زبان کے مفروضے کو ایک امر مسلمہ کا درجہ دیتے رہیں؟ کیا اب بھی آریائی زبان کی ہم عصر بلکہ پیشرو مقامی زبانوں سے اغماض برتنے کے لیے ہمارے پاس کوئی جواز موجود ہے؟

وادی سندھ اور ترکی و تاتاری زبانیں

وادی سندھ اور وسط ایشیا کے ایک دوسرے کے پڑوس میں واقع ہونے کی بناء پر دونوں خطوں میں از منہ قدیم ہی سے گہرے ثقافتی تعلقات موجود رہے ہیں۔ وسط ایشیا کی وسعتوں نے کتنی ہی تہذیبوں کو جنم دیا اور یکے بعد دیگرے کتنی ہی شوریدہ سر قومیں یہاں سے بگولے بن کر اٹھیں اور آندھی کی طرح ایشیا و یورپ کے طول و عرض پر چھا گئیں۔ معلومہ تاریخ سے پہلے جو ڈرامے اس سٹیج پر کھیلے جا چکے ہیں اس بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے ابھی مزید تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے۔ لیکن جب تاریک دور کے ڈراپ سین کے بعد پردہ اٹھتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ آریائی، ہن، کشن اور تاتاری اقوام یکے بعد دیگرے تہاں سے سیلاب کی صورت بہ نکلتی ہیں اور بڑی بڑی سلطنتوں کو خس و خاشاک کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ وادی سندھ جو کہ بالکل وسط ایشیا کی دہلیز پر واقع ہے بھلا ان زلزلوں سے کیسے محفوظ رہ سکتی تھی۔ وسط ایشیا سے جو بھی لہر اٹھی وہ ان پانچ دریاؤں کی سرزمین تک ضرور پہنچی۔ سمرقند و بخارا کی وادیوں سے گذریوں، جنگجوؤں، مہم بازوں، سیاحوں، تاجروں، مبلغوں اور درویشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ کوہ ہالیہ کے دروں سے گزر کر وادی سندھ کی زرخیز سر زمین میں وارد ہوتا رہا اور کچھ قیام کے بعد گنگا اور جمنہ کی طرف رخ کرتا رہا۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ وادی سندھ کے نو آبادکار وسط ایشیا کی سرزمین میں جا نکلے اور وہاں بدھ مذہب کے جھنڈے گاڑ دیے اور ان زمینوں کو گندھارا آرٹ سے روشناس کرایا۔ ان ثقافتی تعلقات کے نتیجے میں دونوں خطوں کے لسانی عناصر کا ایک دوسرے سے گہرے طور پر متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ آج ہم اسی لسانی عنصر کے باہمی اشتراک اور اس کے ثقافتی پس منظر کے ایک پہلو کا مختصر سا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

اگرچہ وسط ایشیا میں کئی ایک لسانی گروہ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو آباد ہیں لیکن ہم اپنی کاوشوں کو صرف یورال التائی گروہ کی زبانوں کے مطالعہ تک محدود رکھیں گے۔ فنلینڈی، اسٹونی، لاپ، ہنگری، اوسٹیاک، ترکی، تاتاری، ترکمانی، کرگیزی، منگولی اور کلموک وغیرہ اس گروہ کی بڑی بڑی شاخیں ہیں۔

وادی سندھ اور یورال التائی زبانوں کے باہمی تعلقات کو پانچ مختلف زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے :

اول : وہ مشترکہ سرمایہ الفاظ جو کہ قبل از تاریخ کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔

دوم : وہ سرمایہ الفاظ جو کہ عہد اسلامی سے قبل بعض ترک قبائل کی معیت میں وادی سندھ میں وارد ہوا۔

سوم : وہ سرمایہ الفاظ جو کہ پاکستانی نو آبادکاروں کی وساطت سے وسط ایشیا کی مختلف اقوام میں رواج پا گیا۔ اس پہلو میں کشن عہد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

چہارم : وہ سرمایہ الفاظ جو کہ اسلامی عہد میں نووارد ترکی نژاد قبائل کی بدولت پاکستانی زبانوں میں داخل ہوا۔

پنجم : وہ سرمایہ الفاظ جو کہ پاکستانی زبانوں اور ترکی نے یکساں طور پر غیر زبانوں خاص کر عربی اور فارسی سے مستعار لیا۔

وسط ایشیا اور وادی سندھ کے تعلقات کی قدامت

اگر ہم وادی سندھ اور ترکی و تاتاری قبائل کی آبائی سرزمین وسط ایشیا کے باہمی تعلقات کا اندازہ لگانا چاہیں تو اس کی شروعات تاریخ کے دھندلکے دور میں پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں لیکن پھر بھی آثاراتی مطالعہ، تاریخی شواہد اور تقابلی لسانی جائزے کی روشنی میں یہ امر ضرور پایہ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ آریاؤں کے ورود سے قبل ہڑپائی اور وسط ایشیا کی ہم عصر تہذیبوں کے درمیان گہرے ثقافتی مراسم موجود تھے۔

روسی ماہر آثار قدیمہ وی۔ ایم۔ میسن (V. M. Masson) اپنی تصنیف 'روسی وسط ایشیا کا آثاراتی مطالعہ' میں رقمطراز ہیں کہ :

”وسط ایشیا میں حالیہ کھدائیوں کے دوران جو حقائق سامنے آئے ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنوبی ترکمانیہ کی چار ہزار تا دو ہزار سال قبل از مسیح کی مستقل زرعی نظام کی حامل تہذیب کا اپنی ہم عصر ایرانی، افغانی اور پاک و ہند تہذیبوں سے گہرا رشتہ تھا۔“

برطانوی ماہر آثار قدیمہ سٹیورٹ پیگٹ (S. Piggott) نے بھی اپنی تصنیف 'قبل از تاریخ کا ہندوستان' میں اسی نظریے کی تائید کی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ :

”روسی ترکستان میں واقع 'انو' اول اور 'انو' دوم (چار ہزار تا اڑھائی ہزار سال قبل از مسیح) کے مقامات سے دستیاب شدہ سیاہ نقوش والے سرخ برتن، سرخ اور کالے نقوش والے پیلے برتن اور نمایاں طور پر نظر آنے والے زینہ نما نقوش کی ساخت والے پیلے برتن ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا حقیقی وطن بلوچستان ہے کیونکہ وہ یہاں کے آثارات سے برآمد ہونے والے مٹی کے برتنوں سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔“

مجھے مسٹر پیگٹ سے صرف اس حد تک اختلاف ہے کہ میری نظر میں اس تہذیب کا حقیقی وطن بلوچستان نہیں بلکہ وسط ایشیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو 'انو کی تہذیب' کو 'ہڑپائی تہذیب' پر زمانے کے لحاظ سے سبقت حاصل ہے۔ دوم یہ امر ایک مسلمہ حیثیت رکھتا ہے کہ 'ہڑپائی تہذیب' کی حامل قوم کا خمیر وادی سندھ سے نہیں اٹھا بلکہ وہ باہر سے وارد ہوئی اسی بناء پر کوٹ دیچی اور ہڑپائی تہذیب کے درمیان ایک واضح حد فاصل موجود ہے۔ ہڑپہ کی دراوڑی تہذیب اور التائی گروہ کی زبانوں کا تقابلی جائزہ بھی اس پہلو میں کافی حد تک بہاری رہنمائی کرتا ہے کہ اس تہذیب کا ابتدائی دور وسط ایشیا ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

ہاں ! آثاراتی مطالعہ سے یہ بات ضرور سامنے آتی ہے کہ ہڑپائی تہذیب کی حامل قوم نے اپنے آبائی وطن وسط ایشیا سے بدستور تجارتی تعلقات قائم رکھے۔ جناب پگٹ نے اپنی تحقیقات کی بناء پر لکھا ہے کہ :

”انو سوم (دو ہزار سال ق م) سے ہڑپائی ساخت کی دھات کی صنعت کے نمونے، مٹی کی ایک ایسی گاڑی جو چنو درو سے دستیاب ہونے والی ایک کھلونا گاڑی سے عین مطابقت رکھتی ہے اور ہڑپائی طرز کے شیشہ نما مسالے کے منکوں کی دستیابی اس امر کا ثبوت ہے کہ ان دونوں تہذیبوں کے درمیان آمد و رفت اور تجارتی تعلقات موجود تھے۔“

اس امر کے مزید ثبوت کے طور پر آگے چل کر مذکور ہے کہ :

”انو سوم کے آخری ایام کے آثارات سے بعض ایسے مدفن دستیاب ہوئے ہیں جو کہ گیارہ سو تا ایک ہزار سال قبل از مسیح سے تعلق رکھتے ہیں اور وادی سندھ کے آثارات مغل، گھنڈائی اور جیوانری کے مدفنون سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان آخری ایام تک بھی انو میں ہڑپائی تاجر موجود تھے۔“

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا لسانیاتی مطالعہ بھی اس پہلو میں ہماری کوئی رہنمائی کرتا ہے یا نہیں۔ یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں اس کا احاطہ کرنا ممکنات میں سے نہیں۔ اس کے لیے زیر غور جلد ’ہڑپائی تہذیب کے لسانی رشتے‘ میں تفصیلی بحث کرنے کا ارادہ ہے۔ فی الحال اپنے مطمع نظر کی وضاحت کے لیے محض چند ایک مثالوں ہی پر اکتفا کریں گے۔

یاد رہے کہ وسط ایشیا کی اکثر زبانوں کو یورال التائی گروہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ماہرین لسانیات اس بارے میں ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں لیکن پھر بھی اکثریت اسی نظریہ کی حامی ہے۔ یہ زبانیں سائبیریا کی برف پوش وادیوں سے لے کر مغربی پاکستان کی شمالی سرحدوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دراوڑی زبانوں کا اپنا گروہ

دراوڑی اور یورال الٹائی گروہ کی زبانوں کا تقابلی جائزہ

دیگر زبانیں	وادی سندھ کی موجودہ زبانیں	یورال الٹائی	دراوڑی
<p>سنسکرت :- اکا : ماں (دراوڑی سے مستعار) پراکرت :- اکا : ہن سہلی :- اکا : بڑی ہن</p>	<p>سارق قولی :- پاکھ سنگیچھی :- اکھوا منجانی :- یکھوا (دردی گروہ کی زبانیں)</p>	<p>تنگوسی :- اوکی ، اکن موردوی :- اے قدیم ترکی :- اگے عثمانی ترکی :- اکا : چھوٹی ہن تبتی :- اکھے : ہن منگولی :- اجن : بڑی ہن (ک اور ج کا تبادل عام ہے جیسے کہ فارسی زاج : زاک - پنجابی : چاچا - پشتو : کاکا)</p>	<p>بڑی ہن ، بزرگ عورت وغیرہ</p> <p>تامل :- اگا ، اکن ملیالم ، تلگو :- اگا کوٹا :- اکن کناری ، تولو :- اکا</p>
<p>سنسکرت :- تاتا : باپ</p>	<p>اردو ، پنجابی :- تائی : باپ کے بڑے بھائی کی بیوی</p>	<p>فنلینڈی :- آتی : ماں</p>	<p>تامل :- تائی : ماں تائیچی : دائی</p>

(یہ لفظ بعض آریائی زبانوں

میں بھی سر و ج ہے)

اتا : ماں، بڑی بہن، خالہ

اتی : بڑی بہن

سنگھالی :- اتا : نانا

دائی : زچہ کی دیکھ

بھال کرنے والی

تایا : باپ کا بڑا بھائی

دادا : باپ کا باپ

خوار، وخی، منجانی، باشگلی، تات : باپ

(دردی گروہ)

اردو :- انا : دودھ پلائی ،

بچوں کی دیکھ بھال کرنے

والی ملازمہ

وخی، خوار، سیغانی } نان : ماں

سارق قولی :- انا : ماں

اردو :- کھر : جانوروں کے پاؤں

پنجابی :- کھر : پاؤں

ترکی :- اتا
فنلینڈی :- آتا
ہنگری :- آتیا
موردوی :- اتائی

ماں {
ترکی :- انا
فنلینڈی ، ہنگری :- انیا
موردوی :- انائی
اوسٹریاک :- ائے

منگولی :- کول

میلیام ، کناری :- تائی : ماں

تامل :- اتن : باپ ، بزرگ

تلگو ، کناری :- تاتا : دادا

میلیام :- تاتن : دادا

کوڈاگو :- تائے : دادا

تامل ، کناری :- انی : ماں ،

بڑی بہن، بزرگ عورت

تامل ، میلیام ، تولو :- کال : پاؤں

دیگر زبانیں	وادی سندھ کی موجودہ زبانیں	یورال الٹائی	دراوڑی
—	<p>کھلا : پاؤں ، جوتے کھڑی : جوتے کھڑانواں : لکڑی کے تلے والا جوتا پنجابی :- ہٹ : سیلاب</p>	<p>پاؤں اورسپاک :- کور ہنگری :- گیالو</p>	<p>کناری، تلگو، گڈابا :- کالو : پاؤں تامل ، ملیالم ، تلگو ، کناری ، تلگو اورو : چشمہ پھوٹنا، پہنا ، دریا</p>
—	<p>گلگت میں ایک پہاڑ کا نام مالو بٹنگ ہے۔ اس میں مالو کے معنی غالباً پہاڑ کے ہیں۔</p>	<p>پہاڑ البانوی :- ملی وورگل :- مولی سا والگائی :- مار وار :- سیہر</p>	<p>تامل :- سالائی ملیالم، تلگو :- مالا کناری، کولامی :- مالے</p>
—	<p>پنجابی :- سوڑھا : لکڑی</p>	<p>درخت، لکڑی منگولی :- سوڈو قہوک ترکی :- سورم لیٹائی :- مور</p>	<p>تامل، ملیالم، تولو :- مارم کناری، گڈابا :- مارا تلگو :- مارانو گوڈی :- مارا کونی :- مارانو</p>

—

ہندی :- کابن (شری کرشن
کا ایک صفاتی نام)

—

سنسکرت :- کارا (مقامی
زبانوں سے مستعار شدہ)
گجراتی :- کارو { کالا
ہندی :- کارا

—

۲۵۵

اردو : کنواں

اردو، پنجابی :- کھائی : گڑھا
پنجابی :- کھوہ : کنواں
کھالہ : پانی کا نالہ
چوہا : تالاب
سوا : پانی کا نالہ

پنجابی :- کابن : بڑا آدمی، سردار،
حاکم

اردو :- تالو
پنجابی :- تالو : سقف دہن،
سر، چوٹی

اردو ، پنجابی :- کالا

پنجابی :- آنا : گھونسلہ
آہ : خانہ

منگولی :- کو : پانی
ترکی :- کو : پانی کا کنواں
= سو : پانی
تبی :- چھو : پانی

ترکی، منگولی :- خان،
حاکم، بادشاہ، آقا
خاقان
اوسپاک :- خون

منگولی :- تالو گئی
کلموک :- تال گوی
بریات :- تول گئی
تنگوسی :- دول
ترکی :- تور

ترکی :- قرہ ، کارا
منگولی :- کارا
قدیم ترکی :- کورو
جاپانی :- کروفی
کالا ، سیاہ

منگولی ، تاتاری :- اول : گھر

تامل ، ملیالم :- کایام
تولو :- کایا
تالاب ، گڑھا ،
گہرائی ، پانی کا
ذخیرہ

تامل ، ملیالم :- کان : بادشاہ ، حاکم ،
بڑا آدمی ، گڈریا ،
رگھووالی کرنے والا

تامل :- تالائی
ملیالم ، کناری ، تلگو :- تالا
کوٹا ، ناٹکی :- تال
گڈابا :- تالو
سر ، چوٹی،
سرا وغیرہ

تامل ، ملیالم :- کارو { کالا ، سیاہ
کناری ، تولو :- کاری

تامل ، ملیالم :- ال { کھر
تلاکو ، تولو :- الو

دیگر زبانیں	وادی سندھ کی موجودہ زبانیں	یورال التائی	دراوڑی
—	پنجابی :- ڈہہ : ڈیلہ ، ڈھیر	<p>ترکی ، تاتاری :- تیب : پہاڑی ، چوٹی ، ڈیلہ ، ڈھیر وغیرہ (جیسے کہ تیب حصار ، تیب گہوارا)</p> <p>ترکی میں اس لفظ کی ایک صورت 'توپہ' بمعنی ڈیلہ ، ڈھیر وغیرہ بھی ہے جیسے کہ علی شیر نوائی نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے :</p> <p>توشتی کوزی یہ توپہ نرگس ساری</p>	<p>ڈیلہ ، ابھری ، ہونی جگہ ، ڈھیر ، پہاڑی وغیرہ</p> <p>تامل :- تپائی } کوٹا :- تپ } کناری :- تیسے }</p> <p>کناری :- ڈبا : پہاڑی تلاکو :- تپہ : پہاڑی ، چٹان پارچی ، کوئی :- ڈپیس : ڈیلہ ، ڈھیر</p> <p>ہرندوں اور جانوروں کے بال اور پر وغیرہ</p> <p>تامل :- تووی } ملیالم :- تووال } ٹوڈا :- توخی } تولو :- تولی }</p>
—	<p>باشکلی } وسوں } ویری :- زہو } وشو :- } بال</p>	<p>ترکی :- توئے } تبتی ، شریپا :- تاء } بال</p>	

وادی سندھ پر ترکوں کی پہلی یلغار

معلومہ تاریخ میں سب سے پہلے جس ترک قبیلے نے وادی سندھ پر حملہ کیا وہ 'ساکا' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وسط ایشیا کے خانہ بدوش اور جنگجو قبائل کا گروہ تھا۔ دارا گشتاسپ (۵۲۲ تا ۴۸۶ ق م) کے کتبوں میں اس قبیلے کا ذکر آیا ہے۔ ہیروڈوٹس (۴۸۴ تا ۴۳۰ ق م ؟) نے 'ساکا' قبیلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ساکا قبیلے کے لوگ لباس کے طور پر ہاجامہ استعمال کرتے ہیں اور سروں پر سخت قسم کی نوکدار ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ یہ تیرکان، خنجر اور تبر سے مسلح ہوتے ہیں۔''

محققین کے نزدیک سیستان (قدیم میکستان) کا نام انہی 'ساکا' قبائل

سے منسوب ہے۔

یوہ چی ترک قبائل

وادی سندھ میں وارد ہونے والے ترک قبائل میں 'یوہ چی' قبیلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ شروع میں یہ قبیلہ شمالی مغربی چین کے صوبہ 'کانسو' میں آباد تھا۔ اس قبیلہ کے خد و خال کے بارے میں مذکور ہے کہ:

''یہ لوگ لمبے قد و قامت، زردی مائل رنگت اور لمبی ناک

کے حامل تھے۔''

۱۷۰ ق م میں ایک دوسرے ترکی قبیلے 'ہیونگ نو' نے اس قبیلے پر حملہ کر دیا اور انہیں اپنی آبائی سر زمین سے نکال دیا۔ اب 'یوہ چی' قبیلہ اپنے بے شمار گھوڑوں، مویشیوں اور بھیڑوں کے لیے نئی چراگا ہوں کی تلاش میں چل نکلا۔ مغرب کی طرف نقل مکانی کرتے ہوئے صحرائے گوبی کی شمالی سرحدوں پر ان کا ایک دوسرے ترکی قبیلہ 'ووسون' سے سامنا ہوا جو کہ 'دریائے الی' کے کناروں پر آباد تھا۔ 'ووسون' قبیلہ نے مدافعت کرنے کی کوشش کی لیکن 'یوہ چی' کا ٹڈی دل انہیں تاخت و تاراج کرتا ہوا آگے 'سیر دریا' کی مر غزار وادیوں کی طرف نکل گیا جو کہ 'ساکا' قبائل کا علاقہ تھا۔ 'ساکا' قبائل نے اپنے علاقے کو بچانے کی

کوشش کی لیکن 'یوہ چی' قبیلہ کے سامنے وہ بھی نہ ٹھہر سکے اور مجبوراً اپنی سرسبز چراگاہوں کو حملہ آوروں کے قبضے میں چھوڑ کر وادی سندھ کی طرف آنکلیے۔

'یوہ چی' قبائل کو اس نئی سرزمین میں قیام کیے ہوئے بمشکل پندرہ بیس سال ہی گزرے ہوں گے کہ ان کے پرانے دشمن 'ہیونگ نو' قبیلہ نے اپنے حلیف 'ووسون' کی شکست کا انتقام لینے کے لیے ان پر چڑھائی کر دی۔ اب وہ پھر نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔ اس دشت نوردی کے بعد دریائے جیحوں کی وادی میں آٹھہرے اور مقامی قبائل کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ یہاں یہ لوگ دو تین نسلوں تک پر امن زندگی بسر کرتے رہے اور اثناء میں وہ پانچ مختلف قبیلوں میں بٹ گئے۔

ایک چینی مؤرخ 'فان یے' نے 'یوہ چی' قبائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"قدیم زمانہ میں 'یوہ چی' قبائل 'ہیونگ نو' سے شکست کھانے کے بعد 'تاہٹیا' کی وادی میں جا بسے۔ یہاں یہ ہسی یومی، کوئی شوانگ، شوانگ می، ہسی تون اور تومی نام کے پانچ خود مختار قبیلوں میں بٹ گئے۔ کوئی سو سال بعد کوئی شوانگ (کوشان) قبیلہ کے سردار کیوشیئوکیو (کدفیسس اول) نے باقی چاروں قبیلوں کو زیر کر کے وانگ (آقا) کا لقب اختیار کر لیا۔ پھر اس نے انگانسی (پارتھیا)، (کا وفو: دریائے کابل) (سنسکرت: کُبھا)، پوٹا (باختر) اور کی پن (گندھارا یعنی پشاور کے نواح) کے علاقوں پر حملہ کر کے اپنے زیر نگیں لے آیا اور اسی طرح کشن سلطنت کی داغ بیل ڈال دی۔ کیوشیئوکیو کی وفات کے بعد اس کا لڑکا بن کاؤچن (کدفیسس ثانی) تخت نشین ہوا۔ اس نے تین چٹو (ٹیکسلا کا صوبہ) کا علاقہ فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔"

۱۔ اس عہد کی کانٹن کی چینی میں پوٹا کا تلفظ پوک تیو درج ہے جس سے پختو یعنی پٹھانوں کی سرزمین بھی مراد لی جا سکتی ہے۔

کیوشیٹو کیو کا ترکی نام کو جولا کپسا کد فیسس (اول) تھا۔ اس نے ۳۰۰ء میں اپنی فتوحات کا آغاز کیا اور ایران کی شمالی سرحدوں سے لے کر ٹیکسلا تک کا علاقہ اپنے زیر نگیں کر کے کشن حکومت کی بنیادیں رکھ دیں۔ باختر، سوگدیانہ اور بخارا کے علاقے بھی اس کی قلمرو میں شامل تھے۔ اس کے سکّوں پر اس کے لقب کے طور پر ذیل کی عبارت منقش ہے

یاووگا : (تاتاری :- یا بغوز : بڑا بادشاہ یعنی مہاراجا -
ترکی :- اوغوز : سردار)

راجا ادھیراج - سچ دھرم

(شاہوں کا شاہ - سچائی پر قائم)

کندہ ہے - اس کی وفات (۶۸۵ء) کے بعد اس کے بیٹے ویماکد فیسس

ثانی (چینی نام : یں کاؤ چن) نے عنان حکومت سنبھال لی -

کد فیسس ثانی (۸۵ تا ۶۱۲ء)

نوٹ : کشن عہد کے سنین کے بارے میں ماہرین تاریخ کے درمیان

بہت حد تک اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں نے اس پہلو میں زیادہ تر

'ہندوستان کے اولین عہد کی تاریخ' (The Early History of India)

کے مصنف مسٹر ونسنٹ سمتھ (V. A. Smith) کی پیروی کی ہے -

کد فیسس ثانی نے کئی ایک پارتھی اور ہند یونانی حکمرانوں کو

شکست دے کر اپنی سلطنت کی حدود کو اور بھی وسیع کر دیا - جنوب

مشرق میں بنارس اور شمال میں خوارزم کے صوبہ تک کے علاقے اس کی

قلمرو میں شامل تھے۔ برصغیر میں سب سے پہلے اسی حکمران نے سونے کے

سکّے جاری کیے جن کے ایک طرف یونانی میں بادشاہوں کا بادشاہ

(Basileus Baseleon) کا لقب درج ہے اور دوسری طرف خروشتی میں

مندرجہ ذیل تحریر کندہ ہے :

مہاراجا سا - راجا ادھیرا جاما

(عظیم بادشاہ - بادشاہوں کا بادشاہ یعنی شہنشاہ)

سرب لوگ ایشوراسا (سب لوگوں کا آقا)

مہا ایشوراسا ہیا کد فیسا (عظیم آقا ویماکد فیسس)

تراداتا (نجات دہندہ)

مغربی پاکستان کے علاوہ یہ سکتے بھارت کے اتر پردیش کے شہروں گورکھپور اور غازی پور سے لے کر مدھیہ پردیش کے شہر جبل پور تک کے علاقوں میں دستیاب ہوئے ہیں۔

کنشک اعظم (۱۲۰ تا ۷۱۵۰ء)

کدھیس ثانی کے بعد مہاراجہ کنشک سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس عہد کو نہ صرف کشن خاندان بلکہ پاک و ہند کی تاریخ میں ایک منہری باب کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی سلطنت کی حدود بھڑائچ (کاٹھیاواڑ) سے لے کر شمال میں بحیرہ یورال تک اور مشرق میں ختن (چینی ترکستان) سے لے کر مغرب میں خراسان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ وہ واحد پاکستانی حکمران تھا جس نے وسط ایشیا کے ایک وسیع خطہ پر حکمرانی کی۔ پشاور کو اس عظیم سلطنت کے درالحکومت ہونے کا شرف حاصل تھا۔

وراء مہرا (Warah Mihira) (۵۰۰ تا ۷۵۰ء) کی شہرہ آفاق تصنیف 'راج ترنگنی' میں مہاراجہ کنشک اور اس کے جانشینوں کو ترشک (ترک کا قدیم تلفظ) خاندان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کے لباس اور خد و خال کے بارے میں جو صراحتیں موجود ہیں اس سے بھی اس کے ترکی نسل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے سکوں پر اس کا لقب ترکی زبان میں 'شاؤ نانو شاؤ کا نشکی کو شانو' (شہنشاہ کنشک کشن) درج ہے۔ یہ ایک بہادر جرنیل، عظیم فاتح، مدبر حکمران اور علم و فن کا دلدادہ تھا۔ اس کے دربار میں دانشوروں اور عالموں کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے درباریوں میں بدھ بھکشو اشوا گھوش کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ یہ ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر، موسیقار اور عالم تھا نیز مذہبی مسائل سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ 'بدھ چرت' اور 'سوترا لنکار' اس کی مشہور تصنیفات میں سے ہیں۔ علاوہ ازیں فلاسفر اور سائنس دان ناگا ارجن، مشہور وید چرک، واسو مترا، اور یونانی انجنیر ایجسیلاس (Agesilaus) اس کے دربار کی اہم شخصیتیں تھیں۔

مہاراجہ کنشک کے عہد کو ثقافتی، مذہبی اور لسانی لحاظ سے

ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ عہد مختلف تہذیبوں کے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور میں یونانی، رومی، ایرانی، ترکی اور وادی سندھ کی تہذیبوں کے میل جول نے فنون لطیفہ میں گندھارا آرٹ کو جنم دیا جو کہ ان تمام تہذیبوں کی اعلیٰ صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ اسی عہد میں بدھ مت ہالیہ کی دیواریں پھاند کر وسط ایشیا میں چھا گیا۔

کشن عہد کے آخری ایام

کنشک کی وفات کے بعد کشن خاندان کے کئی ایک حکمران یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے لیکن وہ کنشک کی طرح اس وسیع سلطنت پر اپنا تسلط قائم نہ رکھ سکے۔ چینی مؤرخوں کے بیانات کے مطابق تیسری صدی عیسوی میں کشن سلطنت کی حدود سمٹ کر باختر، افغانستان، گندھارا اور شمالی پنجاب کے علاقوں تک محدود رہ گئی تھیں۔ اس دور میں ایران کے ساسانی خاندان کے اولین حکمرانوں اردشیر بابکاں (۲۲۴ تا ۲۳۱ء) اور شاہ پور اول (۲۴۱ تا ۲۷۲ء) نے کشن حکمرانوں کو شکستیں دے کر باختر کے صوبہ پر قبضہ کر لیا۔

چوتھی صدی کا دوسرا نصف حصہ کشن عہد کی حیات نو کا دور کہلاتا ہے جب کہ اس خاندان کے 'کدارا' (چینی: کی تولو) نام کے حکمران نے ساسانیوں کو شکست دے کر باختر کا صوبہ واپس لے لیا۔ اس طرح اپنی قلمرو کو کدفیسس اول کے عہد کی سلطنت کی حدود تک وسیع کر لیا۔ لیکن یہ نئی زندگی دیر پا ثابت نہ ہوئی کیونکہ اسی دور میں سفید ہن قبائل نے شمال سے یلغار کر کے کشن سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

کشن عہد کا لسانی ورثہ

کشن خاندان کے پانچ سو سالہ دور حکومت نے پنجاب، افغانستان اور وسط ایشیا میں جو تہذیبی، ثقافتی اور لسانی اثرات چھوڑے ان کا پوری طرح احاطہ کرنا مشکل ہے کیونکہ اس سلسلہ میں کئی پہلو ابھی تک تشنہ تحقیق ہیں۔ اس عہد کے دو مختلف چہرے ہمارے سامنے ہیں۔ اول تو یہ کہ کشن قبیلہ ترکی اصل سے تعلق رکھتا تھا۔ وادی سندھ میں ان کے ورود سے یہاں کے تہذیب و تمدن میں ایک نیا رنگ شامل ہو گیا۔

ساتھ ہی اس عہد کے لسانی اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا گو فی الحال اس کے مطالعہ کے لیے ضروری مواد فراہم نہیں۔

اس تصویر کا دوسرا رخ وہ ہے جب کہ پاکستان میں آنے کے بعد کشن قبیلہ مقامی تہذیب و تمدن اور مذہب و زبان اختیار کر لیتا ہے اور پھر وسط ایشیا میں پاکستانی سلطنت کی بنیادیں استوار کر دیتا ہے۔ اس تصویر کے دوسرے رخ کا جائزہ لینے سے پہلے اس کے اولین پہلو پر سرسری سی نظر ڈال لینا ضروری ہوگا۔

نقش باغستان

وسط ایشیا کی قدیم ترکی زبانوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں ایران کے شمال مغربی علاقہ (قدیم مدائن) میں واقع باغستان یا بیمہستون کے کھنڈرات سے دستیاب ہونے والی لوحیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ الواح دارا گشتاسپ (۵۲۲ تا ۴۸۶ ق م) کے عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان پر قدیم فارسی، بابلی اور ساکا (قدیم ترکی) زبانوں میں دارا گشتاسپ کی فتوحات کا حال درج ہے۔ یاد رہے کہ اس عہد میں ہخامنشی سلطنت کی حدود وسط ایشیا میں سیر دریا کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس میں ترکی قبائل کے علاقے ساکا، سغدائی، خراسان اور باختر شامل تھے۔ اس دور میں اس علاقے کو توران کے نام سے پکارا جاتا تھا اور یہاں کی زبان تورانی کہلاتی تھی۔

ان کتبوں میں جو ساکا زبان کا نمونہ مہیا ہے اس سے نہ صرف وسط ایشیا کے ترکی قبائل کی قدیم زبان کا مطالعہ کرنے میں مدد ملتی ہے بلکہ ساتھ ہی ان زبانوں کے دراوڑی گروہ سے گہری مطابقت کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔

بشپ کا ڈویل نے بیمہستون کی اس تحریر اور دراوڑی زبانوں میں نو مختلف پہلوؤں میں باہمی اشتراک کے بارے میں بحث کی ہے۔ یہاں ہم مختصر طور پر صرف ایک دو مثالوں کا ذکر کریں گے :

اول : بیمہستون کی ترکی تحریر اور دراوڑی زبانوں میں لثوی آوازیں مثلاً ٹ، ڈ اور لثوی نون مشترکہ طور پر مروج ہیں۔

دوم : اضافی علامت کے طور پر دونوں زبانوں میں 'نا' کا لاحقہ مستعمل ہے مثلاً :

براہوئی : نن (ہم) - ننا (ہارا) -

کناری : نانو (میں) - نانا (میرا) -

اسی طرح ساکاہو (میں) - ہونینا (میرا) - اس میں 'نا' کی اضافی علامت دہری صورت میں مستعمل ہوئی ہے -

سوم : دونوں زبانوں میں مفعولی حالت کے لیے 'ک' کی علامت مشترک طور پر مستعمل ہے جیسے کہ :

ساکا : 'نی اکا' یا 'نی اکی' (تجھ کو) - نی بمعنی تو -

ملیالم : نینا کو -

تلگو : نی کو - تولو : نی ک (تجھ کو) نی بمعنی تو -

چہارم : دونوں زبانوں میں صیغہ واحد حاضر کی صورت ایک ہی ہے جیسے کہ اوپر کی مثال سے واضح ہے -

پنجم : گرامر کے لحاظ سے دونوں زبانیں تالیفی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں -

اگرچہ ان مثالوں سے دراوڑی اور ترکی زبانوں میں گہرے لسانی رشتے کے دعوے کو مزید تقویت ملتی ہے لیکن ان کی روشنی میں یہ کہنا نہایت مشکل ہے کہ آیا پنجابی زبان کی پوٹھوہاری اور ملتان بولیوں میں اضافی علامتیں 'نا' اور 'نڈا' اور مفعولی علامتیں 'کی' اور 'کو' ترکی زبانوں کی باقیات میں سے ہیں یا دراوڑی زبانوں کا ورثہ ہیں - بہر حال برصغیر میں ان علامتوں کے عمومی استعمال سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ بڑپائی تہذیب کے عہد کی دراوڑی زبانوں ہی سے ورثہ میں ملی ہیں - جہاں تک قدیم ترکی زبانوں کے اثرات کا تعلق ہے اس کے لیے فی الحال مزید مطالعہ کی ضرورت ہے -

پاکستان کی افواج قاہرہ ترکستان میں

کد فیس ثانی کے عہد میں مشہور چینی سپہ سالار پان چاؤ نے ۷۳ سے لے کر ۱۰۲ء تک تیس سال تک فتوحات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا - وہ ختن کو روندتا اور کشن سلطنت کی شالی سرحدوں کو

چھوٹا ہوا بحیرہ اسود تک کے علاقے کو اپنے زیر نگیں لے آیا اور اس طرح روم، الکبریٰ کی حدود تک جا پہنچا۔

کد فیسس ثانی کو اپنی بعض شمالی بستیوں پر چینی افواج کا قبضہ بہت ناگوار گزرا اور اس نے فوراً پان چاؤ کو ان سرگرمیوں سے باز رہنے کے لیے پیغام بھیجا نیز مطالبہ کیا کہ بطور تاوان چینی شہزادی اس کے عقد میں دے دی جائے۔ پان چاؤ نے اس توہین کو برداشت نہ کیا اور اس ایلچی کو گرفتار کر کے واپس بھیج دیا۔ کد فیسس نے اس ہتک کا انتقام لینے کے لیے ۹۰ء میں اپنے سپہ سالار سی (Si) کے زیر کمان ستر ہزار سواروں پر مشتمل ایک جرار لشکر پاکستان سے پامیر کے راستے ختن پر چڑھائی کے لیے روانہ کیا۔ راستے کی گوناگوں صعوبتیں برداشت کرتا ہوا یہ لشکر ابھی راستے ہی میں تھا کہ کا شغر یا یارقند کے مقام پر تازہ دم دشمن نے اس پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ پاکستانی فوج کا ایک بڑا حصہ شکست کھانے کے بعد وہیں پر مقیم ہو گیا۔ یاد رہے کہ یہ وہی علاقہ ہے جہاں کہ مشہور جرمن ماہر اثریات سرارل سٹائن کو ۱۹۰۰ء میں کھدائیوں کے دوران پاکستانی آبادیوں کے آثار دستیاب ہوئے۔

مہاراجہ کنشک نے ۱۲۵ تا ۱۳۰ء کے عرصے میں کا شغر، یارقند اور ختن کے علاقے فتح کر کے دوبارہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ بعض چینی مؤرخ اس سے متفق نہیں ہیں۔ چینی تواریخ میں مذکور ہے کہ پان چاؤ کی وفات (۱۲۴ء) کے بعد وسط ایشیا میں طوائف الملوکی پھیل گئی اور مفتوحہ علاقے مرکزی حکومت سے کٹ گئے۔ ۱۵۲ء میں ختن میں ایک مقامی انقلاب آیا جس میں کہ ختن کے چینی گورنر وانگ کنگ (Wangking) کو قتل کر دیا گیا اور ملک کا پاکستان کی کشن حکومت سے الحاق کر دیا گیا۔ اگر یہ بیان صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس انقلاب کی تہ میں پاکستانی نوآباد کاروں کا ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے۔

وسط ایشیا میں پاکستانی نوآبادیاں

وسط ایشیا میں پاکستانی حکومت کے استحکام کے بعد اس تمام

علاقے میں حفاظتی چوکیاں قائم کر دی گئیں جہاں پاکستانی محافظ دستے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ آثارات سے پاکستانی طرز کے مندروں کی برآمدگی اس امر کی شاہد ہے کہ یہاں بدھ مت کے پاکستانی مبلغوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ اس کے بعد پاکستانی تاجر، صنعت کار اور دوسرے عہدہ دار بھی ضرور آباد ہوں گے۔ غرضیکہ یہ آبادیاں پاکستانی، یونانی اور مقامی ترکی باشندوں سے آباد تھیں۔ ان کی باہمی آمیزش سے یہاں ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی۔ ان تہذیبی اور مذہبی تحریکوں کے جلو میں لسانی تبدیلیاں بھی پیش پیش تھیں۔ جہاں ایک طرف وادیٰ سندھ وسط ایشیا کے ترکی قبائل کی آماجگاہ بن چکا تھا وہاں وسط ایشیا میں وادیٰ سندھ کے نو آباد کاروں نے بھی جا کر ڈیرے ڈال دیے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ یونانی آباد کار بھی اپنے مخصوص تہذیبی اور ثقافتی ورثے کے ساتھ موجود تھے۔ مختلف زبانیں ایک دوسری کے ساتھ گھل مل رہی تھیں اور ان کے ملاپ سے مقامی زبانوں میں اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ چینی ترکستان کے کھنڈرات سے دستیاب ہونے والے کتبے جنہیں مغربی ماہرین لسانیات نے توخاری زبان کا نام دیا ہے غالباً اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ان کتبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آج سے قریباً ہزار بارہ سو سال پہلے لکھے گئے اور ان کی زبان وادیٰ سندھ کی قدیم زبان سے مشابہ ہے۔

پروفیسر چارلٹن لائیرڈ (Charlton Laird) رقمطراز ہے کہ:

”ایک وقت میں توخاری زبان تمام صحرائے گوبی میں بولی جاتی تھی لیکن تباہ شدہ بستیوں کے مکینوں کے ساتھ یہ بھی ختم ہو گئی۔“

آگے چل کر وہ اپنا خیال ظاہر کرتا ہے کہ:

”غالباً توخاری باشندے ہندو قوم سے تعلق رکھتے تھے جو نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہو گئے۔“

(The Miracle of Language)

یہاں مشہور جرمن ماہر اثریات سر ارل سٹائن کی ۱۹۰۱ء کی چینی ترکستان خاص کر ختن کے علاقے میں کھدائیوں کے دوران

وادی سندھ کے نوآبادکاروں کے آثار دستیاب ہونے کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ان کھدائیوں کے دوران علاوہ دیگر اشیاء کے سنسکرت، براہمی، خروشتی، یونانی اور چینی رسم الخط میں مذہبی نوعیت کے کتبے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن کے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ یہ عیسوی عہد کے پہلے تین یا چار سو سال کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

حال ہی میں روس کے آثار قدیمہ کے شعبہ کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ موجودہ کھدائیوں کے دوران چینی ترکستان کے شہر سمرقند کے نواح میں کشن عہد کے قلعے اور بستی کے آثار دستیاب ہوئے ہیں۔ اس بارے میں مزید تفصیلات کا ابھی انتظار ہے۔

(امروز، لاہور، ۹ ستمبر ۱۹۶۲ء)

وسط ایشیا کی پاکستانی نوآبادیوں کا خاتمہ

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے پانچویں صدی عیسوی میں سفیدپن قبائل کی یلغار کے ساتھ ہی وسط ایشیا میں پاکستان کی پانچ سو سالہ شاندار حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ایسا معلوم دیتا ہے کہ ان وحشی قبائل نے صرف فتوحات ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مفتوحہ علاقوں میں تباہی و بربادی کا بازار گرم کر دیا۔ رستی بستی آبادیوں کو تاخت و تاراج کر کے زمین بوس کر دیا اور ہر مرد و زن کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ پاکستانی نوآبادکاروں نے ان مقابلوں کی تاب نہ لاتے ہوئے بستیوں کو خیرباد کہہ دیا اور خانہ بدوشانہ زندگی اختیار کر لی۔

گو یہ پاکستانی بستیاں خود زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکیں لیکن ان کے اثرات نہایت دیرپا ثابت ہوئے۔ اول تو گندھارا فن اس مرکز سے اٹھا اور چین، جاپان، کوریا اور منچوریا تک کے علاقوں میں پھیل گیا اور نئی سرزمینوں میں خوب پھلا پھولا۔ موجودہ چینی اور جاپانی فن مصوری اور فن سنگ تراشی کو اسی قدیم گندھارا فن کا مرہون منت تسلیم کیا جاتا ہے۔ دوم بدھ مذہب کی تبلیغ، غالباً جنوب مشرقی اور وسطی ایشیا میں بدھ کی اشاعت وادی سندھ کی ان نوآبادیوں کے بدھ

بھکشوؤں کی تبلیغی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔ اس عہد میں بدھ مت کی تعلیم کے لیے زیادہ تر براہمی اور خروشتی رسم الخط استعمال کیا گیا ہے جس کی زبان اکثر حالات میں پراکرت اور بعض اوقات سنسکرت ہے۔ نتیجتاً بدھ مذہب کے ساتھ ساتھ وادیٰ سندھ کی اس وقت کی مروجہ زبان کے کتنے ہی الفاظ مقامی زبانوں میں سرایت کر گئے۔

ڈاکٹر صابر صاحب نے اس بارے میں تفصیلی طور پر بحث کرنے کے بعد نتیجہ نکالا ہے کہ :

”بدھ ازم کو قبول کرنے کے بعد ترکی (اور منگولی) زبان پر سنسکرت زبان کا بہت کافی اثر ہوا۔ یہی نہیں بلکہ بعض علاقوں میں ترکی زبان کو سنسکرت رسم الخط میں لکھا جانے لگا۔ حروف تہجی اور ہندسوں کی شکلیں تقریباً بالکل ایسی تھیں جیسے آج بھی بھارت کے بعض علاقوں میں رائج ہیں۔“

”اس رسم الخط کو ترک برہمنی بازی کہتے تھے۔ اس رسم الخط میں بہت سے کتبے برلن کے کتب خانے میں آج بھی موجود ہیں۔ بدھ ازم کا اثر ترکوں پر پانچ سو سال تک رہا۔“

(اردو میں ترکی و منگولی الفاظ ،

اردو نامہ ، کراچی ، شماره ۱۳ ، ۱۹۶۳ء)

روس کے ماہرین لسانیات کی جماعت نے ۱۹۶۲ء میں روس کی مختلف زبانوں کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ میں اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ :

”فی زمانہ بھی چینی ترکستان کے بعض علاقوں میں ایسے قبائل آباد ہیں جو وادیٰ سندھ کی موجودہ زبانوں سے ملتی جلتی زبان استعمال کرتے ہیں۔“

روس کے ایک مشہور ماہر شرقیات مسٹر جوزف اورانسکی (Josif Oransky) نے وسط ایشیا میں آباد چند ایسے قبائل کا سراغ لگایا ہے جو آج بھی ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جن کا پنجاب کی مختلف بولیوں سے گہرا رشتہ موجود ہے۔

انہوں نے وسیع تحقیقات کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ تاجکستان کی وادی گسار (Gissar) میں قریباً ایک ہزار افراد پر مشتمل ایک ایسا قبیلہ آباد ہے جس کے افراد آپس میں بات چیت کے دوران مغربی پاکستان میں مروجہ پنجابی اور لہندا زبانوں سے مشابہہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس زبان کا نام پریاہ (Paria) بیان کیا جاتا ہے۔ اس زبان کی کوئی تحریر موجود نہیں۔

اسی طرح انہوں نے تاشقند اور فرغانہ کے نواح میں آباد ایسے قبائل کا ذکر کیا ہے جو کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والی زبان کے حامل ہیں۔ لیکن یہ زبان پریاہ سے کچھ مختلف ہے۔

فاضل محقق نے مذکورہ بالا شواہد کی روشنی میں تحریر کیا ہے کہ :

”ظاہر ہے کہ یہ قبائل کسی گئے گزرے زمانے میں برصغیر پاک و ہند سے نقل مکانی کر کے وسط ایشیا میں آباد ہو گئے۔“

روزنامہ اسٹیٹسمن (دہلی) کی ایک خبر ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۳ء کی رو سے جنوری ۱۹۶۴ء میں دہلی کے مقام پر منعقد ہونے والے ماہرین شرقیات کے چھبیسویں بین الاقوامی اجلاس میں مسٹر اورانسکی نے اپنی ان تحقیقات کے بارے میں ایک مدلل مقالہ پیش کیا۔

وادی سندھ کے مہاجر آرمینیا میں

اب ہم چینی ترکستان کو خیر باد کہہ کر مغرب کی طرف رخ کرتے ہیں۔ یہاں چوتھی صدی عیسوی میں آرمینیا کے علاقے میں وادی سندھ کے باشندوں کی ایک بستی کا تذکرہ ملتا ہے (یاد رہے کہ یہ وہی زمانہ ہے جب کہ مغربی ایشیا میں آباد پاکستانی نو آبادیاں اجڑتی ہوئی نظر آتی ہیں)۔ شامی نسل کے عیسائی مبلغ بشپ زینوبیوس (Zenobuis) نے جو چوتھی صدی عیسوی کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے اپنی ذاتی یادداشتوں میں اس بستی کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ :

”یہ لوگ عجیب شکل و صورت کے مالک ہیں۔ یہ رنگ کے کالے ہیں اور سر پر لمبے لمبے بال رکھتے ہیں۔ دیکھنے میں بڑے بدنما نظر آتے ہیں۔ یہ جن بتوں کی پوجا کرتے ہیں اس کی کہانی اس طرح ہے۔ دیتمتر (Demeter) (غالباً دمودر: ایک ہندو دیوتا کا نام) اور کیسانے (Keisaney) (غالباً کشن یعنی شری کرشن) دو بھائی تھے۔ دونوں ہندو شہزادے تھے۔ وہاں کے بادشاہ دینسک (Dinasky) (غالباً راجہ کنس کے نام کی مسخ شدہ صورت) کو پتہ چلا کہ یہ دونوں بھائی اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ اس نے ان کے خلاف فوج کشی کی اور حکم دیا کہ یا تو انہیں تہ تیغ کر دیا جائے یا ہمیشہ کے لیے جلا وطن۔ یہ شہزادے بمشکل تمام جان بچا کر بھاگے اور بادشاہ والرساکیز (Valarsaces) کی سلطنت میں پناہ لی۔ اس بادشاہ نے تاران (Taron) (غالباً توران) کے علاقے کی حکومت ان شہزادوں کو عطا کر دی۔ یہاں ان نو آبادکاروں نے ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام وشپ (Vishap) بمعنی اژدہا رکھا۔ آباد ہونے کے پندرہ سال بعد بادشاہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر دونوں شہزادوں کو قتل کرا دیا لیکن اس علاقے کی حکومت دونوں بھائیوں کے تین لڑکوں کور (Kauri)، میگھتی (Meghti) اور ہری آن (Harian) کے سپرد ہی رہنے دی۔ کچھ عرصے بعد تینوں بھائی نقل مکانی کر کے کارکی (Karki) نامی پہاڑی پر آباد ہو گئے۔ یہ مقام نہایت ہی سرسبز اور شاداب تھا۔ یہاں تمام ضروریات زندگی

۱۔ اگر دیتمتر کو یونانی دیتمترس (Demetrius) ہی کی ایک صورت مان لی جائے تو بھی یہ بعید از قیاس نہیں کیونکہ وادی سندھ اور اس کی وسط ایشیا کی نوآبادیوں میں یونانی اثرات ایک مسلمہ امر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے مصنف کا مضمون ’وادی سندھ میں یونانی تہذیب کے اثرات‘ امروز ۱۰ فروری ۱۹۶۳ء اور ’وادی سندھ کی زبان پر یونانی اثرات‘ ملاحظہ ہوں۔

باافراط میسر تھیں اور آب و ہوا بھی نہایت خوشگوار تھی - یہاں آباد ہونے کے بعد انہوں نے اس جگہ مندر تعمیر کیے جن میں کیسا نے اور دیمتر کے بت تراش کر رکھے - ان مندروں پر اپنی ہی قوم کے محافظ مقرر کیے - کیسانے کے سر کے بال لمبے تھے اس بناء پر اس کے پجاری بھی لمبے لمبے بال رکھتے تھے - کچھ عرصے بعد حکومت نے ان کے لیے لمبے بال رکھنے کی ممانعت کر دی - جب ان لوگوں کو عیسائی بنا لیا گیا تو اس نئے مذہب میں ان کا ایمان پختہ نہیں تھا - لیکن ساتھ ہی یہ اپنے آبائی کفرانہ مذہب کی پیروی کھلے بندوں بھی نہیں کر سکتے تھے - پھر بھی یہ اپنے بت پرست بزرگوں کی نشانی کے طور پر اپنے بچوں کے سروں پر بالوں کے گچھے (چوٹی) رکھتے تھے -

آخر کار قریباً ۳۰۰ء کے لگ بھگ جولائی میں اس قوم کو عیسائیوں نے میدان جنگ میں شکست فاش دے کر ان کی قوت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا - ان بت پرستوں نے کل (۶۹۳۶) جنگ جو مرد میدان جنگ میں بھیجے جن میں سے ایک ہزار چھتیس مرد اور ان کا سپہ سالار ارزن (Arzan) (غالباً ارجن) وہیں کھیت رہے -“

کیا بشپ زینوبیوس نے مہابھارت کے واقعات کی مسخ شدہ کہانی بیان کی ہے یا حقیقت میں چینی ترکستان سے بھاگے ہوئے وادی سندھ کے نوآبادکاروں کے چشم دید حالات یا پھر عینی گواہوں کی شہادتوں کی ترجمانی کی ہے - جس طرز سے یہ واقعات بیان کیے گئے ہیں ہمیں ان سے کسی حد تک سچائی کی بو آتی ہے - بعض محققین نے زینوبیوس کے والر ساکیز کو پارتھی نسل کے مشہور سپہ سالار واغر شاگ (Wagharashag) سے مطابقت دینے کی کوشش کی ہے - لیکن جارج رالسن (George Rawlinson) کے بیان کے مطابق واغر شاگ کا عہد حکومت قریباً ۱۵۱ تا ۱۲۸ ق م کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے - اس نے شامی حکومت کا جوا سر سے اتار پھینکنے کے بعد جنوب مغربی ایشیا میں ایک عظیم سلطنت

کی بنیاد ڈالی جو کاکیشیا سے نسیبی (Nisibi) اور بحیرہ کیسپین سے لے کر بحیرہ قازم تک پھیلی ہوئی تھی -

ڈاکٹر محی الدین زور قادری صاحب بھی ناموں کی اس مشابہت سے دھوکا کھا گئے ہیں - وہ اپنے ایک مضمون 'اردو کے آرمینی شاعر' (مجلہ مشرب، مقالات نمبر کراچی) میں غالباً اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

”کہا جاتا ہے کہ مسیح سے ۱۵۰ سال قبل قنوج کے دو راجپوت راج کمار ہندوستان سے نکل کر آرمینیا میں پناہ گزیں ہوئے تھے اور وہاں کے حکمران نے ان کو علاحدہ آبادیاں اور مندر بنانے کی اجازت بھی دی تھی -“

معلوم نہیں کہ ڈاکٹر زور صاحب کی معلومات کا سرچشمہ کیا ہے - ویسے زینوبیوس کے بیان کے مطابق یہ واقعہ چوتھی صدی عیسوی کے زمانے ہی سے تعلق رکھتا ہوا معلوم دیتا ہے کیونکہ قبل از مسیح عہد میں عیسائیوں کے ساتھ جنگ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا -

تلک - غزنوی لشکر کا ہندو سپہ سالار

غرضیکہ ہشپ زینوبیوس کے زمانے (چوتھی صدی سے لے کر عہد غزنوی) ۶۹۹۸ء تا ۱۰۳۰ء تک بلکہ امیر تیمور (چودھویں صدی عیسوی کے اواخر) کے زمانے تک وادی سندھ کے باشندے مختلف صورتوں میں وسطی اور مغربی ایشیا کی سیاسی بساط پر سرگرم عمل نظر آتے ہیں - یہ ایک طویل داستان ہے جسے ہم کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں - یہاں مختصراً یہ بیان کر دینا کافی ہوگا کہ جہاں وادی سندھ میں غزنوی افواج کی کہان ترک سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھی وہاں وسط ایشیا میں خراسان وغیرہ کے علاقے میں جو فوجیں نبرد آزما تھیں ان کا بڑا حصہ وادی سندھ کے ہندو باشندوں پر مشتمل تھا اور ان کی کہان تلک نامی ہندو سپہ سالار کے ہاتھ میں تھی - اس کے علاوہ گوبند اور ناتھ دو دوسرے غزنوی سالار بھی ہندو تھے - جب مسعود کے زمانہ (۱۰۳۱ء تا ۱۰۴۰ء) میں پنجاب کے گورنر احمد نیالتگین نے بغاوت کر دی تو اس کی سرکوبی کے لیے جو لشکر روانہ کیا گیا اس کی کہان تلک کے ہاتھ میں تھی -

ہندو جاٹ مغربی ایشیا میں

مغربی ایشیا میں چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں تیموری فوج کو بھی ہندو جاٹ قبائل سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس کے بارے میں علی یزدی نے اپنی تصنیف 'ظفرنامہ' میں جو کہ امیر تیمور کے حالات پر مشتمل ہے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے :

”جب امیر تیمور دریائے جیحون کے علاقے میں فتوحات میں مصروف تھا تو جاٹ قبائل نے اس کے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ امیر تیمور نے واپس پھر کر اس لشکر کو شکست دی۔ یہاں سے وہ کش کے علاقے کی طرف بڑھا۔ جاٹ قبائل اپنے داروغہ کی معیت میں اس یلغار کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور راہ فرار اختیار کر لی۔“

آج بھی وسط ایشیا کی کرگیز قوم کے ایک قبیلے کا نام جاٹک کرگیز ہے۔ یہ قبیلہ غالباً اپنے بدیشی الاصل ہونے کی بناء پر دوسرے قبائل میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

وسط ایشیا میں پاکستانی عہد کے لسانی اثرات

اس پہلو میں ہم پھر ڈاکٹر صابر صاحب کے محققانہ مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ نے کشن عہد میں ترکوں کے مذہبی نظریات پر بدھ مت کے اثرات اور سنسکرت رسم الخط کی ترویج کا ذکر کرنے کے بعد قدیم ترکی تحریروں اور ترکی و تاتاری زبانوں کی لغات سے منتخب شدہ ذیل کے سنسکرت الاصل الفاظ کی نشان دہی کی ہے :

سنسکرت کے مترادف الفاظ

اچاریہ

اکشرا

ورنامی

چکر

دھرم

گنگا

مدھو

ترکی و تاتاری الفاظ

اچاری (معلم)

اکشر (حرف)

باراناس (شہر بنارس)

چکر (پہیہ)

درم (مذہب)

کانگ (دریائے گنگا)

مدر (میٹھا)

سنسکرت کے مترادف الفاظ	ترکی و تاتاری الفاظ
نمس	نامو (تعریف)
نروان	نربان (نجات)
نیتم	نوم (قانون)
راکشس	راکش (شیطان)
شلوک	شلوک (شعر)
سادھو	سادو (درویش)
شاسن	شازان (نظام)
بالک	بالا (بچہ)
بھکشو	بخشی (تقسیم کنندہ)

ترک قبائل کے ورود کا دوسرا دور

جہاں تک وادیٰ سندھ میں ترک قبائل کی آمد کا تعلق ہے اس کہانی کا پہلا باب بوہ چی قبائل کے ورود (پہلی صدی عیسوی) سے شروع ہو کر عہد غزنوی سے کچھ عرصہ قبل گندھارا کے علاقے میں ترکی شاہی خاندان کی حکومت کے خاتمے پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا باب ترکان یاغما کے سپہ سالار امیر سبکتگین کے حملے سے شروع ہوتا ہے اور ایبک قلیج (خلجی) اور تغلق خاندان سے ہوتا ہوا تیموری خاندان پر جا کر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ غرضیکہ ترکان احرار کے ساتھ تعلقات کی جو داستان پہلی صدی عیسوی سے شروع ہوئی تھی وہ عہد ظفر کے خاتمے پر ۱۸۵۷ء میں ختم ہوتی ہے۔ دوہزار سال کی اس طویل مدت میں جہاں ایک طرف وادیٰ سندھ کی زبان نے ترکی اور تاتاری زبانوں کو مختلف طور پر متاثر کیا۔ اسی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی تاتار اور ترک قبائل کی زبانوں نے وادیٰ سندھ کے لسانی ڈھانچے کو متاثر کیا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف تاتار اور ترک قبائل کی زبانوں نے وادیٰ سندھ میں جو اثرات چھوڑے ہیں ان کی جستجو اہل علم حضرات کو نئی وادیوں کی تلاش کی دعوت دے رہی ہے۔

ترک قبائل کا دوسرا دور اور اس کے لسانی اثرات

عہد غزنوی کے ساتھ وادیٰ سندھ میں ترک قبائل کی آمد کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں کتنے ہی مہم باز ترک سپہ سالار اپنے

جلو میں منچلے جنگجو سپاہیوں کے لشکر لیے قسمت آزمائی کے لیے برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوتے ہیں اور یہاں نئی نئی سلطنتوں کی بنیادیں ڈال دیتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے ساتھ ساتھ خرقہ پوش اور بوریہ نشین فقیر سفر و حضر کی صعوبتیں برداشت کرتے اس نئی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں اور آن واحد میں ظلمت کدہ ہند کے گوشے گوشے میں توحید کی شمعیں روشن کر دیتے ہیں۔ سوداگر زادے مال و اسباب سے لدے ہوئے قافلے لے کر آتے ہیں لیکن یہاں کی سرزمین کی دلکشی انہیں واپس نہیں جانے دیتی اور آخر وہ یہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بلخ اور بخارا کے شہزادے سیر و سیاحت کی غرض سے آتے ہیں اور اکثر نقد دل کے ساتھ نقد جان بھی لٹا بیٹھتے ہیں۔ آج بھی چناب کی مدھر لہریں دھیمے دھیمے سروں میں بلخ کے شہزادے عزت بیگ کے عشق کے گیت گا رہی ہیں جو گجرات کی حسن خیز سرزمین میں پہنچ کر سوہنی کمہارن کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے اور آخر تخت شاہی کو ٹھوکر مار کر مہینوال (گلہ بان) کا پیشہ اختیار کر کے زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔

یہ لشکری مبلغ، تاجر اور سیاح اپنے ساتھ نئی زبان لے کر آتے ہیں۔ یہاں ان کا واسطہ مقامی زبانوں سے پڑتا ہے۔ کچھ وہ یہاں سے سیکھتے ہیں کچھ سکھاتے ہیں۔ اس طرح برصغیر کے لسانی ڈھانچے میں ایک نیا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ وادی سندھ جسے ایک تہذیبی شاہراہ کا نام دینا چاہیے بھلا ان اثرات سے کہاں محفوظ رہ سکتی تھی۔ پنجاب کے لوک گیتوں میں آج بھی ترک لشکریوں کے 'اژد بزار' (اردو بازار یعنی فوجی چھاؤنی) سے نمودار ہونے کا ذکر آتا ہے۔ عوام کی زبان سے آج بھی 'اژدو' لگا دینا بمعنی لٹا دینا کا محاورہ سننے میں آتا ہے جو غالباً ترک لشکریوں کی لوٹ مار کی غمازی کر رہا ہے۔ اس طرح کتنے ہی ترکی الفاظ ہیں جو بہاری زبان میں شامل ہو کر ایسے شیر و شکر ہوئے ہیں کہ ان کی پہچان مشکل ہے۔ پھر بھی محققین ان کی کہوج لگانے میں مصروف ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہر نئی آنے والی قوم اپنے مخصوص ملبوسات، طعام، ظروف، اوزار، آلات حرب اور رشتوں، ناطوں کے نام اپنے ساتھ لے کر آتی ہے۔ نئی سرزمین ان اجنبی چیزوں کے نام بعض دفعہ جوں کے توں

اپنی اصلی صورت میں اور بعض دفعہ تبدیل شدہ صورت میں اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ یہی کچھ ترکوں کے وادیٰ سندھ میں ورود کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوا۔ آج کتنے ہی ترکی الفاظ ہماری روزمرہ کی زبان میں مروج ہیں جس کی چند ایک مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں :

- آلات حرب : توپ ، بندوق ، تفنگ ، چاقو
 جنگی اصطلاحات : یلغار ، یورش ، یرغمال ، ہراول ، بکاول ، تمغہ
 آلات اور ظروف : قینچی ، تسمہ ، طشت ، قاب ، چلمچی
 معاشرتی القابات : آغا ، آقا ، بیگ ، بیگم ، خان ، خانم ، خاتون ،
 باجی ، آنا ، بی بی ، انگہ ، اتالیق
 کھانوں کے نام : قورمہ ، قیمہ ، دولہ
 متفرقات : قاش ، قالین ، غالیچہ ، چوغہ ، چق ، ایلچی ، قزاق
 خچر وغیرہ

اسی طرح ذیل کے الفاظ کی اصل بھی قابل غور ہے :

شاگرد

بمعنی طالب علم ، سیکھنے والا وغیرہ۔

یہ لفظ ترکی الاصل ہے۔ قدیم ترکی میں حرم میں نئی نئی داخل ہونے والی کنیز کو شاگرد کے نام سے پکارا جاتا تھا یعنی اناڑی ، انجان لونڈی جسے ابھی حرم کے طور طریقے سیکھنا باقی ہوں۔ جب ترک لشکریوں کے ذریعے یہ لفظ برصغیر پاک و ہند میں داخل ہوا تو یہ ہر سیکھنے والے پر منطبق ہونے لگا۔ آخر انقلابات زمانہ کے ساتھ اس کا رشتہ تانیث آہستہ آہستہ حذف ہو گیا اور اب صرف تذکیر کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔

برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں میں مستعمل لفظ 'چاکر' (پنجابی چاک) بمعنی ملازم، خادم وغیرہ غالباً اسی لفظ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

باورچی

بمعنی کھانا پکانے والا ، خانساماں۔

یہ لفظ ترکی الاصل ہے۔ چنگیزخان اور اس کے جانشینوں کے دربار میں باورچی کا عہدہ بڑا اہم شمار کیا جاتا تھا جس کے سپرد منگولی

عسا کر کے لیے رسد وغیرہ کا انتظام ہوتا تھا۔ اسے ہم موجودہ دور کے کوائٹر ماسٹر جزل کے عہدے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ آئین چنگیزی میں بھی اس عہدے کا ذکر آتا ہے۔

جب نقل مکانی کر کے یہ لفظ وادی سندھ میں داخل ہوا تو بیچارے کی ہیئت کدائی ہی بدل گئی۔ آج جیسے خاکروب کے لیے مہتر اور حجام کے لیے خلیفہ کے القاب مستعمل ہیں اسی طرح کھانا بنانے والے خدمتگار کو 'باروچی' کا نام دے دیا گیا۔

عربی فارسی اصل کا مشترکہ عنصر

پاکستان اور ترکی کی زبانوں میں عربی فارسی الفاظ کی موجودگی بھی ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں ممالک میں شروع ہی سے عربی کو مذہبی زبان اور فارسی کو علم و ادب کی زبان کا درجہ حاصل رہا ہے اس لیے دونوں زبانوں کا یکساں طور پر ان زبانوں سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ اگر ان زبانوں میں عربی فارسی اصل کے الفاظ کا جائزہ لیں تو ان میں کم از کم نوے فی صد حد تک اشتراک نظر آتا ہے۔ ذیل میں صرف واؤ کی تختی سے چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ تلفظ کا اختلاف خطوط وحدانی میں ظاہر کیا گیا ہے :

وادی ، وحی ، وحشت ، وعظ ، وایت (وعدہ) ، واکا (واقعہ) ،
وکار (وقار) ، وقف ، واکیا (واقعہ) ، وکت (وقت) ، والی بمعنی گورنر (نیز
صوبہ دار) ، ورق ، واردات بمعنی آمدنی (آورد) ، وسط ، وصف ، واسطہ ،
وصی ، وصیت ، وطن ، واضح ، وظیفہ ، وبا ، وداع ، وفا ، وفات ،
وہم ، وکالت ، وکیل ، ولی ، ولولے (ولولہ) ، وراثت ، وثیقہ ، وزن ،
ولایت ، وشدان (وجدان) ، وبران ، وقوف بمعنی علم ، وصول ، وضو ،
وروت (ورود) ۔

بعض پاک ترکی الفاظ کی سرگزشت

ہاری زبان میں بعض ایسے الفاظ موجود ہیں جو کہ وادی سندھ میں پیدا ہوئے لیکن اوائل عمر ہی میں کوہ قاف کی حدود کو عبور

۱۔ ایسے ترکی الفاظ جو پاکستانی اصل سے تعلق رکھتے ہیں یا دونوں زبانوں میں یکساں طور پر مستعمل ہیں۔

کر کے وسط ایشیا کے مرغزاروں میں جا آباد ہوئے اور پھر چین کی سڈ سکندری سے لے کر سائبیریا کی برف پوش وادیوں تک سیر و سیاحت میں مصروف رہے۔ جوان ہونے پر جب ترکان جنگجو کے ہمرکاب اپنے وطن کو لوٹے تو ان کا چہرہ مہرہ اتنا بدل چکا تھا کہ اپنے وطن میں آنے کے بعد بھی ان پر بدیشی ہونے کی مہر ثبت رہی۔ ان الفاظ کے پس منظر میں تاریخ کی کتنی ہی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ آج ہم اس الف لیلوی داستان کے چند ایک بھولے بھٹکے اوراق پلٹنے کی کوشش کریں گے۔

داروغہ

بمعنی سپاہیوں کا افسر، محکمہ جیل کا ایک عہدے دار، فارسی سے اردو میں آیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لفظ براہ راست ترک لشکریوں کے ساتھ برصغیر میں وارد ہوا ہو۔ ماہر لسانیات جناب کاویل و سکی (Kovalevsky) کا خیال ہے کہ یہ منگولی زبان کا لفظ ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ یہ لفظ منگول لشکر کے ہمراہ ایران اور پھر برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوا۔ منگولوں کی اصطلاح میں کسی صوبے یا شہر کا حاکم داروغہ کہلاتا تھا۔ تیمور اور اس کے جانشینوں کے عہد میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ اکثر اعلیٰ پایہ کے سرکاری القابات اپنی اصلیت کھو کر گھٹیا درجے کے عہدے داروں یا خدمتگاروں کی طرف منسوب ہونے لگتے ہیں جیسا کہ ہم ابھی باورچی کی تشریح میں ذکر کر آئے ہیں۔ ولسن (Wilson) نے داروغہ کی تعریف یوں کی ہے :

”ہندوستان کی مقامی انتظامیہ میں ایک مہتمم، ناظم وغیرہ لیکن بعد ازاں محکمہ پولیس، محکمہ چونگی یا محکمہ آبکاری کا اعلیٰ عہدے دار۔“

۱۲۲۰ء میں ابو الغازی نے منگولوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا

ہے کہ :

”تلی خان نے برماس نامی شخص کو مرو کا داروغہ مقرر

کیا اور خود نیشا پور پر چڑھائی کر دی۔“

تاتاری عہد حکومت میں ماسکو کا منگول حاکم بھی داروغہ کہلاتا تھا۔ اس طرح ہم اس سے قبل علی یزدی کے 'ظفر نامہ' میں امیر تیمور کی فتوحات کے سلسلے میں پڑھ آئے ہیں کہ جن جاٹ قبائل سے اس کو واسطہ پڑا ان کا سردار داروغہ کہلاتا تھا۔

قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا اگر ہم تاریخ کے ورق پلٹیں تو چندرگپت موریہ کے عہد (۳۲۱ تا ۲۹۸ ق م) میں ہمیں شاہی دربار کے دو اعلیٰ عہدے دار اس نام سے ملتے جلتے ناموں سے منسوب نظر آتے ہیں یعنی :
(الف) دواریکا (Dauvarika) یہ محلات شاہی کے دروازے کا محافظ تھا۔ عوام کی معروضات اور درخواستیں اس کی وساطت سے ایوان شاہی تک پہنچتی تھیں۔ عام لفظوں میں اسے ڈیوڑھی افسر کہہ سکتے ہیں۔
(ب) دروگا پالا (Drugapala) حاکم قلعہ۔

یہ فیصلہ کرنا کچھ مشکل نظر آتا ہے کہ اگر داروغہ کی اصل ان دونوں الفاظ میں سے ایک کو تسلیم کیا جائے تو وہ کون سا لفظ ہے۔ اگرچہ بظاہر داروغہ کا لفظ دواریکا سے بڑی حد تک لگاؤ کھاتا ہے لیکن اگر اس لفظ کے قدیم استعمال کو مدنظر رکھا جائے تو دوسرا لفظ دروگا پال زیادہ صحیح نظر آتا ہے جس میں کثرت استعمال سے 'پال' علامت نسبتی حذف ہوگئی اور صرف 'دروگا' کا لفظ عوام کی زبان پر باقی رہ گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ لفظ برصغیر سے وسط ایشیا تک کیسے پہنچ گیا۔ اس کا جواب چینی ترکستان اور صحرائے گوبی میں مختلف مقامات سے دستیاب ہونے والے وہ کھنڈرات ہیں جو کہ کشن عہد کی یادگار ہیں۔

کوٹوال

موجودہ دور میں محکمہ پولیس کا ایک اعلیٰ عہدے دار، قدیم ترکی اور فارسی میں محافظ شہر اور محافظ قلعہ دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔

۱ - دوار (سنسکرت) بمعنی گھر یا دروازہ اور 'کا' علامت اضافی یعنی 'صاحب در'۔

۲ - دروگا (سنسکرت) بمعنی قلعہ اور 'پال' علامت نسبتی بمعنی والا یعنی قلعہ والا یا صاحب قلعہ، حاکم قلعہ۔

اس کے لفظی معنوں سے ظاہر ہے کہ یہ لفظ برصغیر پاک و ہند ہی سے تعلق رکھتا ہے -

کوٹوال

سنسکرت : کوٹ پال - کوٹ بمعنی قلعہ اور 'پال' علامت نسبتی بمعنی قلعے والا، حاکم قلعہ یا محافظ قلعہ -

وسط ایشیا میں اس لفظ کے کثرت استعمال سے متاثر ہو کر کئی اچھے اچھے ماہرین لغت بھی دھوکا کھا گئے ہیں - ویمبرے (Vambery) اور پیوٹ (Pavet) جیسے ثقہ حضرات نے بھی اسے ترکی الاصل قرار دیا ہے - ترکستان میں اس لفظ کا تلفظ کتؤل اور کتاؤل ہے لیکن وہاں بھی اس کے معنی محافظ قلعہ ہی کے لیے جاتے ہیں -

بیمہتی نے قریباً ۱۰۴۰ء میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے - وہ لکھتے ہیں کہ :

”بو علی کوٹوال (غزنی) معاملات سے نپٹنے کے بعد خلع کی مہم سے واپس ہوا -“

عبدالرزاق نے ۱۴۰۶ء میں تحریر کیا ہے کہ :

”انہوں نے اتر آباد کے شہر کی حفاظت کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد ابواللیث کو کوٹوال کا عہدہ دے کر وہاں کا حاکم مقرر کر دیا -“

بخارا کی مسلم حکومت کے عہد میں امیر بخارا کی عہدہ دارات کا منتظم کتؤل کے لقب سے پکارا جاتا تھا -

عہد غزنوی کے مشہور شاعر فردوسی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'شاہنامہ' میں اس لفظ کو ایسے بے ساختہ انداز میں استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ وہاں قدیم ہی سے رائج تھا اور اس زمانے میں فارسی زبان کا جزو لاینفک بن چکا تھا - ملاحظہ ہو :

چو آگاہ شد کوٹوال حصار

بر آویخت با رستم نامدار

تمخواہ

معنی مشاہرہ ، ماہانہ اجرت -

مغلیہ دور کے آخری عہد کی دستاویزات میں اس لفظ کا استعمال کسی جاگیر کی آمدنی کا کسی شخص کے نام لگا دینے کے معنوں میں ہوا ہے۔

بظاہر یہ تن اور خواہ کے مرکب کی حیثیت سے فارسی الاصل نظر آتا ہے۔ اہل ایران بھی اس نظریے کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اصل میں یہ تنکہ یا تنگہ کی مفرس صورت ہے۔ لیکن اس تنکہ اور تنگہ کی اصل کے بارے میں علماء میں بعد المشرقین کی حد تک اختلاف رائے موجود ہے۔ بعض اسے فارسی الاصل قرار دیتے ہیں۔ بعض وسط ایشیا اور روس کے علاقے میں اس کے وسیع استعمال کے پیش نظر اسے ترکی الاصل بیان کرتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کو بھی اس لفظ کا مہاجا و ماوا ہونے کا دعویٰ ہے۔ آج ہم ان تینوں دعاوی کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

’فرہنگ نفیسی‘ مطبوعہ تہران کے مؤلف ڈاکٹر علی اکبر نفیسی نے تنخواہ، تنکہ اور تنگہ کے الفاظ کو فارسی الاصل قرار دیتے ہوئے ان کے مندرجہ ذیل معنی دیے ہیں :

’تنخواہ : پول نقد و زر و مال و دولت و منفعت از اراضی و برأت بہ خزانہ برائے ادائے وظیفہ۔‘

اس سے اس کے لفظی معنی ’طلب جسم‘ یعنی ’محنت کا صلہ‘ کہیں ظاہر نہیں ہوتے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشاہرہ یا ماہانہ اجرت کے معنی اس لفظ سے بعد میں اخذ یا چسپاں کیے گئے۔

’تنگہ : پول نقد و زر و سیم و سکتہ‘ رائج و تنکہ‘

’تنکہ : پول رائج و قسمے از سکتہ‘

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ تینوں الفاظ ایک ہی لفظ کی بدلی ہوئی صورت ہیں اور تینوں سکتہ‘ رائج الوقت اور مال و دولت کے معنی دیتے ہیں۔

تنگہ نام کا چاندی کا سکتہ ایک وقت میں ترکستان کے تمام طول و عرض میں مروج تھا جو کہ قیمت میں تقریباً نصف روپے کے برابر تھا۔ اس کے وسیع استعمال کے پیش نظر مسٹر ارسکائن (W.Erskine) نے اسے چغتائی ترکی اصل بیان کیا ہے۔

۱۵۳۵ء کی بعض دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت روس میں 'دینگی' نام کا سکہ رائج تھا جو کہ قیمت کے لحاظ سے سو دینگی (Dengi) ایک روبل کے برابر شمار کیا جاتا تھا۔

۱۵۵۹ء میں ہربرسٹائن (Herberstein) اپنے روسی سفر نامے میں رقمطراز ہے کہ :

''ماسکو کا قدیم سکہ گول نہیں ہے بلکہ بیضوی شکل کا ہے اور دینگہ (Denga) کہلاتا ہے۔''

۱۸۷۶ء کے ایک سفر نامے میں یوں مرقوم ہے :

''مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرانی ہوئی کہ روسی سکہ دینگی یا دینگہ تمام وسط ایشیا میں تنگہ کے نام سے رائج ہے جو کہ ہر جگہ قیمت میں بیس کوپک کے برابر ہے۔''

ماہر زبان مغول مسٹر پیوٹ (Pavet De Courteille) نے اپنی لغت میں تنگہ کے ذیل میں تحریر کیا ہے :

''ایک مضروب سکہ۔ اس کی اصل سنسکرت کا لفظ 'ٹنکہ' ہے۔ جو چار ماشے کے برابر چاندی کے وزن کو کہتے ہیں۔''

حقیقت میں تنگہ، ٹنکہ یا ٹکے کے الفاظ ہر صغیر کی مختلف زبانوں میں آج بھی مال و دولت یا سکتے کے معنوں میں مستعمل ہیں۔ منڈا حلقے کی زبانوں سنتھالی، کولی، کوڈا اور ساورا وغیرہ میں اس کا تلفظ تنگہ ہے اور سکتہ و دولت کے معنی دیتا ہے۔ آسام کے ناگا قبائل کی زبان کچھاری میں مال و دولت اور سکتہ کے لیے 'تھاکا' کا لفظ مستعمل ہے۔ بنگال میں روپے کو 'ٹاکا' کہتے ہیں۔ مغربی پاکستان میں گو دو پیسے یا دو پیسے کے سکتے کو 'ٹکے' کہتے ہیں لیکن یہ روپیہ اور تنخواہ کے معنوں میں بھی مستعمل ہے جیسے کہ پنجابی روزمرہ میں تنخواہ لینے کو ٹکے لینا اور قیمت وصول کرنے کو ٹکے کھرے کرنا کہتے ہیں۔ پنجاب میں اشرفیوں کے ہار کو تگہ ہار یا صرف تگہ کہتے ہیں بمعنی ٹکوں کا ہار۔

ماضی میں تنکہ نہ صرف بطور سکتے ہی کے مستعمل رہا ہے بلکہ اکثر وزن اور پیمائش کی اکائی بھی شمار ہوتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر:

چھٹانک (ایک وزن، سیر کا سولہواں حصہ) حقیقت میں چھ ٹنکہ ہے۔ اسی طرح عہد اکبری میں الہی گز کا طول $\frac{1}{4}$ م (ساڑھے اکتالیس) سکندری تنگہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ اگرچہ عام طور پر تنگہ ایک چاندی کا سکتا تھا لیکن بعض زمانوں میں سونے کا تنگہ بھی مروج رہا ہے جو طلائی تنگہ کہلاتا تھا۔ بعض دفعہ تانبے کے کم قیمت کے سکتے کو تنگہ سیاہ کے نام سے پکارتے تھے۔

اس امر کے باور کر لینے کے لیے کافی وجوہ موجود ہیں کہ تنگہ کے نام کا سکتہ وادی سندھ میں قدیم ہی سے رائج تھا اور کشن عہد میں یہاں سے نو آبادکاروں کے ہمراہ وسط ایشیا کے میدانوں میں پہنچ گیا اور یہاں سے روس اور ترکستان کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ جب محمود غزنوی نے پنجاب پر قبضہ کیا ہے تو اپنے نام کے جو سکتے اس نے لاہور کی ٹکسال میں ۲۸ - ۱۰۲۷ء میں ڈھالے ان کے سامنے کی طرف عربی رسم الخط استعمال کیا ہے اور قیمت درہم میں درج ہے۔ ان کی پشت پر سنسکرت رسم الخط استعمال کیا ہے اور قیمت تنگوں میں دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت وادی سندھ میں تنگہ رائج الوقت سکتے کے طور پر مستعمل تھا۔ دوسرا اس وقت استعمال ہونے والا لفظ ٹکسال بھی اس کی گواہی دے رہا ہے جو کہ حقیقت میں ٹنکہ شالہ بمعنی سکتہ گاہ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

عہد غزنوی سے لے کر آج تک یہ سکتہ مختلف صورتوں میں لگا تار مروج رہا ہے۔ ابن بطوطہ نے عہد تغلق کے عہد (۱۳۳۲ تا ۱۳۴۳ء) میں تنکہ یا سونے کے دینار کا تذکرہ کیا ہے۔ مسالک الابصار (۱۳۴۰ء) کے مصنف نے بھی چاندی کے ٹنکے کا ہند میں مروج ہونے کا ذکر کیا ہے۔ سکندر بہلول (۱۳۸۸ تا ۱۵۱۷ء) کے عہد میں علاوہ چاندی کے تنکے کے تانبے کا تنکہ بھی مروج تھا جو تنکہ سیاہ کے نام سے موسوم تھا اور قیمت میں چاندی کے تنکے کا بیسواں حصہ شمار ہوتا تھا۔ گرونانک (۱۳۶۹ تا ۱۵۳۸ء) نے بھی اپنے کلام میں اس سکتے کا ذکر کیا ہے جیسے کہ:

”لکھ ٹکیاں کے مندڑے لکھ ٹکیاں کے ہار۔“ (آسادی وار)

۱۔ مندڑے بمعنی کانوں کا زیور۔

مغلیہ عہد میں یہ سکتے، مروج رہا۔ اس کے بعد جب مغربی اقوام یہاں وارد ہوتی ہیں تو سب سے پہلے پرتگیزیوں نے تانبے کا ٹکے رائج کیا جو قیمت میں دو آنے کے سکتے کے برابر تھا۔ انگریزوں نے آدھ آنے کے سکتے کو ٹکے کا نام دے دیا۔ اب ٹیڈی پیسوں نے آکر ٹکے کے طویل دور حکومت کا خاتمہ کر دیا ہے۔

بہادر

بمعنی دلیر۔ اس کی اصل کے بارے میں بھی کافی اختلاف رائے موجود ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ لفظ ترکی الاصل ہے۔ حقیقت میں اس کا استعمال سب سے پہلے تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں چنگیزی لشکر کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے۔ غالباً منگول لشکریوں کے ذریعے ہی یہ لفظ نہ صرف وسط ایشیا میں رواج پا گیا بلکہ ایک طرف مشرقی ایشیا اور دوسری طرف وسط یورپ تک جا پہنچا۔

چنگیز خان کا باپ یسوگائی بہادر کے نام سے موسوم تھا۔ چنگیز خان کے ایک مشہور سپہ سالار کا نام بھی سوطائی بہادر تھا۔ منگولی زبان میں اس کا صحیح تلفظ باگھاتر (Baghtur) ہے۔ روسی زبان میں اس کا تلفظ بوگاتر اور پولستانی میں بوہیتر ہے۔ ہنگری میں اس کا تلفظ باتور، ترکی میں باتر، مانچو میں باترو، کرگیزی میں بیتر اور چینی میں پاتولو ہے۔

ماہر سنسکرت مسٹر بینفے (Benfey) کا خیال ہے کہ لفظ بہادر کی اصل سنسکرت کا لفظ بھاگ دھارا بمعنی صاحب قسمت یعنی خوش قسمت ہے۔ لیکن اس بارے میں جرمن پروفیسر شیفنےر (A. Schiefner) کی رائے کو ترجیح حاصل ہے جس کی رو سے اس کی اصل ژند کے لفظ بھاگ پتھرا بمعنی خدا کا بیٹا ہے۔ یہ تلفظ منگولی لفظ باگھاتر سے بھی لگاؤ کھاتا ہے۔ کشمیر کے کھشتری ہندوؤں کی ایک گوت بگھوترا بھی ہے (جموں مقبوضہ کشمیر کے ایڈیشنل مجسٹریٹ کا نام ہرنس لال بگھوترا ہے)۔ معلوم نہیں کہ آیا اس کے اور پنجاب کے جاٹوں کی ایک گوت 'بٹر' کا منگولی کے باگھاتر اور بوترا وغیرہ سے کوئی رشتہ ہے یا نہیں۔

بہرحال اس کی اصل کچھ بھی ہو لیکن بہادر کا لفظ برصغیر میں ترک لشکریوں کے ہمراہ ہی وارد ہوا ہے۔

شغال

گیڈر ، ایک جانور کا نام - فارسی سے مستعار شدہ لیکن فارسی میں یہ لفظ کہاں سے آیا ؟ اس بارے میں عام طور پر دو مختلف رائیں موجود ہیں - بعض کے نزدیک اس کی اصل ترکی کا لفظ شکل بمعنی گیڈر اور بعض کا خیال ہے کہ اس کا مأخذ سنسکرت کا لفظ شرگال ہے - پالی میں گیڈر کے لیے سگال (Sigāla) کا لفظ مستعمل ہے -

برصغیر کے ناگا قبائل کی بعض زبانوں میں بھی گیڈر کے لیے شغال سے ملتے جلتے الفاظ ملتے ہیں حالانکہ الگ تہاگ آباد ہونے کی وجہ سے ان قبائل نے ہندو تہذیب یا سنسکرت زبان سے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا - دوسری طرف ہم اس سے قبل بعض مثالوں کی روشنی میں دیکھ آئے ہیں کہ ناگا قبائل کی زبانوں اور تبتی، منگولی و ترکی زبانوں میں کسی حد تک رشتہ موجود ہے - آسام کے ناگا قبائل کی زبان موران میں گیڈر کو چنگالی ، کچھاری میں سئیل اور بوڈو میں سیال کہتے ہیں جو کہ ترکی کے لفظ شکل سے لگاؤ کھاتے ہیں -

اغلب یہی ہے کہ شغال کا لفظ ترکی سے فارسی میں آیا اور فارسی سے اردو میں - ترکی میں یہ لفظ وسط ایشیا کے پاکستانی نو آبادکاروں کی وساطت سے آیا - اس پہلو میں پالی کا لفظ سگال خاص طور پر قابل غور ہے -

شلوار

ایک مشہور لباس کا نام - عربی فارسی اور ترکی بلکہ بعض مغربی زبانوں میں بھی یہ لفظ مختلف صورتوں میں موجود ہے - لیکن برصغیر میں اس لفظ کی ہیئت کو مدنظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ یا تو فارسی سے وارد ہوا یا پھر ترک قبائل کے ہمراہ آیا - بہر حال یہ امر متنازع فیہ مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے - لیکن اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں -

اگر رائے شہاری کی جائے تو دنیا کے مختلف حصوں میں جتنے لوگ اس لباس کے نام سے واقف ہیں غالباً کسی اور لباس کو نہیں جانتے - مراکش سے لے کر ملائیشیا تک اور سائبیریا سے لے کر زنجبار تک زیر

جامہ کے لیے اس لفظ کا استعمال موجود ہے۔ دوسری طرف قدامت کے لحاظ سے بھی یہ لفظ طویل عمر کا حامل ہے۔ سب سے اولین دستاویزی ثبوت کے مطابق دوسری صدی عیسوی میں یونانی تحریروں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

اس کے مأخذ کے بارے میں مختلف توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ مشہور مستشرق میکس مولر کا خیال ہے کہ یہ فارسی شل بمعنی ٹانگ اور وار بمعنی والا یعنی ٹانگوں کا لباس سے مشتق ہے۔ لیکن عربی زبان میں بھی یہ بہت قدیم سے مستعمل ہے۔ جہاں اس کا تلفظ 'سروال' اور 'شروال' ہے۔ قدیم یونانی زبان کی انجیل میں کتاب دانیال میں اس کے لیے 'شربار' کا لفظ ملتا ہے۔ سینٹ جیروم (۳۴۵ تا ۴۲۰ء) کی تحریروں میں اس کا تلفظ 'سربال' کیا گیا ہے۔

مغربی ایشیا کے تاتاری قبائل میں یہ لباس 'جلبار' اور سائبیریا اور باشگیر قبائل میں 'سلبار' کے نام سے موسوم ہے۔ کاموک قبائل میں اسے شلبور اور روسی زبان میں 'شرواری' کہتے ہیں۔

قدیم یونانی زبان کی انجیل کے ترجموں کی بدولت یہ لفظ یورپ کی بعض زبانوں میں بھی جگہ پا گیا جہاں اس کے لیے زرگول، زرلو، سر بولا اور سربیلہ قسم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

۱۰۰۰ء کے لگ بھگ سوئڈس (Suidas) کے حوالے سے یہ فقرہ

درج ہے :

”یونان میں اس اجنبی لباس (یعنی شلوار) کو بعض زربار (Zarabara) کہتے ہیں اور بعض بریکیا (یعنی برجس کا پیشرو لفظ)۔“

۱۴۹۵ء میں علامہ سیوطی^۲ شلوار کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :

”سب سے پہلے جس نے سراول کا لباس زیب تن کیا وہ حضرت سلیمان^۳ (قریباً ۹۷۳ تا ۹۳۳ ق م) تھے۔ بعض احادیث کی رو سے اس پہلو میں حضرت ابراہیم^۴ (قریباً ۲۱۰۰ ق م) کو سبقت حاصل ہے۔“

مشہور روسی افسانہ نگار فیدور دوستووسکی (Dostoyevsky)

سائبیریا میں اپنے ایام جلا وطنی کی یادداشت (مطبوعہ ۱۸۸۱ء) میں ذکر کرتا ہے کہ :

”میں شرفاء کی طرح سرخ رنگ کی قمیض اور مخمل کی شرواری زیب تن کر کے صوفے پر دراز ہو جاتا اور سویڈی امراء کی طرح بادہ نوشی کرتا۔“

کرافورڈ اپنے سفر نامے میں ملایا کے لباس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :

”ملایا کے لوگ سارنگ (تہبند کی قسم کا ایک لباس) کے نیچے ایک پاجامہ استعمال کرتے ہیں جسے وہ سروال کہتے ہیں۔“

بھارت دیش میں گو آج اسلامی تہذیب کی ہر یادگار گردن زدنی تصور کی جاتی ہے پھر بھی محترمہ شیلا شکدہ پیر نے اپنے ایک مراسلے (اسٹیٹسمن ، ۱۸ اگست ۱۹۶۳ء) میں شلوار کے خلاف پرچار کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ :

”فی زمانہ ہارے لیے شلوار قمیض نہایت ہی موزوں لباس ہے۔ خاص کر کارکن لڑکیوں کے لیے تو یہ نہایت ضروری ہے۔ ساڑھی کی نسبت اس لباس کے ساتھ دوڑنا ، تیز چلنا اور برق رفتار بسوں پر جلدی میں سوار ہونا زیادہ آسان ہے۔ کام کرتے وقت یہ کارکردگی میں اضافے کا باعث ہے کیونکہ ساڑھی کے ساتھ اس کے ڈھلکتے ہوئے دامن کو بار بار سنبھالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔“

وادی سندھ کی زبان پر یونانی اثرات

”پنجاب ایک ایسا صوبہ ہے جہاں کہہ وادی سندھ کے قدیم باشندوں اور آریائی قبائل نیز یونانی، عرب و تاتاری اور افغان اقوام کی انفرادی خصوصیات اور ان کے باہمی تعلقات کا مطالعہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ ان اقوام نے اپنے پیچھے ایک ایسا مالا جلا ورثہ چھوڑا ہے جس میں ہر ایک عنصر کی خصوصی روایات اور طرز معاشرت اسی طرح سے محفوظ ہیں جیسے کہ ایک عجائب گھر کے مخصوص حصوں میں تاریخی نوادرات۔“ (رامزے میور)

تاریخ کا ہر عہد جہاں تہذیب و تمدن کے دوسرے شعبوں کے ساتھ زبان پر بھی اپنے مخصوص اثرات چھوڑ جاتا ہے وہاں ہر زمانے میں بدلتے ہوئے ماحول کے زیر اثر کتنے ہی پرانے الفاظ متروک ہو جاتے ہیں اور کتنے نئے الفاظ زبان زد عام ہو جاتے ہیں۔ زبان کے دامن میں پڑے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ آریاؤں کے باغ کی نشانی ہے اور یہ گلشن یونان کی یادگار، وہ پھول چمنستان ایران سے چنا گیا ہے اور یہ پھول عرب کے نخلستان سے حاصل ہوا ہے۔ آج ہم گلشن یونان سے چنے ہوئے پھولوں کا مختصر سا جائزہ لیں گے۔ اگرچہ ان کی رنگت کافی حد تک بدل چکی ہے لیکن سرزمین یونان کی مخصوص خوشبو ان میں اب بھی بسی ہوئی ہے جسے ہم دوسرے پھولوں سے متمیز کر سکتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ سکندر اعظم آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا۔ لیکن سکندر ایک فوج کا سپہ سالار ہی نہیں ایک نئے عہد کا پیشرو بھی تھا۔ اس کی ضرب کاری سے شرق و غرب کے درمیان اجنبیت کی سدا سکندری پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ اس کے نصب کردہ سنگ میلوں کے سہارے کتنے ہی نئے مہم بازوں نے سرزمین ہند کا دروازہ

آکھٹکھٹایا اور اس طرح یہاں ہند یونانی حکمرانوں کے عہد کی داغ بیل ڈال دی۔ نتیجہً یہاں ایک ایسی نئی تہذیب نے جنم لیا جو کہ شرق و غرب کی مشترک روایات کی حامل تھی اور دونوں کے علم و فن کے امتزاج کا حسین نمونہ۔ اس عہد میں وادی سندھ کی زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس دور میں بہاری زبان بالکل ایک نئے سانچے میں ڈھل گئی۔ ہاں اس عہد میں پیدا ہونے والی لسانی تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سکندر کی آمد

سکندر اعظم نے وادی سندھ میں مختصر سے قیام (۳۲۶ ق م) کے دوران یہاں چند ایک نئی جھاؤنیوں کی بنیاد رکھی جہاں یونانی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کو آباد کر دیا۔ نیز اپنے مقرر کردہ صوبہ داروں کی معیت میں یونانی حفاظتی دستے تعینات کیے۔ لازماً یہ یونانی آپس میں اپنی مادری زبان ہی میں بات چیت کرتے ہوں گے لیکن جہاں تک مقامی آبادی سے راہ و رسم کا تعلق ہے اس کے لیے انہیں علاوہ اشاروں اور کنایوں کے کسی حد تک مقامی زبان سیکھنی پڑی ہوگی۔ نیز وہ طبقہ جن کا شب و روز یونانیوں سے واسطہ پڑتا ہو گا کئی ایک یونانی الفاظ سے بھی واقف ہو گیا ہوگا۔ لیکن سکندر کے آنکھیں بند کرتے ہی وادی سندھ میں یونانی باللاستی ختم ہو گئی اور چندر گپت موریہ نے ایک نئی حکومت کی داغ بیل ڈال دی۔ اس طرح اس وقت یونانی زبان بھی سیاسی طور پر قریب قریب ختم ہو گئی۔ اس لیے اس دور کو لسانیاتی لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

۱۹۵ ق م میں دیمتریوس (Demetrius) کے حملے سے لے کر ۱۸۵ ق م میں ہرمیئوس (Hermios) کی حکومت کے خاتمے یعنی اڑھائی سو سال کے عرصے تک یونانیوں کی سیاسی بالا دستی کے ساتھ ساتھ یونانی زبان کو بھی حکمرانوں کی زبان ہونے کی حیثیت حاصل رہی۔ ہند یونانی عہد میں درباری اور سرکاری کاروبار کے لیے یونانی اور مقامی دونوں زبانیں مستعمل تھیں جس کا اندازہ ہم اس عہد کے سکٹوں کی تحریروں سے لگا سکتے ہیں جن کے ایک طرف یونانی زبان یونانی حروف ابجد میں اور دوسری طرف مقامی زبان خروشتی رسم الخط میں کندہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یونانی نسل

کے حکمرانوں نے روز مرہ کا کام چلانے کے لیے مقامی زبانیں سیکھنے کی کوشش کی ہوگی لیکن دربار اور سرکار میں جو درجہ حاکموں کی زبان کو حاصل ہوتا ہے وہ مقامی زبانوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہاں ہندو عہد میں گو عوام کی زبان مختلف پراکرتوں پر مشتمل تھی لیکن شاہی دربار میں سنسکرت کا طوطی بولتا تھا۔ مسلمان آئے تو عربی فارسی کی قدر ہونے لگی اور کتنے ہی برہمن بھی دربار میں عزت حاصل کرنے کے لیے ان زبانوں کے ودوان بن گئے۔ انگریز آئے تو انگریزی زبان کا پرچم لہرانے لگا اور ہر کہ و ما نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کمر باندھ لی۔ علماء تو ایک طرف دیہات کے ناخواندہ عوام کی زبان سے بھی روز مرہ کی بات چیت میں انگریزی زبان کے بگڑے ہوئے الفاظ سنائی دینے لگے جیسے کہ:

”فس کلاس، ٹائم، نمبر، فنڈ، ووٹ، ممبر، ٹمپریلی، اسکول، اسٹام، ہوٹل، ٹکٹ، ہسپتال، سینما، اسٹیشن وغیرہ وغیرہ۔“

اگر اس قسم کے الفاظ کو جمع کیا جائے تو ایک اچھی خاصی فرہنگ تیار ہو سکتی ہے۔

یونانی زبان کا دور دورہ

یونانی زبان کی داستان ہند یونانی شہزادوں کی حکومت کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں یا تو یہ زبان عوام میں اتنی زیادہ مقبول ہو چکی تھی کہ آنے والے حکمران بھی اسے ختم نہ کر سکے یا پھر اس نے سرکاری کاروبار پر اتنا گہرا تسلط جا لیا تھا کہ بعد میں اسے قائم رکھے بغیر کوئی اور چارہ کار نظر نہ آیا۔ کشن عہد ۱۴۰ تا ۳۶۰ء میں سکٹوں پر خروشتی اور براہمی کے ساتھ ساتھ یونانی تحریر بھی استعمال ہوتی رہی۔ سابق شہال مغربی سرحدی صوبے کے دور دراز علاقوں سے بعض ایسے قیمتی پتھروں کے نگینے دستیاب ہوئے ہیں جن پر یونانی دیومالا کے کردار منقش ہیں اور ان پر یونانی عبارت کندہ ہے۔ اسی طرح ایسی پتھر کی لوحیں بھی دستیاب ہوئی ہیں جن پر یونانی عبارت مرقوم ہے۔ یہ لوحیں پشاور اور لاہور کے عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔

ختن اور چینی ترکستان کی کھدائیوں کے دوران جو اشیاء دستیاب ہوئی ہیں ان میں علاوہ سنسکرت خروشتی اور براہمی زبان کی تحریروں کے یونانی زبان کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ محققین کی رائے ہے کہ یہ تحریریں گپتا خاندان کے عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔ یقیناً وادی سندھ کے نو آبادکار نقل مکانی کرتے وقت یہ زبانیں اور رسم الخط اپنے ساتھ لیتے گئے ہوں گے۔ روسی ماہرین کی ایک رپورٹ کے مطابق اس علاقے میں آج بھی ایسے قبائل آباد ہیں جو کہ وادی سندھ کی موجودہ زبانوں سے ملتی جاتی زبان استعمال کرتے ہیں۔

اس طرح وادی سندھ میں یونانی زبان کا دور پانچ ساڑھے پانچ سو سال کے طویل عرصے تک جا پہنچتا ہے۔ کیا یہ ممکنات میں سے ہے کہ اس طویل عرصے میں یونانی زبان نے مقامی زبانوں کو بالکل متاثر نہ کیا ہو؟ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ دو دھارے ایک ہی راستے پر چلیں اور آپس میں نہ ملیں۔ دو تہذیبیں ایک ہی سر زمین میں پرورش پائیں اور ایک دوسری سے متاثر نہ ہوں؟

یقیناً اس عہد میں کتنے ہی یونانی الفاظ یہاں کی روزمرہ کی زبان میں شامل ہو گئے ہوں گے۔ ان میں سے کچھ تو مرور زمانہ کے ساتھ زبان سے متروک ہو گئے۔ پھر بھی کچھ الفاظ ضرور ایسے ہوں گے جو ہاری زبان کا ایک حصہ بن گئے۔ آج ان کی شکل کچھ ایسی بدل چکی ہے اور گھس پٹ کر ہاری زبان میں اس طرح ڈھل چکے ہیں کہ ان کا پہچاننا مشکل ہے۔ اب ان پر غیریت کا گمان تک نہیں ہوتا۔ پھر بھی اگر کوشش کی جائے تو ان الفاظ کی پہچان کرنا ناممکنات میں سے نہیں۔

یونانی اور پنجابی کا باہمی رشتہ ناٹھ

یہاں اس امر کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ وادی سندھ میں چار قسم کے یونانی الاصل الفاظ ملتے ہیں: اول وہ الفاظ جو آریائی زبانوں کا مشترکہ سرمایہ ہونے کی حیثیت سے سنسکرت اور یونانی دونوں میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ مقامی زبانوں میں یہ یونانی سے نہیں بلکہ سنسکرت سے آئے ہیں۔ دوسرے وہ الفاظ جو عربی اور

فارسی کی راہ سے وادیٰ سندھ میں وارد ہوئے۔ تیسری قسم کے وہ یونانی الفاظ ہیں جو مغربی زبانوں خاص کر انگریزی کے ذریعے بہاری زبان میں داخل ہوئے۔ چوتھے وہ الفاظ ہیں جو ہند یونانی عہد یا اس کے بعد براہ راست یونانی زبان سے منتقل ہو کر بہاری زبان کا ایک حصہ بن گئے۔

یونانی الفاظ قافلہٴ افرنگ کے ہمراہ

سب سے پہلے ہم ان الفاظ کا ذکر کرتے ہیں جو مغربی اقوام کے ذریعے بہاری زبان میں آئے۔ سائنس، انجینیری اور ڈاکٹری کی اصطلاحات تو زیادہ تر یونانی الفاظ ہی پر مشتمل ہیں اگر ان کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ یہاں مشتے از خروارے کے مصداق صرف چند ایک الفاظ قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں جیسے کہ:

’اسکول، اکادمی، کیمبرہ، ڈراما، تھیٹر، کلرک، گراموفون،
فوٹوگراف، ٹیلیگراف، ٹیلیفون، کارڈ، کیلنڈر، گرامر،
جغرافیہ، جیومیٹری، پتلون، پالیسی، ڈیموکریسی، پروگرام
اور ایٹم وغیرہ۔‘

عرب و یونان کے تعلقات

اب ہم ان یونانی الفاظ کا ذکر کرتے ہیں جو عربی زبان کے ذریعے اردو اور پنجابی میں وارد ہوئے۔ عربوں اور یونانیوں کے تعلقات کا تذکرہ بذات خود ایک طویل داستان ہے۔ عرب اور یونان جغرافیائی لحاظ سے ایک حد تک پڑوسیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں عرب اسی شاہراہ پر آباد تھے جہاں سے یونانی جہاز ران شب و روز گزرتے تھے۔ بدھ مذہب کی کتاب ’مسائل‘ میں مینیٹر کے عہد (۱۵۵ تا ۱۴۰ ق م) میں یونانیوں کے ساتھ ساتھ عرب جہاز رانوں اور تاجروں کا وادیٰ سندھ کے شہروں میں موجود ہونا مذکور ہے۔ اس کی تائید پہلی صدی عیسوی کے مشہور بحری سفر نامہ ’بحیرہ قلزم کی سیر‘ (Periplus) سے بھی ہوتی ہے جس میں کئی جگہ تجارت پیشہ اور جہاز ران عربوں کا ذکر آتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت حضور کے ماموں تجارت کی غرض سے ’ملک چین گئے ہوئے تھے جہاں اس وقت

عرب تاجروں کی ایک چھوٹی سی بستی موجود تھی - 'چین میں سب سے پہلی مسجد کانٹن میں ۶۲۷ء میں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پانچ سال قبل تعمیر ہوئی تھی -'

('چین میں اسلام' از یانگ ایوجان)

بلکہ ایک تاریخ دان نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ :
 'چند عرب جہاز ۳۰۰ء میں کانٹن اور ہانگ چاؤ کی بندرگاہوں پر پہنچے -'

'سر زمین ایشیا اور اس کے لوگ' از
 جی - بی - کریسی (G.B. Cressey)

جنوبی ہند میں بھی زمانہ قدیم ہی سے عربوں کی آمد و رفت کا پتہ چلتا ہے - خاص کر وہاں پہلی صدی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری سینٹ ٹامس کی آمد اور وہاں پر شامی عیسائیوں اور یہودیوں کا ازمنہ قدیم ہی سے موجود ہونا اس امر کا بین ثبوت ہے -

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی عرب قافلے تجارت کی غرض سے ملک شام کا سفر کرتے تھے - خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی بعثت سے قبل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال لے کر ان قافلوں کے ہمراہ تجارت کی غرض سے جاتے تھے - اگرچہ ان دنوں شام اور اس سے ملحقہ علاقے رومن سلطنت میں شامل تھے لیکن وہاں کی فضا یونانی تہذیب و تمدن سے گہرے طور پر متاثر تھی - ان حالات میں بعض یونانی اور لاطینی الفاظ کا عربی زبان میں شامل ہو جانا بعید از قیاس نہیں - نیز اپنے عروج کے زمانے میں جب عرب دانشور یونانی علم و حکمت کی کتابوں کا ترجمہ کر رہے تھے تو انہوں نے بعض یونانی الفاظ کو جو ان کی توں اپنی اصل شکل میں رہنے دیا - ذیل میں ایسے یونانی الفاظ کی مختصر سی فہرست دی جاتی ہے جو کہ عربی کے ذریعے اردو اور پنجابی میں داخل ہوئے :

۱ - یونانی الفاظ میں آخری 'س' (S) کی آواز عام طور پر ساقط ہو جاتی ہے - اس لیے یہاں اور اس مضمون میں آئندہ بھی تلفظ بیان کرتے وقت اسے حذف کر دیا گیا ہے - لیکن بعض اسانے ذات میں یہ 'س' کی آواز بدستور قائم رہتی ہے جیسے کہ ککنوس اور پھانوس وغیرہ میں -

پنجابی	اردو	عربی	یونانی	یونانی الفاظ کے معنی
کنون	قانون	قانون	کانون Kanun	قانون ، چھڑی
دپھتر	دفتر	دفتر	دپھتھرا Thephthera	باریک کاغذ یا جھلی جو کہ زمانہ قدیم میں لکھنے کے کام آتی تھی -
دم	دام	درہم	درہم Drachma	ایک یونانی سکہ اور وزن کا نام
—	قیراط	قیراط	کیراتیئن Keration	ایک وزن (قریباً دس رتی کے قریب)
—	قرن	قرن	خرانو Khronos	زمانہ
—	اجنبی	اجنب	زینو Zenos	غریب الوطن ، اجنبی
صوفی	صوفی	صوفی	سوفو Sophos	دانشور ، عقلمند (کہہ نہیں سکتے کہ آیا یہ لفظ عربی کے ذریعے آیا یا فارسی کے)
—	شاب	شاب	ہیب Hebe	جوان
—	سیف	سیف	زیفو Xiphos	تلوار
—	زراعت	زرع	اگرو Agros	کھیت (’گ‘ کا ’ز‘ یا ’ج‘ سے تبادل عام ہے)
بلغم	بلغم	بلغم	پہلگم Phlegam	بلغم
جراح	جراح	الجراح	چیرو Cheiro	ہاتھ کا کام کرنے والا ، چیر پھاڑ کرنے والا
کیمیا	کیمیا	الکیمیا	کیمیا Chemeia	کیمیا

پنجابی	اردو	عربی	یونانی	یونانی الفاظ کے معنی
اکسیر	اکسیر	الاکسیر	کسیران Xeron	سفوف ، دوائی
تریاق	تریاق	تریاق	تھریاک Theriake	سانپ اور دوسرے زہریلے جانوروں کے کاٹے کی دوائی
قولنج	قولنج	قولنج	کالیکو Kolikos	بڑی آنت کا کاردرد یونانی کالون (Kolon) بمعنی بڑی آنت سے مشتق ایک قسم کی سخت لکڑی
آبنوس	آبنوس	آبنوس	ایبنوس Ebenos	اجرام فلکی کے ارتفاع وغیرہ معلوم کرنے کا آلہ
—	اسطرلاب	اسطرلاب	اسٹرولابن Astrolabon	یہودیوں اور مشرقی عیسائیوں کے گلے میں پہننے کی مالا
—	زنتار	زنتار	زوناریون Zonarion	جادو
—	طلسم	طلسم	تلسما Telesmos	اکٹھے ہونے کی جگہ ، گرجا
—	کایسہ	کایسہ	اکیسیا Ekklesia	مقبرہ
تبوت	تابوت	تابوت	تاہو Tophos	مردے رکھنے کے لیے صندوق یا ٹوکرا
کفن	کفن	کفن	کوپھینو Kophinos	

وٹوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا عربی کے لفظ 'حجج' اور یونانی حاجیو (Hagios) بمعنی مقدس ، متبرک میں کوئی رشتہ ہے یا نہیں ۔ اسی طرح عربی 'یا جوج' سے یونانی جیجا (Gigas) بمعنی دیو قامت ، عظیم الجثہ کی طرف خیال جاتا ہے ۔ عربی کعب بمعنی شش پہلو نیز پانسہ بھی یونانی کوہو (Kubos) بمعنی شش پہلو اور پانسہ سے مشتق ہے ۔

ایران اور یونان

اگرچہ لسانی لحاظ سے ایرانی اور یونانی آریائی گروہ کی دو بڑی شاخیں ہیں اور جغرافیائی لحاظ سے بھی ایران اور یونان ایک دوسرے کے پڑوس میں واقع ہیں لیکن قدرت کی مہم ظریفی دیکھیے کہ یہ دونوں بھائی ہمیشہ آپس میں برسر پیکار رہے۔ ان کی باہمی چپقلش تاریخ عالم کا ایک اہم باب ہے۔ سکندر یونانی کے حملے کے بعد خانوادہ سیلوکس کو ایک عرصے تک سر زمین ایران پر بالا دستی حاصل رہی۔ اس سے جہاں زندگی کے دیگر شعبے متاثر ہوئے وہاں زبان کے معاملے میں بھی باہمی لین دین کا ثبوت ملتا ہے جیسے کہ :

پنجابی	اردو	فارسی	یونانی	یونانی الفاظ کے معنی
—	ناؤ	ناؤ	ناؤ Navos	کشتی
—	موسیقی	موسیقی	موشیکا Moushikos	موسیقی
—	قننس	قننس	ککنوس Kuknos	ہنس
—	زمرد	زمرد	زمرد Smargdos	ایک قیمتی پتھر
فلوس	فانوس	فانوس	پھانوس Phanos	چراغ ، چمکدار
—	کلید	کلید	کلیدو Kleidos	چابی
خربوزہ	خوبوز	خربز	کرپوس Karpos	پھل

ہند آریائی ورثہ

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ یونانی اور سنسکرت دونوں ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ گو یہ قصہ ابھی تک زیر بحث ہی ہے کہ آیا ان کی اصل وسط ایشیا ہے یا مرکزی یورپ یا ان کا آبائی وطن بحر منجمد شمالی تھا یا شمال مشرقی یورپ۔ بہر حال یہ قبیلہ شروع میں کسی ایک ہی چراگاہ میں آباد تھا۔ وہاں اچانک کسی وجہ سے سب نے جلاوطن ہونے کی ٹھان لی یا پھر کسی دوسرے طاقتور قبیلے نے ان کے آبائی

وطن پر قبضہ کر کے انہیں باہر دھکیل دیا۔ اس پر انہوں نے اپنی اپنی بھینٹ بکریاں اور گھوڑے سنبھالے اور جدھر کو منہ آیا اٹھ کر چل دیے۔ نئے دیشوں کے نئے ماحول سے لب و لہجے میں تبدیلی آگئی۔ مقامی لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے زبان بھی بدل گئی۔ گو آج ہزاروں سال بیت چکے ہیں لیکن پھر بھی اگر ان زبانوں کا بنظرغائر مطالعہ کیا جائے تو آج بھی ان میں بنیادی مشابہت اور مطابقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی کئی مثالیں لسانیات سے معمولی شد بد رکھنے والے حضرات کو بھی معلوم ہیں۔ یہاں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

اردو	پنجابی	سنسکرت	یونانی	فارسی	آریائی کنہہ کی دوسری زبانیں
ستان	تھاں	ستھان	چتھان Chithon	ستان	—
گاؤں	گراں	گرام	کام Kome	گام	—
در	دوارہ	دوار	تھورا Thora	در	روسی : دوئر۔ آئس لینڈی : دئیر
مندر	مندر	مندر	منتھر Manthra	—	لاطینی : مندرا
آنکھ	اکھ	اکشی	ہاشے Hashshe	—	روسی : اکو۔ آئس لینڈی : اوگا
ابرو	بھروٹے	بھرو	اپھرو Aphrus	ابرو	روسی : بروو
بازو	باہاں	باہو	پازو Pazus	بازو	—
آواز	واج	واک	ایپاس Epos	آواز	لاطینی : واک
ہنس	ہنس	ہنس	چین Chen	—	لاطینی : انسر
بھینسا	ساہن ، سنڈا	مہیش	بشان Bishon	—	جرمن : گنس لاطینی : بسان جرمن : وسنڈ

اردو	پنجابی	سنسکرت	یونانی	فارسی	دیگر آریائی زبانیں
—	—	اشو	ہپ Hippos	اسپ	—
گوبر	گوہا	گوبر	کو پرو Kopros	براز	—
زمین	بھوئیں	بھومی	زے Ge	زمین	لاطینی : ہومی
بہار	ہسنت	وسنت	ہار Har	بہار	آئسلینڈی : وار روسی : ویسنا سلاوی : بُرا
پروا	پُرا	پوروا	بوریا Boreas	—	اطالوی : بورا
پتی	پتی	پتی	پوتیس Potes	زند : پائٹس	لاطینی : پوتس
دیو	دیو	دیو	تھیو Theos	دیو	لاطینی : تھیو
راجہ	راجہ	راجن	ریجن Regien	رئیس	لاطینی : ریکس
برس	ورہ	ورش	ورو Wros	زند : یار	آئسلینڈی : آر
پیلا	پیلا	پلیتا	پولیو Polios	مزد	لاطینی : پلیدوس روسی : مزده گاتھی : مزدو
مزدوری	مجوری	—	مزدو Mizdos	—	جرمن : متھ آئسلینڈی : میدا
(شہد)	مٹھا	مدھو	میڈو Medu	—	—
(آب حیات)	امرت	امرت	امبرتو Ambrotos	—	—
(بھو)	نوناہ	سنوشہ	نوؤ Nous	—	لاطینی : نووس سلاوی : سنوچہ
خسر	سوہرا	شواشرا	اکورو Ekuros	خسر	لاطینی : سوسر
تین	ترے	ترئیاس	ترئس Treis	—	لاطینی : تریس روسی : تری

دیگر آریائی زبانیں	فارسی	یونانی	سنسکرت	پنجابی	اردو
لاطینی : سپت لتھوانی : سپتی	ہفت	ہپت Heptha	سپت	ست	سات
لاطینی : دسم آئسلینڈی : تیو	دہ	ڈیکا Deka	داسا	دس	دس
لاطینی : ردھرو آئسلینڈی : رودر	—	ایرتھرو Eruthros	ردھرا	رتہ	سرخ
لتھوانی : بروناس	—	پھرونو Phrunos	بھرو	بھورا	بھورا

پنجابی عورتوں کی یونانی زبان

عورت فطری طور پر قدامت پسند اور ایک حد تک لکیر کی فقیر واقع ہوئی ہے۔ آج بھی کئی ایک ایسے متحجر الفاظ جنہیں کہ روزمرہ کی زبان سے متروک ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں وہ عورتوں کی زبان پر آج بھی جاری و ساری ہیں۔ عام بول چال میں اکثر و بیشتر وہ ایسے الفاظ استعمال کر جاتی ہے کہ آپ ان کے معنی پر غور کرتے ہی رہ جائیں۔ یہ الفاظ اسی طرح اس نے اپنی ماں سے سنے تھے اور اس کی ماں نے اپنی ماں سے۔ اس طرح یہ الفاظ ہزاروں سال سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس کی چند مثالیں آپ ایک سابقہ مضمون 'وادی' سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات' میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

پنجاب کے دیہاتوں میں اگر بچے ماں سے دودھ پینے کے لیے بار بار تقاضا کریں تو وہ تنگ آ کر کہتی ہے 'جرا ساہ لٹو ہنے نیکڑودے دنتی آن' (ذرا سانس لو ابھی نیکڑو دے دیتی ہوں)۔ اسی طرح اگر کوئی شیر خوار بچہ تمام دن ماں کے پستانوں کو چمٹا رہے تو وہ تنگ آ کر کہتی ہے 'ایہناں وچ کی سارا دن نیکڑوپیا اے' (ان میں کیا تمام دن 'نیکڑو' پڑا ہے)۔ یہ لفظ نیکڑو یونانی زبان کے نیکٹار (Nektar) بمعنی 'دیوتاؤں کا مشروب' یا 'شہد' کی بدلی ہوئی شکل ہے۔

لوک کہانی

پنجاب کی عوامی کہانیاں یونانی روایات سے کہاں تک متاثر ہوئی

ہیں اس کا کچھ اندازہ اس مقبول عام کہانی سے لگایا جا سکتا ہے جس کا ہیرو شہزادہ اپنے ملک سے جلا وطن ہو کر چلتا چلاتا ندی نالی ، پہاڑ ، صحرا عبور کرتا ایک ایسے لق و دق میدان میں پہنچ جاتا ہے جہاں آدم نہ آدم زاد - آخر دور کچھ ٹوٹے پھوٹے سے کہنڈرات نظر آتے ہیں۔ وہاں ایک خوفناک ڈائن کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو اسے ایک کمرے میں بند کر کے ڈھول بجانے پر مامور کر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ذرا بھی رکے تو آکر ایک دم بڑپ کر جاؤں گی - آخر ایک چوہا ترس کھا کر اسے ایک عقبی دروازے سے بھاگ جانے میں مدد دیتا ہے اور اس دوران میں خود اپنی دم سے ڈھول بجاتا رہتا ہے -

شہزادہ چلتے چلتے ایک ایسے جنگل بیابان میں پہنچتا ہے جہاں دور دور تک آبادی کا کوئی نشان نہیں - بھوک پیاس نے تنگ کر دیا ہے - ایک ٹیلے پر چڑھ کر نظر دوڑاتا ہے تو اسے ایک طرف دور سے دھواں نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور جب وہ وہاں پہنچتا ہے تو ایک عالیشان قلعہ سامنے نظر آتا ہے - اندر جانے کے بعد ایک نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے - وہ اسے دیکھ کر پہلے ہنستی ہے پھر روتی ہے - وجہ دریافت کرنے پر بتلاتی ہے کہ ہنسی اس لیے کہ بڑی مدت کے بعد ایک آدم زاد نظر آیا - روئی اس لیے کہ شام کو کانا دیو آکر تمہیں اپنا لقمہ بنا لے گا - شاہزادہ اس کانے دیو کو مار دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے -

آگے بڑھتا ہے تو ایک جگہ ایسا آجڑا ہوا شہر ملتا ہے جس کے مکینوں کو باشک ناگ نے بھچھ کر لیا ہے - شہزادہ اس باشک ناگ کو ٹھکانے لگا کر آگے چل پڑتا ہے - چلتے چلتے ایک جنگل بیابان میں شام ہو جاتی ہے - وہ تھکا ہارا ایک درخت کا سہارا لے کر سو جاتا ہے - آدھی رات ادھر ادھر پر کسی پرندے کے بچوں کا شور و غل سن کر اس کی آنکھ کھل جاتی ہے - دیکھتا کیا ہے کہ ایک عظیم الجثہ سرال ان بچوں کو کھانے کے لیے اوپر چڑھا جا رہا ہے - وہ تلوار کے وار سے اس کے تین ٹکڑے کر کے سرہانے رکھ لیتا ہے - صبح چکوا اور چکوی آ جاتے ہیں - وہ بچوں سے رات کا سارا قصہ سن کر شہزادے کے دوست بن جاتے ہیں -

اس کہانی میں ڈائن کا لفظ یونانی ڈائنو (Deinos) بمعنی خوفناک، مہیب وغیرہ ہی کی ایک شکل ہے۔ کانا دیو یونانی دیومالا کا کائیکلوپ (Kyklopes) بمعنی ایک آنکھ والا دیو ہے جس کا مقابلہ ہرقلیس کے ساتھ ہوا تھا۔ یاد رہے کہ سنسکرت کا لفظ 'دیو' بمعنی خدا، فرشتہ وغیرہ ہمیشہ نیکی اور تقدیس کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے برعکس یونانی دیو مالا میں اچھے اور برے دونوں طرح کے دیو نظر آتے ہیں۔ اس لیے یہ لفظ 'دیو' اگرچہ سنسکرت میں بھی موجود ہے لیکن عوامی کہانیوں کا دیو یونانی روایات کا آئینہ دار ہے۔ باشک ناگ یونانی باشیلیکو (Bashilikos) بمعنی شاہی ناگ ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ بھچھ کرنا بھی یونانی پھائجین (Phageine) بمعنی 'کھانا' سے مشتق نظر آتا ہے۔ سرال یونانی زبان کا ساو (Sauros) بمعنی 'مگرچھ' کی قسم کا بڑی جانور ہے۔ چکوا اور چکوی بھی کچھ اسی قسم کے نام نظر آتے ہیں کیونکہ ہمارے ملک میں اس نام کا یا اس سے ملتا جلتا کوئی پرندہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

لوک کہانیوں میں جب کسی شہزادی کا ہار گم ہو جاتا ہے تو وہ ہمیشہ نولکھا ہار ہی ہوتا ہے۔ کبھی نو ہزارہ یا دس لکھا نہیں۔ اصل میں یہ 'نولکھا' یونانی نشکو (Nishkos) یونانی دیو مالا میں ایک قیمتی ہار ہی کی دوسری شکل ہے۔ ہاری لوک کہانیوں کا پارس پتھر کہ جس کی رگڑ سے لوہا سونے میں تبدیل ہو جاتا ہے یونانی پارسون (Parson) ہے جو کہ یونانی روایات میں ایسا سبز پتھر ہے کہ جس کی رگڑ سے دھاتیں سونا بن جاتی ہیں۔

پنجابی لوک کہانیوں میں 'بکٹی' بمعنی تیز روگھوڑی کو ایک خاص مقام حاصل ہے خاص کر مرزا کی بکٹی تو زندہ جاوید بن چکی ہے۔ آج اہل پنجاب اپنی ہر اچھی گھوڑی کو پیار اور فخر سے بکٹی کے نام سے پکارتے ہیں۔ غالباً یہ بکٹی سکندر اعظم کے گھوڑے 'بوکا فیلس' بمعنی 'ہرنی کا بیٹا' کی یادگار ہے۔

پنجابی زبان میں یونانی عنصر

اس سے پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ پنجابی لفظ تکھان بمعنی بڑھئی دراوڑی زبان میں انہی معنوں میں مستعمل لفظ تکان سے مشتق ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ہومر کے زمانے کی یونانی زبان میں اس سے ملتا جلتا لفظ

تکتان (Tekton) بمعنی بڑھتی، جہاز ساز اور معیار ملتا ہے۔ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ آیا یہ مماثلت محض اتفاقیہ ہے یا ان میں باہم کوئی رشتہ موجود ہے۔ لیکن یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ بڑھیوں کے ایک اہم اوزار گنیا کی اصل یونانی لفظ 'گونیا' (Gonia) بمعنی کونے ماپنے والا آلہ ہی ہے۔ اس طرح یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ آیا لفظ 'بیٹھک' کا یونانی لفظ ایٹکو (Attikos) بمعنی چھوٹا کمرہ سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔

اسی طرح اور بھی کئی ایک یونانی الاصل الفاظ ہیں جو کہ پنجاب کی روزمرہ زبان میں مستعمل ہیں۔ ذیل میں ایسے الفاظ کی ایک مختصر سی فہرست دی جاتی ہے :

پنجابی مترادف الفاظ مع معنی

یونانی الفاظ مع معنی

نرکل	نیرا کلمو (Nerakalamos) :	سر کنڈا
چپو	کوپ (Kope) :	چپو
گھوگا : گھونگا (سنسکرت : شنکھ)	کوگھ (Kogche) :	گھونگہ
کانٹا : نرسل ، سر کنڈا	کانٹا (Kanna) :	نرسل
گنٹا : یعنی میٹھا نرسل	سر کنڈا	
بونٹی یا بوٹی : جڑی بوٹی ، چھوٹے پودے	بوٹی (Botane) :	پودا
گری : گنٹالی ، مغز	کریان (Karuon) :	مغز
بھاڑ : بڑا چولہا یعنی آگ جلانے کی جگہ	پائر (Pyre) :	آگ
پڑسے : گرمی	پائرسن (Pyresson) :	گرمی
ہالا (Halos) : وہ دائرہ جو کہ ہالہ : وہ روشن دائرہ جو کہ بعض غلہ گاہتے وقت بیلوں کے چلنے سے بن جاتا ہے ، نیز وہ روشن دائرہ جو کہ بعض اوقات چاند یا سورج کے گرد نظر آتا ہے۔	ہالا (Halos) : وہ دائرہ جو کہ ہالہ : وہ روشن دائرہ جو کہ بعض غلہ گاہتے وقت بیلوں کے چلنے سے بن جاتا ہے ، نیز وہ روشن دائرہ جو کہ بعض اوقات چاند یا سورج کے گرد نظر آتا ہے۔	

پنجابی مترادف الفاظ مع معنی

یونانی الفاظ مع معنی

گھیرا یا گھیر : چکر

گیرا (Gyros) : چکر

کلاما (Kalamos) : قلم ، نرسل قلم : قلم (فارسی میں قلم کرنا کے معنی قطع کرنا کے ہیں۔ صوتی لحاظ سے فارسی کا لفظ 'خامہ' بمعنی قلم اس یونانی لفظ سے منسلک ہے) -

تاپے (Tapes) : غالیچہ ، دری ، تیڑ : ٹاٹ یا سرکنڈے کی گدی جس پر اسکول کے بچے یا ہندو بنیے بیٹھتے ہیں۔ گدی ، قالین

چورا یا چوری : بالوں کا بنا ہوا وہ دم نما پنکھا جو کہ مکھیاں اڑانے کے کام آتا ہے۔ اورا (Ura) : دم

پھیلو (Phyllus) : پتی، نیز چاقو پھل : چاقو یا تلوار وغیرہ کا منہ یا تلوار وغیرہ کا پھل پھالا : ہل کا پھل

کوٹیلی (Kotyle) : پیالہ کٹوری : پیالہ نما برتن

کیلیکس (Kylis) : پیالہ کولی : پیالہ نما برتن

ارٹو (Artos) : روٹی روٹی : چپاتی نیز روٹ بمعنی بڑی روٹی

(یہاں بھی ہم کچھ مخمسے میں پڑ جاتے ہیں کیونکہ دراوڑی زبانوں میں بھی روٹی کے لیے اس سے ملتا جلتا لفظ دوٹی موجود ہے جس کا مترادف پشتو کا لفظ ڈوڈٹی ہے) (ملاحظہ ہو 'وادی' سندھ میں دراڑی زبان کی باقیات)۔

کورڈیلے (Kordyle) : کوڑا ، کوٹلہ : کوڑا

چھڑی

کشٹو (Kaushtos) : جلا ہوا کشتہ : علم طب کی اصطلاح میں کسی

دھات یا جڑی بوٹی کو جلا

پنجابی مترادف الفاظ مع معنی

یونانی الفاظ مع معنی

کر بنائی ہوئی دوا (فارسی)
میں کشتہ کے معنی مقتول کے
(ہیں) -

کلی (اردو : قلعی)
ککلی : بچوں کا دائرہ بنا کر گھومنے
کا کھیل

قمقمہ لگانا

کلائی (Kalai) : قلعی، ٹانگا لگانا
کیکلو (Kyklos) : دائرہ

کا کنا (Kakkana) : اونچے اونچے
پنسنا

اکھاڑہ : لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ
مثلاً پہلوانوں کا اکھاڑہ ،
ناچنے والوں کا اکھاڑہ وغیرہ -

اگورا (Agora) : لوگوں کے
جمع ہونے کی جگہ ، منڈی

سرنگ : زمین دوزراستہ

شورنگ (Shuring) : کان ،
سرنگ

بستی : زرد رنگ

زنتھو (Xanthos) : زرد رنگ

گارا : بھیگی ہوئی مٹی

ہائیگرو پیلو (Hygros Pelos) :

بھیگی ہوئی مٹی

ککر : سخت سردی

ککراونو (Kakarunu) : سردی

محسوس کرنا

ککتر : سردی سے بچ شدہ پانی

کککارونو (Kakkarunu) سخت

سردی سے جسم کا ٹھنڈا پڑ جانا ،

سردی سے پانی کا جم جانا

چپ

سیوپ (Siope) : خاموشی

بیلی : دوست (اس کا قدیم تلفظ پیلی

پھیلو (Philos) : دوست

تھا جو کہ فی زمانہ بھی یورپی

جپسیوں کی زبان میں مستعمل

(ہے) -

پنجابی مترادف الفاظ مع معنی

یونانی الفاظ مع معنی

پالائی (Palai) : پرانا، گزرا ہوا، پہلا : اول، پرانا، قدیم گزشتہ

پولو (Polos) : نوجوان گھوڑا، بچھڑا

غالباً ککلی کی طرح بڑوں میں گھوڑوں پر چڑھ کر گیند بلا کھیلنے کا شوق بھی یونانی عہد کی یادگار ہے اور نہیں تو کم از کم پولو کا نام تو ضرور یونانی اثرات کی غمازی کر رہا ہے۔

پولیمو (Polemos) : لڑائی
موسخو (Moskhos) : خوشبو

لام : لڑائی
مشک : خوشبو

انپاروتی (Mparouti) : بارود
لیپرس (Lepris) : پکڑنا

بارود

لیڑنا : پکڑنا

کوپے (Kope) : کاٹنا، ٹکڑے ٹکڑے کرنا
کپنا : کاٹنا (ولندیزی اور جرمن کپن : کاٹ دینا)

پیلین (Palaiene) : کشتی لڑنا : کشتی کا فن

پالے (Pale) : پہلوانی کا فن

پہلوان : کشتی لڑنے والا (بظاہر یہ

لفظ منسکرت کے لفظ بلوان

بمعنی طاقتور سے مشابہ ہے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ 'بل'

کے ہوتے ہوئے بھی جب تک

کوئی آدمی فن پہلوانی سے

واقف نہ ہو پہلوان نہیں کہلا

سکتا۔ اس کے برعکس نسبتاً

کمزور آدمی جو کشتی کے داؤ

پیچ جانتا ہے تو وہ پہلوان

(ہے)۔

چند یونانی الاصل الفاظ کی تشریح

شیطان

گو فرہنگ نویسوں کے نزدیک 'شیطان' کا لفظ عربی مادہ شیطن (عبرانی : سطن) بمعنی مخالف ، دشمن اور ایذا رساں وغیرہ سے مشتق ہے ۔ لیکن اس کے بارے میں جو روایات موجود ہیں وہ یونانی دیومالا کے ایک اہم کردار تیتان (Titan) سے متعلقہ روایات سے اس حد تک مماثلت و مطابقت رکھتی ہیں کہ ان کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۔

ماہرین لغت کے نزدیک 'تیتان' کا لفظ یونانی مادہ تیتو (Tito) بمعنی دن ، گرمی یا آگ سے مشتق ہے ۔ سنسکرت تیتھا بمعنی آگ اور پنجابی تیتا بمعنی گرم بھی اسی مادہ سے منسلک ہیں ۔

شیطان کے بارے میں روایات اس قدر عام ہیں کہ ان کا دہرانا محض طوالت کا باعث ہوگا ۔ یونانی دیومالا میں یورانوس (آسمانوں کا دیوتا) اور جایا (زمین کی دیوی) کی اولاد تیتان کہلاتی ہے ۔ اسے نیکی کی قوتوں کا مخالف اور بدی کی قوتوں کا مظہر تسلیم کیا گیا ہے ۔ ان کے بارے میں مذکور ہے کہ یہ عظیم الحبشہ مخلوق فطری طور پر تند خو ، سرکش اور نافرمان تھی ۔ شروع میں انہیں عظیم المرتبت دیوتاؤں میں شمار کیا جاتا تھا لیکن انہوں نے سب سے عظیم دیوتا زئیوس (Zeus) کی پیدائش پر ناراضگی کا اظہار کیا جس کی پاداش میں انہیں بمع ان کی ذریات کے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دیوتاؤں کی سرزمین سے جلا وطن کر دیا گیا ۔ اس کے بعد کئی دفعہ تیتانوں نے دیوتاؤں سے عنان حکومت چھیننے کے لیے نبرد آزمائی کی جو کہ یونانی دیومالا میں 'جنات کی جنگ' (Gigantomachia) کے نام سے مشہور ہے ۔ لیکن اس میں انہوں نے ہمیشہ منہ کی کھائی ۔

اس بارے میں یونانی اور سامی روایات میں فرق صرف اتنا ہے کہ یونانی روایات میں جہاں تیتان دیوتاؤں کے مخالف تھے وہاں انسان کی خیر خواہی کا دم بھرتے تھے لیکن سامی روایات میں انہیں انسان دشمن قوتوں کا مظہر بیان کیا گیا ہے ۔ (Favourite Greek Myths By Lilian S. Hyde)

قدیم سامی روایات میں جو کہ عہد نامہ عتیق اور جدید میں مرقوم ہیں شیطان کا ذکر صرف کتاب ایوب میں آیا ہے۔ انسانی تخلیق کے بارے میں جو مخلوق شیطان کا کردار ادا کرتی ہے اور انسان کو نافرمانی پر اکساتی ہے وہ شیطان نہیں بلکہ سانپ ہے۔ لیکن عہد وسطیٰ کی سامی روایات خاص کر عیسائی دینیات میں اسے فرشتوں کے سردار لیکن انسان دشمن قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جسے کہ اس کی سرکشی کی بناء پر دوزخ میں پھینک دیا گیا۔

(Mythological Dictionary By Joseph Kaster)

علامہ عبدالعزیز المیمنی کا قول ہے کہ 'شیطان عربی زبان کا لفظ نہیں ہے بلکہ مستعار شدہ ہے۔'

(افادات میمنی : 'اردو نامہ' کراچی شماره ۳۱ ، صفحہ ۶۴)

تیتانوں میں سب مشہور تیتان کا نام ہیلئس (Helios) بمعنی مجسم آگ اور اس نسبت سے اسے سورج دیوتا بھی کہتے ہیں۔ عربی لفظ 'ابلیس' کا عہد نامہ عتیق یا جدید میں کہیں ذکر نہیں آتا۔ غالباً یہ کنعانی دیوتا 'بعل کلدانی بیل' اور یونانی ہیلوس بمعنی سورج دیوتا کا مترادف ہے۔ ویسے ہیلئس کی معرب صورت میں اس کی 'ہ' کی آواز کا 'ب' کی آواز سے بدل جانا بھی ممکنات میں سے ہے۔

یونان

آخر یونان کو یونان کیوں کہتے ہیں جب کہ مغربی ممالک میں یہ جزیرہ نما گریس (Greece) کے نام سے مشہور ہے؟ اس کی وجہ بھی کچھ ایسی ہی ہے جیسا کہ دریائے سندھ کی نسبت سے ایک وقت پشاور سے کولمبو اور کراچی سے رنگون تک کا تمام علاقہ ہندوستان کے نام سے مشہور تھا۔ اگرچہ آج دریائے سندھ مغربی پاکستان میں بہتا ہے لیکن اس کے نام کی چھاپ ستلج پار کے علاقہ پر چسپاں ہے۔

شروع شروع میں ایشیائی اقوام کا جس مغربی قوم سے سب سے پہلے واسطہ پڑا وہ ایشیائے کوچک کے جنوب مغربی ساحل کے قریب واقع ایونیا (Ionia) کے باشندے تھے۔ عرب اور فارس میں یہ علاقہ یونان کے نام سے مشہور تھا اور اہل ہند اسے یا ونا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ گواہیونیا

کے باشندے شروع میں جزیرہ نما ہی سے نقل مکانی کر کے یہاں پہنچے تھے لیکن جزیرہ نما کے باشندے انہیں غیر یونانی تصور کرتے تھے۔ گو یونان کا مشہور شاعر ہومر (Homer)، مشہور مؤرخ ہیروڈوٹس (Herodotus)، اور تھیلس (Thales)، اناشی میندر (Anaximander)، ہیراقلیٹس (Heraclitus) نیز اناشاغورث (Anaxagoras)، جیسے مشہور فلسفی اسی سر زمین سے تعلق رکھتے تھے جن پر آج بھی اہل یونان کو ناز ہے۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ آج ایونیا کا نام ایک قصہ پارینہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ علاقہ موجودہ ترکی کا ایک حصہ ہے لیکن پھر بھی اس کے نام کی نسبت سے جزیرہ نما گریس مشرقی اقوام میں یونان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بت

پتھر کا مجسمہ، مورتی، عام طور پر ایسا مجسمہ جو کہ عبادت کے لیے مخصوص ہو۔ بت کدہ اور بت پرستی کے الفاظ بھی اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

اس لفظ کی اصل (مہاتما) بدھ کا یونانی تلفظ معلوم ہوتا ہے۔ قدیم یونانی تحریروں میں مہاتما بدھ کو اکثر بوٹا (Boutta)، بوتتا (Botta) اور بتا (Butta) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

شروع شروع میں مہاراجہ کنشک (۱۲۰ تا ۱۵۰ء) نے مہاتما بدھ کے مجسمے بنانے کے لیے باخترا اور پنجاب کے یونانی سنگتراش مقرر کیے جس پر آگے چل کر گندھارا کے فن سنگ تراشی کی بنیادیں استوار ہوئیں۔ اس فن کو اکثر بدھ اور یونانی فن کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اغلب ہے کہ یہ یونانی سنگ تراش ان مجسموں کو اپنی زبان میں 'بوتتا' یا 'بتا' پکارتے ہوں گے۔ آج بھی پنجاب میں 'بتا' کا لفظ 'پتلا' کے معنوں میں مستعمل ہے بلکہ خود 'پتلا' کا لفظ بھی اسی 'بتتا' سے مشتق معلوم ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے 'بت' کی ایک صورت 'بد' بھی بیان کی ہے۔

(قواعد اردو: محمد حسین آزاد، صفحہ ۲۵۴، مطبوعہ لاہور، ۱۸۶۷ء)

اگر بت کے معنی محض بے جان مجسمے کے ہوتے تو یہ لفظ معبود اور معشوق یعنی قابل پرستش کے معنوں میں کبھی بھی استعمال نہ ہوتا۔

اس لیے اس بت کی اصل سوائے ایسے مجسمے کے اور کچھ نہیں ہو سکتی جو کہ معبود کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہو۔ گو شروع میں یہ نام صرف مہاتما بدھ کے مجسموں کے لیے مخصوص ہو گا لیکن بعد ازاں یہ نام عمومیت کا درجہ حاصل کر کے ہر مجسمے پر چسپاں ہونے لگا۔

تاریخ کے اوراق سے زمانہ قدیم ہی سے ایران میں بدھ مت کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے۔ کیانی خاندان کے حکمران لہراسپ کے تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں توران کے علاقے میں بدھ مذہب پھیل چکا تھا۔ ساسانی عہد (۲۲۴ تا ۶۵۷ء) میں مشرقی ایران میں بدھ مذہب کے موجود ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ طلوع اسلام کے بعد بھی بلخ میں بدھ مذہب کا ایک مندر موجود تھا جو کہ عوام میں 'نوبہار' کے نام سے مشہور تھا۔ شاپور اول کے عہد (۲۴۱ تا ۶۲۷ء) میں مانی مذہب کے بارے میں بھی عام طور پر یہی خیال پایا جاتا ہے کہ وہ بدھ مذہب کا چربہ تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'بت پرستی' کا ماخذ 'بدھ پرستی' ہے اور 'بت' مہاتما بدھ کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔

دام

بمعنی روپیہ، پیسہ، قیمت، زمانہ گزشتہ میں سکّہ کا نام۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ وادی سندھ میں ہندو یونانی عہد (۱۹۰ ق م تا ۶۵۰ء) میں یونانی سکّہ درہم (Drachma) مروج تھا۔

۸۰ یا ۶۹۰ کے لگ بھگ اسکندریہ کے ایک نامعلوم رومی النسل باشندے نے اپنی بحری مہمات کے تذکرے 'بحیرہ قلمز کی سیر' (Periplus) میں رقم کیا ہے کہ :

"قدیم دراہم جن پر کہ یونانی رسم الخط درج ہے اور (وادی سندھ میں) سکندر اعظم کے جانشینوں کی شبیہیں منقش ہیں وہ باختر اور شمالی ہند سے چلتے چلاتے (ہندوستان کے) مغربی ساحل پر واقع بندرگاہوں میں آج بھی (بطور سکّہ) رائج ہیں۔"

قدیم پراکرت میں کفایت لسانی کی بناء پر درہم کے لفظ نے
'داما' کی صورت اختیار کر لی۔“
(’اردو اور بنگالی‘ از ڈاکٹر شہید اللہ)

انقلابات زمانہ کی لہروں پر بہتا ہوا یہ سکتہ مغلیہ دربار میں آ
نمودار ہوتا ہے۔ آئین اکبری میں مرقوم ہے کہ :

”دام کا وزن پانچ تنکہ یعنی ایک تولہ آٹھ ماشہ اور سات
رتی ہے (قیمت کے لحاظ سے) اور یہ روپے کا چالیسواں
حصہ ہے۔“

عجیب بات ہے کہ عہد اکبری میں حکومت کی آمدنی دام جیسے
ادنیٰ سکتے میں شمار کی جاتی تھی۔ یہ طریقہ عہد جمہانگیری میں بھی
مروج رہا جیسا کہ مجدد شریف حنیجی نے ۱۶۲۸ء میں جمہانگیر کے دور
حکومت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”شاہان دہلی کو تمام ممالک محروسہ سے سالانہ چھ ارب اور
تیس کروڑ دام آمدنی ہوتی ہے۔“

دمڑی اور دمڑے کے الفاظ اس دام سے مشتق ہیں۔

مرہٹی زبان میں ابھی تک تنخواہ کو ’درماہ‘ کہتے ہیں جیسے کہ
'کورڈا در ماہ' کے معنی ہیں فقط تنخواہ (کورہ بمعنی صاف یا صرف) یعنی
وہ مشاہرہ جس کے ساتھ روٹی کپڑا اور رہنا شامل نہ ہو۔

عطار

اس لفظ کے دو مختلف معنی ہیں: اول عطر فروش، دوم پنساری، دوائی
فروش۔ عطر کا لفظ عربی اور فارسی میں پھولوں سے کشید کردہ خوشبودار
روغن کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اردو، پنجابی اور فارسی وغیرہ
میں عربی سے داخل ہوا لیکن خود عربی میں اس لفظ کی اصل موجود
نہیں۔ اس کے برعکس یونانی میں اس کے مترادف لفظ ایوتھیا (Euothia)
بمعنی خوشبو، عطر موجود ہے جس سے کہ خود ’عطر‘ کا لفظ مشتق ہے۔

جہاں تک دوائی فروش کے معنی کا تعلق ہے یہ عطر سے کوئی لگاؤ نہیں کھاتا تو پھر اس کے یہ معنی کہاں سے آئے؟ اگر یونانی لغت کا جائزہ لیں تو وہاں اس کے ہم اصل الفاظ تو اتر سے موجود ہیں جیسے کہ:

ایٹیا ترک (Iatrike): علم طب

ایٹیا تریکو (Iatrikos): علاج، دوائی

ایٹیا ترو (Iatros): طبیب، حکیم، معالج

ظاہر ہے کہ عربی عطار یونانی ایٹیا ترو ہی کی معرب صورت ہے۔

انجیل

یونانی سے مشتق ہے۔ یونانی میں انجیل کا تلفظ ایوینجیلیا (Evangelia) بمعنی خوشخبری اور بشارت کے ہیں۔

یونانی ایو (Ev) بمعنی اچھی، انجیلیا (Anggelia) بمعنی خبر۔ انجیلیا بذات خود یونانی اینجلو (Anggelos) بمعنی پیغامبر، خبر رساں سے مشتق ہے۔

پنجابی اور اردو گرامر پر یونانی اثرات

یہ موضوع کتنا عجیب اور بے سروپا نظر آتا ہے؟ اس کی وجہ ہمارے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے وہ نظریات ہیں جو کہ برصغیر کی باقی ماندہ زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو اور پنجابی زبانوں کو بھی سنسکرت کی ایک شاخ بتاتے ہیں۔ گو بعض دفعہ دبی زبان میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ براہ راست سنسکرت سے نہیں بلکہ قدیم پراکرتوں سے نکلی ہیں۔ لیکن جب مجموعی طور پر برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں کی تقسیم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو انہیں بے چوں و چرا سنسکرت الاصل تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ان زبانوں کا واحد سرچشمہ صرف سنسکرت ہی کو باور کر لیتے ہیں۔ لیکن جب کسی نحوی ترکیب یا لغوی سلسلے کا سراغ سنسکرت میں نہیں ملتا تو بعض دفعہ نہایت ہی مضحکہ خیز اور دور ازکار تاویلات ایجاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ان زبانوں میں سنسکرت، عربی اور فارسی کے علاوہ برصغیر کی آریاؤں سے پہلے کی زبانوں مثلاً دراوڑی اور منڈا زبانوں کا عنصر بھی موجود ہے۔ پھر آریاؤں کے بعد یونانی، ترکی، منگولی اور یورپی زبانیں بھی اپنے اپنے وقت میں یہاں کی زبانوں کو متاثر کرتی رہی ہیں۔

یہاں پنجابی اور اردو زبان کی گرامر کے چند ایک ایسے پہلوؤں کا جائزہ لیں گے جن پر یونانی اثرات بالکل واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اول حروف ربط 'کا'، 'کے' اور 'کی' کی مثالیں لیتے ہیں۔ عربی فارسی میں اس کی اصل نہیں ملتی۔ سنسکرت میں بھی حروف ربط کی جگہ جولاہقے استعمال ہوتے ہیں وہ صوتی ہیئت کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ سنسکرت میں واحد کے لیے اکثر 'اہ' یا 'سیہ' اور جمع کے لیے 'ام' یا 'نام' کے لاحقے استعمال ہوتے ہیں جیسے کہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہے:

وکرماہ سبھا : بکرم کا دربار

پانینیہ وگیان : پانینی کی حکمت

امرتسیہ سر : امرت کا تالاب

یہ 'آہ' اور 'سیہ' کے اضافی لاحقے دوسری آریائی زبانوں سے بھی پوری طرح مطابقت کھاتے ہیں جیسے کہ ذیل کی گردان سے ظاہر ہے:

آریائی زبانوں کی اضافی حالت کی گردان

سنسکرت : اشو، اوستائی : اسپ، یونانی : پیو، لاطینی : ایقو (گھوڑا)

سنسکرت	اوستائی	یونانی	لاطینی
واحد	اشواسیہ	اسپا پیہ	ایقوئی
جمع	اشوام	اسپا نام	ایقورم

اگرچہ قدیم پراکرت میں بھی اضافت کا مفہوم موجود تھا لیکن وہاں بھی 'کا'، 'کے' اور 'کی' کی علامتوں کا نشان نظر نہیں آتا جیسے کہ:

ات دیپا شرن ، آند شرن

دھرم دیپا ، دھرم شرن

اور نور حقیقی کی پناہ سب سے خوش کن پناہ ہے ،
دین حق ہی نور حقیقی ہے ، دین کی پناہ میں آؤ -

(’داستان اردو‘ از نصیر حسین خیال)

جب سنسکرت میں ان حروف ربط کی اصل نہ ملی تو پھر تاویلات کی تلاش شروع ہوئی - آخر یہ قیاس کر لیا گیا کہ :

’اگرچہ بظاہر یہ حروف (یعنی علامت اضافت) بہت سادہ معلوم ہوتے ہیں لیکن جب ان کی اصل پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت میں مستقل الفاظ تھے لیکن زمانے کے تغیرات سے رفتہ رفتہ ایسے ہو گئے کہ اب وہ محض ایک سادہ علامت کا کام دیتے ہیں مثلاً ’کنے‘ جو پرانی اردو میں ’پاس‘ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اصل میں ’کرن‘ یا ’کرنے‘ سے ہے جس کے معنی ’کان‘ کے ہیں - چونکہ کان قریب کا عضو ہے اس لیے یہ معنی ہو گئے -“

یاد رہے کہ ’کنے‘ کا لفظ جو قدیم دکنی زبان میں مستعمل ہے حروف ربط (کا ، کے اور کی) کے معنی نہیں دیتا بلکہ سمت، طرف یا پاس کے معنی دیتا ہے اور فی زمانہ بھی یہ لفظ پنجابی زبان میں انہی معنوں میں مستعمل ہے جیسے کہ :

’میرے کنین‘ یعنی میری طرف ’رب کنین‘ یعنی خدا کی طرف
'رب کنوں' بمعنی خدا کی طرف سے یا خدا سے -

سولہویں صدی عیسوی کے دکنی شاعر فیروز کی ایک ہی مثنوی میں 'کنے' اور 'کا' 'کے' کی علامتیں مختلف معنوں میں استعمال ہوئی ہیں جیسے کہ :

میرا پیر مخدوم جی جگ منے
منگوں نعمتاں میں سدا اس کنے
پیا جیو تھے تو ہم ساس ہے
تو ہم جیو کے پھول کا باس ہے

(’دکنی ادب کی تاریخ‘ از ڈاکٹر محی الدین زور قادری)

محققین نے ان حروف ربط کے بارے میں اور بھی کئی قیاسات پیش کیے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ یہ پراکرت کی اضافی علامت ’کیرکم‘ اور ’کیرو‘ سے ماخوذ ہیں۔ اس کی سند قدیم دکنی اردو کے علاوہ چند بردٹی کی ’پرتھی راج راسو‘ سے بھی ملتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے ان حروف ربط کا استعمال بہت پرانا ہے۔ اس طرح سے اور بھی کئی قیاس آرائیاں موجود ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی فاضلانہ تصنیف ’اردو زبان کا ارتقاء‘ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ ان حروف ربط کا استعمال دکنی اردو ہی سے مخصوص تھا۔ حالانکہ پنجاب میں اس کے استعمال کا ثبوت نہایت قدیم تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ اس کی چند ایک مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں :

بدھ مت کی ایک مذہبی کتاب میں جو کہ پالی زبان میں ہے ان حروف ربط کا ثبوت ملتا ہے جیسے کہ اس کتاب میں درج ذیل کے فقرے سے واضح ہے :

’دھام (دھرم) کرو ، دھام کا شنکھ پھونکو، دھام کی دند
مچاؤ۔‘ (’داستان اردو‘ : نصیر حسین خیال)

ضلع امرتسر کی تحصیل پٹی میں جین مذہب کے ایک مندر سے سدھ ناتھ جوگیوں کے فرقے کی زبان میں ایک قدیم تحریر دستیاب ہوئی ہے۔ اس زبان کو ماہرین نے اپ بھرنش سے تعبیر کیا ہے۔ یہ دسویں صدی عیسوی کے زمانے کی زبان ہے۔ اس تحریر میں ان حروف ربط کا استعمال موجود ہے جیسے کہ :

اردو زبان کی قدیم تاریخ

سس گھر سور سہانے بھائی
ہر درس کی سوجی پائی
(چاند کے گھر سورج آیا یعنی طالب کے گھر
مرشد آیا تو جلوۂ حق کی حقیقت ظاہر ہوئی)

ملک محمد جائسی (۱۴۸۰ تا ۱۵۳۸ء) نے پدماوت میں بھی ان حروف
ربط کو استعمال کیا ہے :

آئی سرد رتو ادھک پیاری
نوکنوار کا تک اجیاری
ایہہ رتو کنت پاس جہیہہ
سکھ تن کے پیا مانہ
دہن ہنس لا گے پیا گلے
دہن گل پیا کے با نہ

(سردیوں کا بہت ہی پیارا موسم آ گیا -

ترو تازہ اموج اور کا تک کی چاندنی رات ہے -

اس موسم میں جو محبوب کے پاس ہے

اس کے دل میں آرام ہے

مبارک ہیں وہ جو ہنس ہنس کر محبوب کے گلے لگ رہی ہیں -

مبارک ہیں وہ جو محبوب کی گردن میں بازو حائل کیے ہوئے ہیں) -

پنجاب کی صوفیانہ اور مذہبی شاعری میں بھی ان حروف ربط کا

استعمال تواتر سے ملتا ہے جیسے کہ :

فریدا ! پنکھ پرا ہونی، دنی سہاوا باغ

نوبت و جی صبح سے چلن کا کر کاج

(اے فریدا ! یہ دنیا ایک سہانا باغ ہے اور پرندہ یعنی

انسان ایک سہان ہے -

صبح ہی سے کوچ کا نقارہ بچ رہا ہے تو بھی رخت سفر باندھ لے) -

کا گا نین نکاس دوں اور پی کے رکھ لے جائے
پہلے درس دکھائے کے تو پاچھے لیجیے کھائے

اے کوئے ! میں اپنی آنکھیں نکال دیتی ہوں اور انہیں میرے
محبوب کے رخ یعنی اس کی طرف لے جا۔

پہلے انہیں محبوب کا جلوہ دکھا دینا اور بعد میں کھا لینا)۔
(شیخ فرید ۱۱۷۳ تا ۱۲۶۵ء)

ذیل کی مثالیں بھی قابل غور ہیں :

سبھناں جئیاں کا اکو داتا
سو میں وسر نہ جائے
گر بن گھور اندھار
ست پر کھ جن جانیا
ست گر تس کا ناؤں
تہ ہر کے نام کی تم پر چھاؤں

(گرونانک ۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۸ء)

ست گر کے پرتاپ تو مٹ گئیو سب دکھ دند
کھے کبیر دبدھا مٹی گرملیا راما نند
کبیر نتج گھر پریم کا مارگ اگم اگا دھ
سیس اتارپگ تلے دھرے تب نکٹھے پریم کاسودا
(بھگت کبیر قریبا ۱۴۲۵ تا ۱۵۱۸ء)

ایہڑ تہڑ چھڈ توں گر کا شبد پچھا نو
ست گراگے ڈھے پئیو سب کچھ جانے جانو
آسا منسان جلائے توں ہوئے رہو مہا نو
ست گر کے بھانے بھی چلمھے تاں درگاہ پاوے مانو

(ادھر ادھر کی باتیں چھوڑو ، مرشد کا قول پہچانو ، خدا
کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ وہ سب کچھ جاننے والا ہے ، دنیا میں
ایسے رہو جیسے کوئی مسہان رہتا ہے ، رضائے الہی کے مطابق چلو

تا کہ اس کی بارگاہ میں عزت نصیب ہو)۔

(گرو امر داس (۱۵۵۲ء تا ۱۵۷۴ء)

آگیا بھٹی اکال^۱ کی تبھی چلائیو پنتھ

سب سکھن کو حکم ہے گر مانیو گرنٹھ^۲

گور گرنٹھ جن مانیو پرگٹھ^۳ گراں کی دیہہ^۴

جو پر بھو کو ملیو چھے کھوج شبد میں لھے

(گورو گوبند سنگھ ۱۶۷۵ تا ۱۷۰۸ء)

نک بوجھ من میں کون ہے سب دیکھ آوا گون ہے

من اور ہے تن اور ہے من کا وسیلا پون ہے

بندہ بنایا جاپ کون تون کیوں لبھانا پاپ کون

’جس نگری ٹھا کر جس ناپیں

سو کا کرہ کو کرہ بستی ہے

اگر چندن کی سار نہ جائے

پاتھر سیتی گھستی ہے

(شاہ حسین لاہوری ۱۵۳۸ تا ۱۵۹۹ء)

’اؤ فقیر ومیلے چلیے عارف کا سن واجارے

انحد سبد منو بہو رنگی تجئے بھیکھ پیاجا رے

’دکھ جگ کے موہے پوچھن آئے

جن کے پیا پردیس سدھائے

(بلھے شاہ ۱۶۸۰ تا ۱۷۵۸ء)

سنت اندر سنگھ چکرورتی کو گورمکھی رسم الخط میں ایک قلمی

نسخہ دستیاب ہوا ہے جو کہ پندرھویں یا سولھویں صدی عیسوی کی

تحریر معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مصنف کا نام درج نہیں۔ ویسے تحریر

سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ملتان کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس تحریر میں

بھی زیر بحث حروف ربط استعمال ہوئے ہیں جیسے کہ :

۱۔ ازل سے ابد تک

۲۔ سکھوں کی مذہبی کتاب

۳۔ ظاہر - ۴۔ جسم - ۵۔ کوئے - ۶۔ کتے - ۷۔ بھوک پیاس -

”ایمنہ کے ادر تھاہ جنمنا عبداللہ پاتشا ہجادی کی پیٹھ نے
اچن مدینہ عرب ولایت مجد مصطفیٰ آوے گا۔ اپنا دین امر
چلاوے گا۔ کلی کا جگ اتھر بن بید مجد امر لکھ درگاہ ملے گا
مجد مصطفیٰ کلی میں آوتا ہے۔ بید اتھر بن آکے کی خبر
دیتا ہے۔“

تاریخی لحاظ سے سب سے پہلے جس متعلقہ زبان میں مذکورہ حروف
ربط کا سراغ ملتا ہے وہ یونانی زبان ہے۔ یونانی لاحقہ ’اکا‘ (Ikos) یا
’اکا‘ (Akos) بمعنی متعلقہ جیسے کہ ’ہومریکا‘ (Homerikos) بمعنی
ہومر سے تعلق رکھنے والا۔ اسی طرح ’انڈیکا‘ (Indikos) ہند سے
تعلق رکھنے والا، (نیل بمعنی لاجورد کا یونانی نام)۔ کوہ ہند و کش
کا نام بھی یونانی زبان کی گواہی دیتا ہے۔ محققین کے نزدیک پہلے
یہ یونانی زبان کا انڈیکوس بمعنی کوہ ہند تھا لیکن بعد میں بگڑ کر
ہند و کش بن گیا۔

سہارا جہ اشوک کے کتبوں اور بعض قدیم ڈراموں میں ’یونکا‘ اور
’رومکا‘ کے الفاظ میں بھی اس اضافت نسبتی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ الفاظ
اس وقت کے مقامی یونانیوں میں مروجہ تلفظ کی ترجمانی کرتے ہیں یعنی
’رومائیکا‘ (Romaika) روم سے تعلق رکھنے والا اور ’ایونیکا‘ (Ionika)
یونان سے تعلق رکھنے والا۔ مقامی یونانیوں ہی سے مقامی آبادی نے یہ
الفاظ اور اس کے ساتھ ہی ’کا‘ کا اضافی لاحقہ بھی اپنا لیا۔

یہی ’کا‘، ’کے‘ اور ’کی‘ کے حروف ربط پنجاب میں بطور صفات نسبتی
بھی مستعمل ہیں جیسے کہ میکے (ماں کا گاؤں)، پیکے (باپ کا گاؤں)
اسی طرح نانکے دادکے وغیرہ۔

پنجاب کے دیہاتوں کے اکثر نام بھی انہی صفات نسبتی کی نشان
دہی کرتے ہیں جیسے کہ فاضلکا، امروکا، مریدکے، کامونکے،
سلیانکی اور پتوکی وغیرہ۔ یاد رہے کہ اس طرز پر شہروں یا دیہاتوں
کے نام عام طور پر سوائے پنجاب کے برصغیر کے کسی اور حصے میں
نہیں ملتے۔

ان حروف ربط اور ان سے مشتق صفات نسبتی کے سر زمین پنجاب میں اتنے قدیم اور ہمہ گیر استعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے اسی سرزمین میں یونانی لسانی اثرات کے تحت ان اضافی علامتوں کی داغ بیل پڑی اور یہیں سے ان کا بیج انقلابات کے بگولوں کے دوش پر سوار ہو کر برصغیر کے دوسرے حصوں میں بکھر گیا۔ جب نئی سرزمین میں اس کی کونپلیں پھوٹ آئیں تو یہ باور کر لیا گیا کہ یہ اس نئی سرزمین ہی کی پیداوار ہیں۔

اب ہم تانیث کے علامتی لاحقہ 'ن' کو لیتے ہیں جو کہ اردو اور پنجابی گرامر میں یکساں مذکر سے مؤنث بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

منسکرت میں مذکر سے مؤنث بنانے کے لیے کوئی قاعدہ کلیہ موجود نہیں صرف چند ایک ایسے علامتی لاحقے موجود ہیں جن کی بناء پر بعض اوقات مذکر اور مؤنث کو ایک دوسرے سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات تو تذکیر و تانیث کا جنس کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ سینا (فوج) جو کہ صرف مردوں پر مستعمل ہوتی ہے محض آخری 'الف' کی بناء پر جو کہ منسکرت میں عام طور پر تانیث کی علامت ہے مؤنث کہلاتی ہے۔ پنگھٹ جہاں صرف عورتوں کا جمگھٹ ہوتا ہے مذکر شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی چیز کا نام مذکر، مؤنث اور لاجنس بھی ہو سکتا ہے جیسے کہ کنارے کے لیے تٹ مذکر، تٹی مؤنث اور تٹو لاجنس ہے۔ یہاں تک کہ موقع محل کے مطابق بیوی کے لیے بھی 'دار' (مذکر)، جایا (مؤنث) اور کلنتر (لاجنس) میں سے کوئی بھی لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ واؤ کا لاحقہ مذکر، مؤنث اور لاجنس تینوں حالتوں میں مستعمل ہوتا ہے جیسے کہ ششو (لڑکا)، سیتو (پل) اور مدھو (بہار) مذکر ہیں۔ لیکن مدھو (جب شہد کے معنوں میں مستعمل ہو)، دھینو (گائے) اور وسو (دولت) مؤنث ہیں اور تنو (جسم) لاجنس ہے۔

منسکرت میں مندرجہ ذیل لاحقے زیادہ تر تانیث کی علامت شمار کیے جاتے ہیں:

۱: پرتیبھا (خیال) - پرتیا (عکس)

جننا (عوام) - میدھا (یادداشت)

او : دہینو (گائے) - مدھو (شہد)

چنجو (چونچ) - رجو (رسی)

او : ودھو (بھو - بیوی)

ی : رجنی (رات) - دیوی (ملکہ)

وانی (آواز) - ترنی (جہاز)

اگرچہ ایک آدھ مثال 'نی' کے تانیثی لاحقے کی بھی ملتی ہے جیسے کہ 'اندرا' سے 'اندرا نی' گو اندر کا مؤنث اندرا بمعنی لکشمی دیوی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس مثال کے علاوہ قدیم سنسکرت میں تانیث کے لیے 'نی' کا لاحقہ شاذ ہی نظر آتا ہے۔ پراکرت میں تو یہ لاحقہ سرے سے نظر ہی نہیں آتا۔ موجودہ ہتھی بمعنی بیوی اور پترنی بمعنی لڑکی کو سنسکرت کی بجائے ہندی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ کیونکہ بیوی کے لیے قدیم سنسکرت میں عام طور پر جایا، دار، کلنتر اور ودھو کے الفاظ ملتے ہیں۔ اسی طرح پتر کی مؤنث بجائے پترنی کے پتریکا تسلیم کی جاتی ہے۔ ویسے سنسکرت میں بیٹی کے لیے دوہتو، آمجا، ستا اور تنیا کے الفاظ مستعمل تھے۔ بہر حال سنسکرت میں سوائے مندرجہ بالا مستثنیات کے 'ن' کا لاحقہ تانیث کے لیے کہیں مستعمل نہیں ہوا۔

فارسی صرف و نحو میں بھی کوئی ایسا مسلمہ لاحقہ نظر نہیں آتا جس سے تذکیر و تانیث کا پتہ چل سکے۔ کچھ اسماء تو ایسے ہیں کہ جن کی صنف خود ان کے نام ہی سے ظاہر ہے جیسے کہ مادر، پدر، دیو، پری، اسپ، مادیاں باقی اسماء کے لیے تذکیر و تانیث کا طریقہ یہ ہے کہ انسانی صنف کے لیے مرد و زن کا لاحقہ زیادہ کرتے ہیں جیسے کے پیر مرد، پیرزن، جادوگر مرد، جادوگرزن، جانوروں کے لیے نر اور مادہ کا لفظ زیادہ کرتے ہیں جیسے کہ گربہ نر، گربہ مادہ اور شیر نر اور شیر مادہ وغیرہ۔

غرضیکہ یہاں بھی تانیث کے لیے 'ن' کا لاحقہ مستعمل نہیں۔ یونانی تانیث کے لیے 'ن' کا لاحقہ زمانہ قدیم سے مستعمل ہے اور اس کا استعمال عام ہے جیسے کہ :

مؤنث

مذکر

ہیلن (Helen)	ہیلئس (Helios) : بمعنی روشن
کیتھرائن (Katharine)	کاتھرو (Katharos) : بمعنی پاکیزہ ، پاکباز
ہرمائن (Hermione)	ہرمیس (Hermes) : ایک یونانی دیوتا کا نام
ہیروئن (Heroine)	ہیرو (Heros) : مافوق الفطرت صفات کا حامل انسان
الیگزینڈرینا (Alexandrena)	الیگزینڈر (Alexander) : انسانوں کا محافظ

اس نہج پر پنجابی اور اردو گرامر میں 'ن' کا لاحقہ تانیث کے لیے عام مستعمل ہے جیسے کہ :

مؤنث	مذکر	مؤنث	مذکر
دلہن	دلہا	مالن	مالی
پنجابن	پنجابی	دھوبن	دھوبی
ہندوستانن	ہندوستانی	جوگن	جوگی
لاہورن	لاہوری	سمدھن	سمدھی

اغلب یہی ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں میں تانیث کے لیے 'ن' کا لاحقہ براہ راست یونانی زبان ہی سے وارد ہوا یعنی ہندو یونانی عہد میں یہ لاحقہ پنجابی زبان میں داخل ہوا اور یہاں سے آگے اردو میں ودیعت ہو گیا۔

کتابیات

فہرِس

۳۲۳

اردو حصہ

(ا) کتب

(ب) رسائل و اخبارات

۳۲۶

پنجابی حصہ

(ا) کتب

(ب) رسائل

۳۳۳ - ۳۲۷

انگریزی حصہ

(A) *Grammars and
Dictionariestect.*

صرف و نحو اور لغات وغیرہ

(i) Indo-Aryan

ہند آریائی

(ii) Sanskrit

سنسکرت

(iii) Persian

فارسی

(iv) Greek

یونانی

(v) Miscellaneous

متفرق زبانیں

(vi) Prakrits

پراکرتیں

(vii) Munda Languages

منڈا زبانیں

(viii) Dravidian Languages

دراوڑی زبانیں

(ix) Non-Aryan Languages

غیر ہند آریائی زبانیں

(x) Indo-Pak Languages

پاک و ہند کی زبانیں

(B) *Linguistics*

لسانیات

(C) *Technical Books and Articles*

فنی کتب و مضامین

(D) *General*

متفرق

(E) *Proceeding of Oriental and Historical Conferences*

مستشرقین اور مؤرخین کی مجالس کی کار گزاریاں

(F) *Journals and Magazines*

جرائد و رسائل

آریائی زبانیں - لاہور ۱۹۶۰ء
 پنجابی ادب - کراچی
 تاریخ ادب اردو - لکھنؤ
 نقوش سلیمانی - کراچی ۱۹۵۱ء
 قوانین صرفیہ ہندیہ - ملتان
 اردو کے قدیم - کراچی ۱۹۶۳ء
 پنجابی ادب و تاریخ - لاہور
 (۱) اردو زبان کا ارتقاء - ڈھاکہ

۱۹۵۶ء

(ب) داستان زبان اردو -

کراچی ۱۹۶۰ء

اردو غزل ولی تک - بمبئی ۱۹۶۱ء

(۱) اردو کی ابتدائی نشو و نما

میں صوفیائے کرام کا کام -

علی گڑھ

(ب) قدیم اردو - کراچی ۱۹۶۱ء

(ج) قواعد اردو - لاہور ۱۹۵۸ء

ملتان زبان اور اس کا اردو سے

تعلق - بہاولپور ۱۹۶۷ء

قادر نامہ - لکھنؤ ۱۹۳۰ء

تشریح الحروف - آگرہ

سر زمین پوٹھوہار -

لاہور ۱۹۶۲ء

قواعد زبان اردو -

لاہور ۱۹۶۲ء

گرو گرنٹھ اور اردو -

لاہور ۱۹۶۶ء

سدھیشور ورما

سرور ، محمد

سکسینہ ، رام بابو

سلیمان ندوی ، سید

شاہ ولایت

شمس اللہ قادری ، حکیم

شمیم چودھری

شوکت سبزواری

ظہیر الدین مدنی

عبدالحق ، مولوی

عبدالحق ، مسہر

غالب ، میرزا

فیض احمد

کرم حیدری

گل کرسٹ

گیانی ، عباد اللہ

- (ا) پنجاب میں اردو -
لاہور ۱۹۶۳ء
- (ب) پرتھوی راج راسا -
دہلی ۱۹۴۳ء
- (ج) مقالات شیرانی جلد اول و دوم -
لاہور ۱۹۶۶ء
اللہ خدائی -
- کانپور ۱۸۹۷ و ۱۹۱۰ء
تلخیص الاردو -
کراچی ۱۹۵۳ء
دکن میں اردو بمع اضافہ آندھرا
میں اردو - لکھنؤ ۱۹۶۳ء
- محمود شیرانی ، حافظ
- نخل
- ہاشمی فرید آبادی
- ہاشمی ، نصیر الدین

اُردو رسائل و اخبارات

- اردو ، سہ ماہی - کراچی
- اردو نامہ ، سہ ماہی - کراچی
- اسروز ، روزنامہ - لاہور
- اورینٹل کالج میگزین ، سہ ماہی - لاہور
- ایلمہ ، ہفت روزہ - مستونگ
- سنگ میل ، سرحد نمبر - پشاور
- صحیفہ ، سہ ماہی - لاہور
- ماہ نو ، ماہنامہ - کراچی
- مشرّب ، مقالات نمبر - کراچی
- نگار ، ماہنامہ - لکھنؤ و کراچی

پنجابی کتب

- | | |
|--|--------------------------|
| پریم کہانی - لاہور ۱۹۳۲ء | بدھ سنگھ ، باوا |
| پنجابی بھاشا دا سروپ - پٹیالہ | جوش ، ڈاکٹر موہن سنگھ |
| پنجابی زبان تے اوہدا لٹریچر -
لاہور ۱۹۶۷ء | جین ، بنارسی داس |
| (۱) پنجابی ادب دی مختصر تاریخ -
لاہور | دیوانہ ، ڈاکٹر موہن سنگھ |
| (ب) شاہ حسین لاہوری - لاہور | سرن داس ، لالہ رام |
| پنجابی لوک گیت - لاہور ۱۹۶۵ء | فقیر ، ڈاکٹر فقیر محمد |
| کلیات بلھے شاہ - لاہور | قریشی ، عبدالغفور |
| پنجابی زبان دا ادب - لاہور | کبیر ، بھگت |
| شبدا ولی - لاہور | ورما ، لالہ پرس رام |
| دوہے بابا فرید - لاہور | |

پنجابی رسائل

- پرکھ ، ماہی - چندی گڑھ
پنجابی ادب ، ماہنامہ - لاہور
پنجابی دنیا ، ماہنامہ - پٹیالہ
پنج دریا ، ماہنامہ - لاہور
لہراں ، ماہنامہ - لاہور

انگریزی حصہ

(F) JOURNALS AND MAGAZINES : رسائل و جرائد

- Journal of the Royal Asiatic Society London.
Journal of the Asiatic Society of Bengal Calcutta.
Indian Antiquary-London.
Punjab Notes and Queries.
American Anthropologist - Menasha (USA).
Cultural Forum-Delhi.
Sunday Statesman-Delhi.
Illustrated Weekly of India-Bombay.
The Times of India-Annual Numbers Bombay.
Journal of the Pakistan Historical Society-Karachi.
Pakistan Quarterly-Karachi.

Wylie, E; All About your Sore Throat. (Rader's Digest, Jan; 1956)

(D) GENERAL :

متفرق

- Bloomfield, M; Hymns from the Atharva Veda—London, 1897.
- Hunter, W. W; The Indian Empire—London, 1893.
- Ibbetson, D; Punjab Castes—Lahore, 1916.
- Latham, R. G; Ethnology of India—London, 1949.
- Macdonell, A. A; Hymns from the Rig Veda—Calcutta.
- Mookerji, R. K; Hindu Civilization—London, 1936.
- Oldenberg, H; Ancient India its Language and Religions—Calcutta, 1962.
- Oppert. G; The Original Inhabitants of India—Madras, 1893.
- Smith, V. A; The Early History of India—London, 1908.
- Taylor, I; The Origin of the Aryans—London.
- Thurston, E; Castes and Tribes of South India. (7 Vols) —Madras, 1909.
- Tylor, E. B; Anthropology. (2 Vols.)—London, 1946.

(E) PROCEEDINGS OF ORIENTAL AND HISTORICAL CONFERENCES :

مستشرقین اور مؤرخین کی مجالس کی کارگزاریاں

Proceedings and Transactions of the Fifth All - India Conference, (Summaries of papers)—Lahore, 1928.

Proceeding Fifth Indian Oriental Conference (General) —Lahore, 1930.

Proceedings of the Indian History Congress Fourth Session—Lahore, 1940.

Proceedings of a Symposium - the 26th Congress of Orientalists ; Delhi, 1964.

- Greenough, J. B. }
Kittredge, G. L. } Words and their ways in English Language—London, 1902.
- Grierson, G. A.; A Linguistic Survey of India (19 Parts) Calcutta; 1903-1928.
- Joos, M; (ED) Readings in Linguistics—Washington, 1957.
- Laird, C; The Miracle of Language—Greenwich, 1960.
- Oldfield, R. C; } (ED) Language-Selected Readings—Middlesex, 1968.
Marshall, J. C; }
- Pei, M; Language for Everybody—New York, 1958.
- ” ” The Story of Language—New York, 1960.
- Vendryes, J; Language-A Linguistic Introduction to History—London, 1949.
- Whatmough, J; Language : A Modern Synthesis—New York, 1957.
- Wilson, R. A; The Miraculous Birth of Language—London, 1946.

(C) TECHNICAL BOOKS AND ARTICLES :

فنی کتابیں اور مضامین

(جن سے خاص کر 'زبان کے میکانیکی پہلو'

کی تدوین کے سلسلے میں استفادہ کیا گیا)

- Halliburston, W. D; } Hand Book of Physiology and
Medourell, R.J.S; } Biochemistry.
- Paget, R. A. S; The Origin of Language. (Penguin, Science News Series No. 20)
- Bruce, D. J; Speech Engineering. (Penguin. Science News Series No. 44).
- Ranson, S. W; The Anatomy of the Nervous System.
- Rushton, W. A. H; How Messages are Transmitted Along Nerves. (Penguin, Science News Series No. 5)
- Wells, H. G; }
Wells, G. P; } The Science of Life.
Huxley, J. S ; }

- Hava, Rev. J. G; Arabic-English Dictionary— (الفرائد الدرید) Beirut, 1915.
 Kornrumpf, H. J; Turkish-English and English-Turkish Dictionary—Berlin, 1960.

(x) *INDO-PAK LANGUAGES*

پاک و ہند کی زبانیں

- Beames, J; A Comparative Grammar of the Modern Aryan Languages—Delhi 1966.
 Kellog, S. H; A Grammar of the Hindi Language—London, 1965.
 Dhar, L; Padumavati; A Linguistic Study—London, 1949.
 Sharma, R. B; Evolution of Hindi from a Dialect—Delhi. (The Statesman, Aug 30, 1964).
 Platts, J. T; A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English—London, 1930.
 Yule, H; }
 Burnell, A. C; } Hobson Jobson; A Glossary of Colloquial Anglo-Indian Words—London, 1903.
 Vaze, S. G; The Aryabhushan School Dictionary Marathi-English—Poona, 1938.
 Diwana, M. S; Hand Book of Urdu Literature—Lahore.
 Lebedeff, H; A Grammar of the Pure and Mixed East Indian Dialects—Calcutta, 1963.
 Quraishi, W; A Survey of Panjabi Language and Literature (Journal of the Pakistan Historical Society, April, 1967).
 Serebryakov, I; Punjabi Literature—Moscow, 1968.
 Krishna, L. R; Panjabi Sufi Poets—London, 1938.
 Bajaj, S. R; English-Punjabi Dictionary—Lahore.

(B) *LINGUSTICS :*

لسانیات

- Barber, C. L; The Story of Language—London, 1966.
 Bodmer, F The Loom of Language—London, 1949.
 Darwin, C; The Expression of the Emotion—London, 1948.

Buddhadatta, A. P., English-Pali Dictionary—Colombo, 1955.

(vii) *MUNDA LANGUAGES*

منڈا زبانیں

Nath, V. V. S; Bhils of Ratanmal—Baroda, 1960.

Bhaduri, M. B; A Mundari-English Dictionary—Calcutta, 1931.

(viii) *DRAVIDIAN*

دراوڑی زبانیں

Caldwell, R; A Comparative Grammar of the Dravidian—Madras, 1961.

Block, J; The Grammatical of Dravidian Language Poona 1954.

Burrow, T. } A Dravidian Etymological Dictionary—
Emeneau, M. B; } London, 1961.

Arden, A. H; } A Progressive Grammar of the Tamil Language—Madras, 1962.

Rao, H. R: Kannada Made Easy—Bombay.

“ “ Telugu Without Tutor—Bombay.

Allah Bux, Hand Book of Birouhi Language—Karachi, 1877.

Kamil, S. M; All About Brahui (Pakistan Quarterly, Vol XVII No. 1)—Karachi, 1969.

Emeneau, M. B; Brahui and Dravidian Comparative Grammar—California, 1962.

Kittel, F; On the Dravidian Element in Sanskrit Dictionaries—London.

(Indian Antiquary Aug 1872)

Emeneau, M. B; } Dravidian Borrowings from Indo-Aryan
Burrow, T } —California, 1962.

Hornle, A. F; On the Derivation of some Peculiar Gaurian Words—London.

(Indian Antiquary Dec. 1872)

(ix) *NON-ARYAN LANGUAGES*

غیر ہند آریائی زبانیں

Warren, J; Qaida-i-Ibrani (Cover missing—19th Century Print).

Hopper, W; Hebrew Dictionary—Allahabad 1880.

- Sokolov, S. N; The Avestan Language—Moscow, 1967.
 (iv) GREEK یونانی
- Chadwick, J; The Prehistory of the Greek Language—
 Cambridge, 1963.
- Kykkotis, I; English-Greek and Greek-English Dic-
 tionary—London, 1957.
- (v) MISCELLANEOUS متفرق زبانیں
- Castillo, C, } Spanish Dictionary—New York, 1955.
 Bond, O. F; }
- Keberkshtes, L. B, } Urdu Russian Dictionary—Moscow, 1958.
 Pomerantsef, L. M; }
- Letton, J } Urdu Russian Conversation—Moscow,
 Meresh, B, } 1960.
 Neverof, S; }
- Skeat, W. W; A Concise Etymological Dictionary of
 the English Language—London, 1951.
- (vi) PRAKRITS پراکرتیں
- Woolner, A.C; Introduction to Prakrit, Varanasi
 (Benaras).
- Pischel, R; Comparative Grammar of the Prakrit
 Languages—Delhi, 1965.
- Tagare, G.V; Historical Grammar of Apabhramsa—
 Poona, 1948.
- Burrow, T; The Language of the Kharosthi Docu-
 ments—Cambride, 1937.
- Lane, G. S; The Tocharian Punyavantajatka—Balti-
 more, 1947.
- ” ” Vocabulary to the Tocharian Punyavanta-
 jadaka—Baltimore. 1948.
- Shakur, M. A; A Hand Book to the Inscription Gallery in
 the Peshawar Museum—Peshawar, 1946.
- Buddhadatta, A. P ; Aids to Pali Conversation—Ambalah-
 gonda (Ceylon).

ENGLISH BOOKS انگریزی کتب

(A) GRAMMARS AND DICTIONARIES ETD :

صرف و نحو اور لغات وغیرہ

(i) INDO-ARYAN

ہند آریائی

- Lockwood, W. B; Indo-European Philology—London, 1969.
T. Hudson-Williams; Comparative Grammar(Indo-European),—
Cardiff, 1961.

(ii) SANSKRIT

سنسکرت

- Ivanov, V.V; } Sanskrit—Moscow, 1968.
Toporov, V. N; }
Macdonell, A. A; A History of Sanskrit Literature—London,
1913.
Muir, J; Original Sanskrit Texts, Vol. I—London,
1868.
Allen, W. S; Phonetics in Ancient India—London,
1961.
Macdonell, A.A; A Sanskrit Grammar for Students—
London, 1962.
" " A Practical Sanskrit Dictionary—London,
1958.
Vaidya, L. R; The Standard Sanskrit-English Dictionary
—Bombay, 1889.
Apte, V. S; The Student's English-Sanskrit Dictionary
—Delhi, 1960.
Dowson, J; A Classical Dictionary of Hindu Mytho-
logy—London, 1961.

(iii) PERSIAN

فارسی

- Lall, W; An Introductory History of Persian
Language—Delhi, 1914.

صحیح نام

مجازہ تصحیح	اصل عبارت	سطر	صفحہ
(Buffon)	(Buffan)	۱۳	۲۲
لا مارک (Lamarck)	لی مارک (Lamarch)	۱۱	۱۱
(Wallace)	(Willis)	۲۰	۳۲
یک طرفہ	یک طرف	۱۴	۷۷
باتاں (قدیم اردو) -	برج (قدیم اردو)	۱۳	۸۰
برج میں	میں		
گروہ	اولین گروہ	۱۵	۸۱
پٹی کو بیگام وٹی	پٹی کو بیگام دٹی	۱۶	۸۲
کہ سنسکرت میں	کہ میں	۱۲	۸۳
ممانیہ	معانیہ	۲۳-۲۲	۸۹
حجری عہد	ہجری عہد	۱۶	۹۷
کاسیات	کاسیاست	۱۸	۹۸
چاؤ لی پیپر	چاؤ پیپر	۱۱	۱۰۱
بلم	آبم	۲۸	۱۱۲
سپل	شیلی	۲۳	۱۲۱
'تد بہو'	'تر بہو'	۱	۱۳۶
سندھی : سونڈھ	سندھی : سونڈ (سونڈ)	۱۱	۱۴۲
(سندھی : گڈھ)	(سندھی : گڈھو)	۱	۱۴۹
(سندھی : کوڈو)	(سندھی : کوڈو)	۱۱	۱۵۲
سندھی : گادی : ایضاً	سندھی : گادی : ایضاً	۱۱	۱۵۶
(سندھی : واڈھو : بڑھٹی)	(سندھی : واڈو : بڑھٹی)	۱۰	۱۶۰
سندھی ملتان	سندھی ملتان		۱۶۹
آٹوں میں	اوں	۴	۱۷۰
منہنجو : میڈا	مانڈا	۵	۱۷۱
میں بن جو	مجھو		۱۷۲

مجوزہ تصحیح

اصل عبارت

صفحہ سطر

صفحہ	سطر	اصل عبارت	مجوزہ تصحیح
۶۶	۸	سندھی ملتانی توجو تینڈا	سندھی ملتانی توجو (قدیم) تیڈا تنہنچو : 'تن' ہن جو حالیہ
۱۲	۱۲	تسانڈا	تساڈا
۱۵	۱۵	ہنانچو	نہن جو
۱۸۱	۲۴	'کی' کی	'کھے' کی
۱۸۲	۴-۱	ہل ہئین سین ہوت دی	ہل ہئیں سین ہوت ڈے، پیریں پند و سار قاصدا ٹی کار
۱۰-۹	۱۰-۹	کین رسائی کیچ کی مون سیو ڈٹھا ماں	کین اسانے کیچ کھے مون سے ڈٹھا ماء، جنہیں ڈٹھو پریں کھے علامت 'کھے'
۱۸۳	۴	علامت 'کی'	اردہ ما گدھی
۱۸۵	۲	اودہ ما گدھی	کہ ذکر آچکا ہے
۱۹۴	۲۳	کہ مذکور ہے	مصدری لاحقہ
۲۰۵	۹	مصوری لاحقہ	ارتقائی منازل
۲۰۹	۶	آریائی منازل	(سندھی : ج ، گ ، ٹ)
۲۱۳	۲۲	(سندھی : ج ، گ ، ٹ)	امیسو
۲۲۷	۱۱	امبھسو	کو رخ
۲۲۹	۱۸	کور کھ	لہندا
۲۶۸	۴	لہندا	سوجھی
۳۱۴	۲	سوجی	

